کالی شلوار

سعادت حسن منٹو

ظفر منزل۔ بینک سکوئر
ظفر برادرز
دی مال
اہو

(جملہ حقوق بحق مکتبہ ظفر برادرز محفوظ ہیں)

(ہندوستان میں بحق معین الدین صدیقی ونگر فلیٹ پارلیمنٹ سٹریٹ
نیو دہلی حقوق رجسٹر کر دیئے گئے ہیں)

تعداد :- پانچصد

قیمت :- چار روپے آٹھ آنے

ظفر احمد ترینی پرنٹر و پبلشر نے
نقوش پریس سے چھپوا کر
ظفر برادرز لاہور
شائع کیا۔

انتساب

حسن عباس کے نام!

فہرست مضامین

پیش لفظ — ۵
سجدہ — ۶
کالی شلوار — ۱۹
دھواں — ۴۰
کبوتروں والا سائیں — ۵۲
الو کا پٹھا — ۶۸
تلون — ۸۰
وہ خط جو پوسٹ نہ کئے گئے — ۹۹
مصری کی ڈلی — ۱۱۱
ماتمی جلسہ — ۱۲۷
قبض — ۱۳۵
ایکٹریس کی آنکھ — ۱۵۲
نامکمل تحریر — ۱۶۴
لالٹین — ۱۷۵
انتظار — ۱۸۸
پھویوں کی سازش — ۲۰۴
گرم سوٹ — ۲۰۸
میرا اہم سفر — ۲۲۱
ترقی پسند — ۲۳۲
نیا سال — ۲۵۰
چوہیندان — ۲۶۲
چوہدری — ۲۷۸
قاسم — ۲۹۲
دیوانہ شاعر — ۳۰۶
پریشانی کا سبب — ۳۱۹

پیش لفظ

جب اس کتاب کا پہلا افسانہ "ساقی" میں شائع ہوا۔ تو میرے ایک دوست نے جو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں اس پر رائے زنی کرتے ہوئے کہا تمہارا تازہ افسانہ "دھواں" صاحبہ نے پڑھا۔ اُن کا خیال ہے کہ یہ نہایت غلیظ ہے۔

یہ صاحبہ ڈاکٹری کا امتحان پاس کر چکی ہیں مگر اب ایک عرصہ سے پریکٹس نہیں کرتیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسی وجہ سے انہیں وہ عمل جراحی پسند نہیں آیا۔ جو میرے افسانے میں موجود ہے۔ بہر حال میں اپنے انگریزی اور اُردو زبانوں میں لکھنے والے دوست اور علم طب میں سند یافتہ خاتون کا بے حد ممنون ہوں کہ مجھے اپنی کہانیوں کے دوسرے مجموعے کا عنوان اس افسانے میں مل گیا جو دونوں کو ناپسند تھا۔

"سعادت حسن منٹو"

۱۷ر دسمبر سنہ ۴۱ء۔ دہلی

سجدہ

گلاس پر بوتل جھکی تو ایک دم حمید کی طبیعت پر بوجھ سا پڑ گیا۔ ملک جو اُس کے سامنے تیسرا پیگ پی رہا تھا فوراً تاڑ گیا کہ حمید کے اندر روحانی کشمکش پیدا ہو گئی ہے وہ حمید کو سات برس سے جانتا تھا، اور ان سات برسوں میں کئی بار حمید پر ایسے دورے پڑ چکے تھے جن کا مطلب اس کی سمجھ سے ہمیشہ بالاتر رہا تھا۔ لیکن وہ اتنا ضرور سمجھتا تھا کہ اس کے لاغر دوست کے سینے پر کوئی بوجھ ہے ایسا بوجھ جس کا اثر شراب پینے کے دوران میں کبھی کبھی حمید کے اندر یوں پیدا ہوتا ہے کہ جیسے بے دھیان بیٹھے ہوئے آدمی کی پسلیوں میں کوئی زور سے ٹھوکا دیدے۔

حمید بڑا خوش باش انسان تھا، ہنسی مذاق کا عادی، حاضر جواب، بذلہ سنج اس میں بہت سی خوبیاں تھیں، مثال کے طور پر سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ بیحد مخلص تھا۔ اس قدر مخلص کہ بعض اوقات اس کا اخلاص ملک کے لئے عہد عتیق کا رومانی افسانہ بن جاتا تھا۔

حمید کے کردار میں، ایک عجیب وغریب بات جو ملک نے نوٹ کی یہ تھی کہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے ناآشنا تھیں۔ یوں تو ملک بھی رونے کے معاملے میں بڑا دخیل تھا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ جب کبھی رونے کا موقع آئے گا وہ ضرور روئے گا۔ اس پر غم افزا باتیں اثر ضرور کرتی تھیں مگر وہ اس اثر کو اتنی دیر اپنے دماغ پر بیٹھنے کی اجازت دیتا تھا۔ جتنی دیر گھوڑا اپنے تنے ہوئے جسم پر مکھی کو۔

غموں سے دور رہنے والے اور ہر وقت ہنسی مذاق کے عادی حمید کی زندگی میں نہ جانے ایسا کون سا واقعہ الجھا ہوا تھا کہ وہ کبھی کبھی قبرستان کی طرح خاموش ہو جاتا تھا۔ ایسے لمحات جب اس پر طاری ہوتے تو اس کا چہرہ ایسی رنگت اختیار کر لیتا تھا جو تین دن کی باسی شراب میں بے جان سوڈا گھولنے سے پیدا ہوتی ہے۔

سات برس کے دوران میں کئی بار حمید پر ایسے دورے پڑ چکے تھے مگر ملک نے اُس سے اُن کی وجہ دریافت نہ کی تھی۔ اس لئے نہیں کہ اُن کی وجہ دریافت کرنے کی خواہش اس کے دل میں پیدا نہیں ہوتی تھی، دراصل بات یہ ہے کہ ملک پرلے درجے کا سست اور کاہل ثابت ہوا تھا۔ اس خیال سے بھی وہ حمید کے ساتھ اس معاملے پر بات چیت نہیں کرتا تھا کہ ایک طول طویل کہانی اس سے سننا پڑے گی اور اس کے چوتھے پیگ کا سارا سرور غارت ہو جائے گا۔ شراب پی کر لمبی چوڑی آپ بیتیاں سُننا یا سُنانا اس کے نزدیک بہت بڑی بدذوقی تھی اس کے علاوہ وہ کہانیاں سُننے کے معاملے میں وہ بہت ہی خام تھا۔ اسی خیال کی وجہ سے وہ اطمینان سے حمید کی داستان نہیں سُن سکے گا۔ اُس نے آج تک اُس سے اُن دوروں کی بابت دریافت نہیں کیا تھا۔

کرپارام نے حمید کے گلاس میں تیسرا پیگ ڈال کر بوتل میز پر رکھدی اور ملک سے مخاطب ہو کر "ملک اسے کیا ہو گیا ہے"۔

ملک خاموش رہا لیکن حمید مضطرب ہو گیا۔ اُس کے تنے ہوئے اعصاب زور سے کانپ اُٹھے۔ کرپارام کی طرف دیکھ کر اُس نے مسکراہٹ کی کوشش کی۔ اس میں جب ناکامی ہوئی تو اس کا اضطراب اور بھی زیادہ ہو گیا۔

حمید کی یہ بہت بڑی کمزوری تھی کہ وُہ کسی بات کو چھُپا نہیں سکتا تھا اور اگر چھُپانے کی کوشش کرتا تو اس کی وہی حالت ہوتی جو آندھی میں صرف ایک کپڑے میں لپٹی ہوئی عورت کی ہوتی ہے۔

مُلک نے اپنا تیسرا پیگ ختم کیا اور اس فضا کو جو کچھ عرصہ پہلے طرب افزا باتوں سے گونج رہی تھی۔ اپنی بے محل ہنسی سے خوشگوار بنانے کے لئے اس نے کرپارام سے مخاطب ہو کر کہا: "کرپا تم مان لو، اسے اشوک کمار کا فلمی عشق ہو گیا ہے۔ بھئی یہ اشوک کمار بھی عجیب چیز ہے، پردے پر عشق کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کا سٹر آئل پی رہا ہے۔"

کرپارام، اشوک کمار کو اتنا ہی جانتا تھا کہ مہاراجہ اشوک اور اس کی مشہور آہنی لاٹھ کو فلم اور تاریخ سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں تھی، البتہ وُہ ان کے فرائض سے ضرور آگاہ تھا۔ کیونکہ وہ عام طور پر کہا کرتا تھا مجھے، اگر کبھی بیخوابی کا عارضہ لاحق ہو جائے تو میں یا تو میں فلم دیکھنا شروع کر دوں گا، یا چکرورتی کی لکھی ہوئی تاریخ پڑھنا شروع کر دوں گا۔ وہ ہمیشہ حساب داں چکرورتی کو مورخ بنا کر اپنی مسرت کے لئے ایک بات پیدا کر لیا کرتا تھا۔

کرپارام چار پیگ پی چکا تھا۔ چار پیالہ پیگ، نشہ اُس کے دماغ کی آخری منزل تک پہنچ چکا تھا آنکھیں سکیڑ کر اس نے حمید کی طرف اس انداز سے دیکھا جیسے وہ کیمرے کا فوکس کر رہا ہے۔" تمہارا گلاس ابھی تک ویسے کا ویسا پڑا ہے۔

حمید نے دردِ سر کے مریض کی شکل بنا کر کہا، "بس اب مجھ سے زیادہ نہیں پی جائیگی"

"تم چغد ہو ——— نہیں چغد نہیں کچھ اور ہو ——— تمہیں پینا ہو گی۔ سمجھے، یہ گلاس اور اس بوتل میں جتنی پڑی ہے سب کی سب تمہیں پینا ہو گی، شراب سے جو انکار کرے وہ انسان نہیں حیوان ہے۔ حیوان بھی نہیں، اس لئے کہ اگر حیوانوں کو انسان بنا دیا جائے تو وہ بھی اس خوبصورت شئے کو کبھی نہ چھوڑیں، تم سن رہے ہو ملک ——— میں نے اگر یہ ساری شراب اس کے حلق میں نہ اُتار دی تو میرا نام کرپارام نہیں گھسیٹارام آرٹسٹ ہے"۔

گھسیٹارام آرٹسٹ سے کرپارام کو سخت نفرت تھی، اس لئے کہ آرٹسٹ ہو کر اس کا نام گھسیٹارام تھا۔

ملک کا منہ سوڈا ملی وسکی سے بھرا ہوا تھا، کرپارام کی بات سُن کر وہ بے اختیار ہنس پڑا جس کے باعث اس کے منہ سے ایک فوارہ سا چھوٹ پڑا، "کرپارام تم خدا کے لئے گھسیٹارام آرٹسٹ کا نام نہ لیا کرو۔ میری انتڑیوں میں ایک طوفان سا مچ جاتا ہے۔ لاحول ولا میری پتلون کا ستیاناس ہو گیا ہے۔ لو بھئی حمید اب تو تمہیں پینا ہی پڑے گی کرپارام، گھسیٹارام بنے یا نہ بنے۔ لیکن میں ضرور کرپارام بن جاؤنگا اگر تم نے گلاس خالی نہ کیا ——— لو پیو ——— پی جاؤ ——— ارے منہ کیا دیکھتے ہو ——— یہ تمہارے چہرے پر قیامت کیسی برس رہی ہے ——— کرپارام، اُٹھو

لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانا کرتے ——— زبردستی کرنا ہی پڑے گی۔"

کرپارام اور ملک دونوں اُٹھے اور حمید کو زبردستی پلانے کی کوشش کرنے لگے۔ حمید کو روحانی کوفت تو ویسے ہی محسوس ہو رہی تھی، جب کرپارام اور ملک نے اُس کو جھنجھوڑنا شروع کیا تو اُس کو جسمانی اذیت پہنچی جس کے باعث وہ بیحد پریشان ہو گیا۔ اُس کی پریشانی سے کرپارام اور ملک بہت محفوظ ہوتے اور انہوں نے ایک کھیل سمجھ کر حمید کو اور زیادہ تنگ کرنا شروع کیا۔ کرپارام نے گلاس پکڑ کر اس کے سر میں تھوڑی سی شراب ڈال دی۔ اور نائیوں کے انداز میں جب اُس نے حمید کا سر سہلایا تو وہ اس قدر پریشان ہوا کہ اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آ گئے، اس کی آواز بھرا گئی اُس کے سارے جسم میں تشنج سا پیدا ہو گیا اور ایک دم کاندھے ڈھیلے کر کے اس نے رونی اور مردہ آواز میں کہا۔ میں بیمار ہوں ——— خدا کے لئے مجھے تنگ نہ کرو۔

کرپارام نے اسے بہانہ سمجھ کر حمید کو اور زیادہ تنگ کرنے کے لئے کوئی نیا طریقہ سوچنے ہی والا تھا کہ ملک نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے پرے ہٹا دیا "کرپا" اس کی طبیعت واقعی خراب ہے ——— دیکھو تو رو رہا ہے۔

کرپارام نے اپنی موٹی کمر جھکا کر غور سے دیکھا، ارے تم سچ مچ رو رہے ہو۔ حمید کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے، جس پر سوالوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔

"کیا ہو گیا تمہیں؟ ——— خیر تو ہے؟"

"یہ تم کیوں رو رہے ہو؟"

"بھئی حد ہوگئی —— ہم تو صرف مذاق کر رہے تھے۔

کچھ سمجھ میں بھی تو آئے کیا تکلیف —— ہے تمہیں؟"

ملکؔ اس کے پاس بیٹھ گیا۔ "بھئی مجھے معاف کر دو، اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہو۔"

حمید نے جیب سے رومال نکال کر اپنے آنسو پونچھے اور کچھ کہتے کہتے خاموش ہوگیا جذبات کی شدت کے باعث اُس کی قوت گویائی جواب دے گئی ہے۔

تیسرے پیگ سے پہلے اس کے چہرے پر رونق تھی۔ اس کی باتیں سوتے کے بلبلوں کی طرح تر و تازہ اور شگفتہ تھیں، مگر اب وہ باسی شراب کی طرح بے رونق تھا۔ وہ سکڑ سا گیا تھا۔ اس کی حالت ویسی ہی تھی جیسی بھیگی ہوئی پتلون کی ہوتی ہے۔ کرسی پر وہ اس انداز سے بیٹھا تھا، گویا وہ اپنے آپ سے شرمندہ ہے اپنے آپ کو چھپانے کی بھونڈی کوشش میں وہ ایک ایسا لطیفہ بن کر رہ گیا تھا جو بڑے ہی خام انداز میں سُنایا گیا ہو۔

ملکؔ کو اس کی حالت پر بہت ترس آیا "حمید، لو اب خدا کے لئے چپ ہو جاؤ واللہ تمہارے آنسوؤں سے مجھے تکلیف ہو رہی ہے، مزا تو سب کرکرا ہی ہوگیا تھا۔ مگر یوں تمہارے ایکا ایکی آنسو بہانے سے میں بہت مغموم ہوگیا ہوں۔" خدا جانے تمہیں کیا تکلیف ہے؟"

"کچھ نہیں، میں بہت جلد ٹھیک ہو جاؤں گا۔ کبھی کبھی مجھے ایسی تکلیف ہو جایا کرتی ہے، یہ کہہ کر وہ اٹھا، اب میں اجازت چاہتا ہوں۔"

کرپارام بوتل میں بچی ہوئی شراب کو دیکھتا رہا اور ملک یہ ارادہ کرتا رہا کہ حمید سے آج پوچھ ہی لے کہ وقتاً فوقتاً اسے یہ دورے کیوں پڑتے ہیں۔ مگر وہ جا چکا تھا۔ حمید گھر پہنچا تو اس کی حالت پہلے سے زیادہ خراب تھی، کمرے میں چونکہ اس کے سوا کوئی اور نہ تھا، اس لئے وہ رو بھی نہ سکتا تھا۔ اس کی آنسوؤں سے لبالب بھری ہوئی آنکھوں کو کرسیاں اور میزیں نہیں چھلکا سکتی تھیں۔

اس کی خواہش تھی کہ اس کے پاس کوئی آدمی موجود ہو جس کے چھیڑنے سے وہ جی بھر کر رو سکے۔ مگر ساتھ ہی اس کی یہ خواہش بھی تھی کہ وہ اکیلا ہو —— ایک عجیب کشمکش اس کے اندر پیدا ہو گئی۔

وہ کرسی پر اس انداز سے اکیلا بیٹھا تھا جیسے شطرنج کا پٹا ہوا مہرہ بساط سے بہت دور پڑا ہے، سامنے میز پر اس کی پرانی تصویر، چمکدار فریم میں جڑی رکھی تھی۔ حمید نے اداس نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو سات برس، تصویر اور اس کے درمیان تھان کی طرح کھلتے چلے گئے۔

ٹھیک، سات برس پہلے برسات کے ان ہی دنوں میں رات کو وہ ریلوے ریسٹوران میں ملک عبدالرحمٰن کے ساتھ بیٹھا تھا —— اس وقت کے حمید اور اس وقت کے حمید میں کتنا فرق تھا —— کتنا فرق تھا۔ حمید نے یہ فرق اس شدت سے محسوس کیا کہ اسے اپنی تصویر میں ایک ایسا آدمی نظر آیا جس سے ملے اس کو ایک زمانہ گذر گیا ہے۔

اس نے تصویر کو غور سے دیکھا تو اس کے دل میں یہ تلخ احساس پیدا ہوا کہ انسانیت کے لحاظ سے وہ اس کے مقابلے میں بہت پست ہے۔ تصویر میں جو حمید

ہے اس حمید کے مقابلے میں بدرجہا افضل و برتر ہے۔ جو کرسی پر نیوڑھائے بیٹھا ہے چنانچہ اس احساس نے اس کے دل میں حسد بھی پیدا کر دیا۔

ایک سجدے —— صرف ایک سجدے نے اس کا ستیاناس کر دیا تھا۔

آج سے ٹھیک سات برس پہلے کا ذکر ہے، برسات کے یہی دن تھے، رات کو ریلوے ریسٹوران میں اپنے دوست ملک عبدالرحمٰن کے ساتھ بیٹھا تھا حمید کو یہ شرارت سوجھی تھی کہ بغیر بو کی شراب جس کا ایک پورا پیگ لیمونیڈ میں ملا کر اس کو پلا دے اور جب وہ پی جائے تو آہستہ سے اس کے کان میں کہے "مولینا ایک پورا پیگ آپ کے ثوابوں بھرے پیٹ میں داخل ہو چکا ہے۔

بیرے سے مل ملا کر اس نے اس بات کا انتظام کر دیا تھا کہ آرڈر دینے پر لیمونیڈ کی بوتل میں جن کا ایک پیگ ڈال کر ملک کو دے دیا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ حمید نے وسکی پی اور ملک بظاہر بے خبری کی حالت میں جن کا پورا پیگ چڑھا گیا۔

حمید چونکہ تین پیگ پینے کا ارادہ رکھتا تھا اس لئے ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اُس نے پوچھا۔ ملک صاحب، آپ یوں بیکار نہ بیٹھئے، میں تیسرا پیگ بڑی عیاشی سے پیا کرتا ہوں۔ آپ ایک اور لیمونیڈ منگوا لیجئے۔

ملک رضامند ہو گیا چنانچہ ایک اور لیمونیڈ آ گیا اس بیرے نے اپنی طرف سے جن کا ایک پیگ ملا دیا تھا۔

ملک سے حمید کی نئی نئی دوستی ہوئی تھی چاہیے تو یہ تھا کہ حمید اس شرارت سے باز رہتا۔ مگر ان دنوں وہ اس قدر زندہ دل اور شرارت پسند تھا کہ جب بیرا ملک کے لئے لیمونیڈ کا دوسرا گلاس لایا اور اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا تو وہ اس خیال سے

بہت خوش ہوا کہ ایک کے بجائے دو پیگ ملک کے پیٹ کے اندر چلے جائیں گے۔
ملک آہستہ آہستہ لیمونیڈ ملی جن پیتا رہا اور حمید دل ہی دل میں اس کبوتر کی طرح گٹکتا رہا جس کے پاس ایک کبوتری آ بیٹھی ہو۔"

اس نے جلدی جلدی اپنا تیسرا پیگ ختم کیا اور ملک سے پوچھا۔" اور پیئیں گے آپ؟"

ملک نے غیر معمولی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا، نہیں۔" پھر اس نے بڑے روکھے انداز میں کہا۔ اگر تمہیں پینا ہے تو پیو۔ میں جاؤں گا۔ مجھے ایک ضروری کام ہے۔"

اس مختصر گفتگو کے بعد دونوں اٹھے۔ حمید نے دوسرے کمرے میں جا کر بل ادا کیا۔ جب وہ ریسٹوران سے باہر نکلے تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ حمید کے دل میں یہ خواہش چٹکیاں لینے لگی کہ وہ ملک پر اپنی شرارت واضح کر دے مگر اچھے موقع کی تلاش میں کافی وقت گذر گیا۔ ملک بالکل خاموش تھا۔ اور حمید کے اندر پھلجھڑی چھوٹ رہی تھی۔ بیشمار ننھی ننھی اور خوب صورت اور شوخ و شنگ باتیں اس کے دل و دماغ میں پیدا ہو کر بجھ رہی تھیں۔

وہ ملک صاحب کی خاموشی سے پریشان ہو رہا تھا اور جب اس نے اپنی پریشانی کا اظہار نہ کیا تو آہستہ آہستہ اس کی طبیعت پر ایک افسردگی سی طاری ہو گئی وہ محسوس کرنے لگا کہ اس کی شرارت اب دُم کٹی گلہری بن کر رہ گئی ہے۔

دیر تک دونوں بالکل خاموش چلتے رہے جب کمپنی باغ آیا تو ملک ایک بنچ پر متفکرانہ انداز میں بیٹھ گیا۔ چند لمحے ایسی خاموشی میں گذرے کہ حمید کے دل میں وہاں سے اٹھ بھاگنے کی خواہش پیدا ہوئی مگر اس وقت زیادہ دیر تک دبے رہنے کے

باعث اس کی تمام تیزی اور طراری ماند پڑ چکی تھی۔

ملک بنچ پر سے اٹھ کھڑا ہوا "حمید، تم نے مجھے رُوحانی تکلیف پہنچائی ہے۔ تمہیں یہ شرارت نہیں کرنی چاہئے تھی۔ اس آواز میں درد پیدا ہو گیا۔ تم نہیں جانتے کہ تمہاری اس شرارت سے مجھے کس قدر رُوحانی تکلیف پہنچی ہے اللہ تمہیں معاف کرے۔

یہ کہہ کر وہ چلا گیا، اور حمید اپنے آپ کو بڑی شدت کا گنہگار محسوس کرنے لگا معافی مانگنے کا خیال اُس کو آیا تھا، مگر باغ سے نکل کر باہر سڑک پر ملک پہنچ چکا تھا۔ ملک کے چلے جانے کے بعد حمید گناہ اور ثواب کے چکر میں پھنس گیا شراب کے حرام ہونے کے متعلق جتنی باتیں لوگوں سے سُنی تھیں سب کی سب اُس کے کانوں میں جھنجھنانے لگیں۔

"شراب اخلاق بگاڑ دیتی ہے —— شراب خانہ خراب ہے۔ شراب پی کر آدمی بے ادب اور بے حیا ہو جاتا ہے۔ شراب اسی لئے حرام ہے۔ شراب صحت کا ستیاناس کر دیتی ہے۔ اس کے پینے سے پھیپھڑے چھلنی ہو جاتے ہیں۔ شراب شراب، شراب کی ایک لامتناہی گردان حمید کے دماغ میں شروع ہو گئی اُس کی تمام بُرائیاں ایک ایک کر کے اس کے سامنے آ گئیں۔

"سب سے بڑی بُرائی تو یہ ہے" حمید نے محسوس کیا کہ میں نے بے ضرر شربت سمجھ کر ایک شریف آدمی کو دھوکے سے شراب پلا دی ہے ممکن ہے وُہ پکا نمازی اور پرہیزگار ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غلطی میری ہے اور سارا گناہ میرے ہی سر ہوگا۔ مگر اُسے جو رُوحانی تکلیف پہنچی ہے اس کا کیا ہوگا —— ؟ واللہ باللہ میرا

یہ مقصد نہیں تھا کہ اُسے تکلیف پہنچے۔ میں اُس سے معافی مانگ لوں گا۔
لیکن اس سے معافی مانگ کر بھی تو میرا گناہ ہلکا نہیں ہوگا۔ ایک میں نے شراب پی
دوسرے میں نے اُس کو دھوکہ دے کر پلائی۔

وسکی کا نشہ اس کے دماغ میں جمائیاں لینے لگا جس سے اس کا احساس گناہ گھناؤنی شکل اختیار کر گیا مجھے معافی مانگنی چاہیئے۔ مجھے شراب چھوڑ دینی چاہیئے مجھے گناہوں سے پاک زندگی بسر کرنی چاہیئے۔

اُس کو شراب شروع کئے صرف دو برس ہوتے تھے۔ ابھی تک وہ اس کا عادی نہیں ہوا تھا چنانچہ اُس نے گھر لوٹتے ہوتے راستے میں دوسری باتوں کے ساتھ اس پر بھی غور کیا۔ میں شراب کو ہاتھ تک نہیں لگاؤں گا۔ یہ کوئی ضروری چیز نہیں میں اُس کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہوں ——— دُنیا کہتی ہے ——— دُنیا ——— کہتی ہے۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ منہ سے لگی ہوتی یہ چھوٹ ہی نہیں سکتی۔ میں اسے بالکل چھوڑ دوں گا۔ میں اس خیال کو غلط ثابت کر دوں گا۔

یہ سوچتے ہوتے حمید نے خود کو ایک ہیرو محسوس کیا۔ پھر ایک دم اس کے دماغ میں خدا کا خیال آیا۔ جس نے اُسے تباہی سے بچا لیا تھا۔ مجھے شکر بجالانا چاہیئے کہ میرے سینے میں نور پیدا ہو گیا ہے۔ میں نہ جانے کتنی دیر تک اس کھائی میں پڑا رہتا۔

وہ اپنی گلی میں پہنچ چکا تھا۔ اُدھر آسمان پر گدلے بادلوں میں چاند صابن کے جھاگ لگے گالوں کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ ہوا خنک تھی۔ فضا بالکل خاموش تھی۔ حمید پہ خدا کا رُعب اور شراب نوشی سے بچ جانے کے احساس نے رقت طاری کر دی۔ اُس نے شکرانے کا سجدہ ادا کرنا چاہا۔ اس خیال سے کہ کوئی اُسے دیکھ لیگا۔

وہ کچھ دیر کے لئے ٹھٹک گیا۔ مگر فوراً ہی یہ سوچ کر کہ یوں خدا کی نگاہوں میں اس کی وقعت بڑھ جائے گی، وہ ڈبکی لگانے کے انداز میں جھکا اور اپنی پیشانی گلی کے ٹھنڈے ٹھنڈے پتھریلے فرش کے ساتھ جوڑ دی۔

جب وہ اٹھا تو اس نے اپنے آپ کو ایک بہت بڑا آدمی محسوس کیا۔ اُس نے جب آس پاس کی اُونچی اُونچی دیواروں کو دیکھا تو وہ اُسے اپنے قد کے مقابلے میں بہت پست معلوم ہوئیں۔

اس واقعہ کے ڈیڑھ مہینے بعد اسی کمرے میں جہاں اب حمید بیٹھا اپنی سات برس کی پُرانی تصویر پر رشک کھا رہا تھا۔ اس کا دوست ملک آیا۔ اندر آتے ہی اس نے اپنی جیب سے بلیک اینڈ وائٹ کا ادّھا نکالا اور زور سے میز پر رکھ کر کہا "آؤ حمید آج پئیں اور خوب پئیں ——— یہ ختم ہو جائے گی تو اور لائیں گے۔

حمید اس قدر متحیّر ہوا کہ وہ اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ ملک نے دوسری جیب سے سوڈے کی بوتل نکالی۔ تپائی پر سے گلاس اٹھا کر اُس میں شراب اُنڈیلی۔ سوڈے کی بوتل، انگوٹھے سے کھولی اور حمید متحیر آنکھوں کے سامنے وہ دو پیگ غٹا غٹ پی گیا۔

حمید نے ہکلاتے ہوئے کہا: "لیکن ——— اُس روز تم نے مجھے اتنا برا بھلا کہا تھا ———"

ملک نے ایک قہقہہ بلند کیا: "تم نے مجھ سے شرارت کی میں نے بھی اس کے جواب میں تم سے شرارتاً کہہ دیا۔ مگر بھئی ایمان کی بات ہے جو مزہ اُس روز جن کے دو پیگ پینے میں آیا ہے۔ زندگی بھر کبھی نہیں آئے گا۔ لو اب چھوڑو اس قصّے کو۔

——— وسکی پیو، جن وِن بکواس ہے۔ شراب پینی ہو تو وسکی پینی چاہیئے۔

یہ سُن کر حمید کو محسوس ہوا تھا کہ سجدہ اس نے گلی میں کیا تھا۔ ٹھنڈے فرش سے نکل کر اس کی پیشانی پر چپک گیا تھا۔

یہ سجدہ بھوت کی طرح حمید کی زندگی سے چمٹ گیا تھا۔ اُس نے اس سے نجات حاصل کرنے کے لیئے پھر پینا شروع کیا۔ مگر اس سے بھی کچھ فائدہ نہ ہوا۔

اُن سات برسوں میں جو اُس کی پُرانی تصویر اور اُس کے درمیان کھلے ہوئے تھے۔ یہ ایک سجدہ بیشمار مرتبہ حمید کو اس کی اپنی نگاہوں میں ذلیل و رُسوا کر چکا تھا۔ اُس کی خودی، اُس کی تخلیقی قوت، اس کی زندگی کی وہ حرارت جس سے حمید اپنے ماحول کو گرما کے رکھنا چاہتا تھا۔ اس سجدے نے قریب قریب سرد کر دی تھی۔ یہ سجدہ اس کی زندگی میں ایک ایسی خراب بریک بن گئی تھی جو کبھی کبھی اپنے آپ کو اُس کے چلتے ہوتے پہیّوں کو ایک دھکّے کے ساتھ ٹھہرا دیتی تھی۔

سات برس کی پُرانی تصویر اور اس کے سامنے میز پر تھی۔ جب سارا واقعہ اس کے دماغ میں پوری تفصیل کے ساتھ دُہرایا جا چکا تو اُس کے اندر ایک ناقابلِ بیان اضطراب پیدا ہو گیا۔ وہ ایسا محسوس کرنے لگا جیسے اُس کو قَے ہونے والی ہے۔

وہ گھبرا کر اُٹھا اور سامنے کی دیوار کے ساتھ اُس نے اپنا ماتھا رگڑنا شروع کر دیا۔ جیسے وہ اُس سجدے کا نشان مٹانا چاہتا ہے اس عمل سے اسے جب جسمانی تکلیف پہنچی تو وہ پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ سر جھکا کر اور کاندھے ڈھیلے کر کے اس نے تھکی ہوئی آواز میں کہا "اے خدا میرا سجدہ مجھے واپس دیدے ———"

کالی شلوار

دہلی آنے سے پہلے وہ انبالہ چھاؤنی میں جہاں کئی گورے اُس کے گاہک تھے ان گوروں سے ملنے جلنے کے باعث وہ انگریزی کے دس پندرہ جملے سیکھ گئی تھی۔ ان کو وہ عام گفتگو میں استعمال نہیں کرتی تھی۔ لیکن جب وہ دہلی میں آئی اور اُس کا کاروبار نہ چلا، تو ایک روز اُس نے اپنی پڑوسن طمنچہ جان سے کہا۔ دس لیف ــــ ویری بیڈ"۔ یعنی یہ زندگی بہت بُری ہے۔ جب کہ کھانے ہی کو نہیں ملتا انبالہ چھاؤنی میں اُس کا دھندا بہت اچھی طرح چلتا تھا۔ چھاؤنی کے گورے شراب پی کر اُس کے پاس آجاتے تھے اور وہ تین چار گھنٹوں ہی میں آٹھ دس گوروں کو نمٹا کر بیس، تیس روپے پیدا کر لیا کرتی تھی۔ یہ گورے اس کے ہم وطنوں کے مقابلے میں اچھے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایسی زبان بولتے تھے جس کا مطلب سلطانہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ مگر اُن کی زبان سے لاعلمی اس کے حق میں بہت اچھی ثابت ہوتی تھی۔ اگر وہ اس سے کچھ رعایت چاہتے تو وہ سر ہلا کر کہدیا کرتی تھی،

صاحب ہماری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آتا۔ اور اگر وہ اُس سے ضرورت سے زیادہ چھیڑ چھاڑ کرتے تو وہ اُن کو اپنی زبان میں گالیاں دینی شروع کر دیتی۔ وہ حیرت میں اُس کے مُنہ کی طرف دیکھتے تو وہ اُن سے کہتی "صاحب ایک دم اُلّو کا پٹھا ہے حرام زادہ ہے ـــــــ سمجھا" یہ کہتے وقت وہ اپنے لہجے میں سختی پیدا نہ کرتی بلکہ بڑے پیار کے ساتھ اُن سے باتیں کرتی۔ یہ گورے ہنس دیتے اور ہنستے وقت وہ سلطانہ کو بالکل اُلّو کے پٹھے دکھائی دیتے۔

مگر یہاں دہلی میں جب سے وہ آئی تھی ایک گورا بھی اس کے یہاں نہیں آیا تھا۔ تین مہینے اُس کو ہندوستان کے اس شہر میں رہتے ہو گئے تھے۔ جہاں اُس نے سُنا تھا کہ بڑے بڑے لاٹ صاحب رہتے ہیں۔ جو گرمیوں میں شملے میں چلے جاتے ہیں مگر صرف چھ آدمی اُس کے پاس آئے تھے۔ صرف چھ، یعنی مہینے میں دو اور اُن چھ گاہکوں سے اُس نے خدا جھوٹ نہ بُلوائے، تو ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کئے تھے۔ تین روپے سے زیادہ پر کوئی مانتا ہی نہیں تھا۔ سلطانہ نے اُن میں سے پانچ آدمیوں کو اپنا ریٹ دس روپے بتایا تھا۔ مگر تعجب کی بات ہے کہ اُن میں سے ہر ایک نے یہی کہا، بھئی ہم تین روپے سے ایک کوڑی زیادہ نہ دیں گے۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ اُن میں سے ہر ایک نے صرف تین روپے کے قابل سمجھا چنانچہ جب چھٹا آیا تو اُس نے خود اُس سے کہا۔ دیکھو میں تین روپے ایک ٹیم کے لوں گی۔ اُس سے ایک دھیلا تم کم کہو تو میں نہ لوں گی۔ اب تمہاری مرضی ہو تو رہو۔ ورنہ جاؤ۔ چھٹے آدمی نے یہ بات سُن کر تکرار نہ کی اور اُس کے ہاں ٹھہر گیا۔ جب دوسرے کمرے میں دروازے بند کر کے وہ اپنا کوٹ اُتارنے لگا تو سلطانہ نے کہا لائیے ایک روپیہ

دُودھ کا، اُس نے ایک روپیہ تو نہ دیا۔ لیکن نئے بادشاہ کی چمکتی ہوئی اٹھنّی جیب سے نکال کر اُس کو دے دی اور سُلطانہ نے بھی چپکے سے لے لی کہ چلو، جو آیا ہے غنیمت ہے۔

ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینوں میں ——— یعنی ۲ روپے ماہوار تو اُس کوٹھے کا کرایہ تھا جس کو مالک مکان انگریزی زبان میں فلیٹ کہتا تھا۔ اس فلیٹ میں ایسا پاخانہ تھا جس میں زنجیر کھینچنے سے ساری گندگی پانی کے زور سے ایک دم نیچے نل میں غائب ہو جاتی تھی۔ اور بڑا شور ہوتا تھا۔ شروع شروع میں تو اس شور نے اُسے بہت ڈرایا تھا۔ پہلے دن جب وہ رفع حاجت کے لئے اس پاخانہ میں گئی تو اس کی کمر میں شدّت کا درد ہو رہا تھا۔ فارغ ہو کر جب اُٹھنے لگی تو اس نے لٹکی ہوئی زنجیر کا سہارا لے لیا۔ اُس زنجیر کو دیکھ کر اُس نے خیال کیا۔ کہ چونکہ یہ مکان خاص ہم لوگوں کی رہائش کے لئے تیار کئے گئے ہیں۔ یہ زنجیر اس لئے لگائی گئی ہے کہ اٹھتے وقت تکلیف نہ ہو اور سہارا مل جایا کرے مگر جونہی اُس نے زنجیر پکڑ کر اٹھنا چاہا اُوپر کھٹ کھٹ سی ہوئی اور پھر ایک دم پانی اس شور کے ساتھ نکلا۔ کہ ڈر کے مارے اس کی چیخ نکل گئی۔

خدابخش دوسرے کمرہ میں اپنا فوٹوگرافی کا سامان درست کر رہا تھا۔ اور ایک صاف بوتل میں ہائیڈرو کونین ڈال رہا تھا کہ اُس نے سُلطانہ کی چیخ سنی وہ دوڑ کر باہر نکلا اور سُلطانہ سے پوچھا ”کیا ہوا؟ ——— یہ چیخ تمہاری تھی۔؟“

سُلطانہ کا دل دھڑک رہا تھا اُس نے کہا ”یہ مُوا پاخانہ ہے یا کیا ہے۔ یہ ریل گاڑی کی زنجیر کی طرح کیا لٹکا رکھی ہے۔ میری کمر میں درد تھا، میں نے کہا۔

چلو اس کا سہارا لے لوں گی۔ پر اس موئی زنجیر کو چھیڑنا تھا کہ وہ دھماکہ ہوا، کہ میں تم سے کیا کہوں۔

اس پر خدابخش بہت ہنسا تھا۔ اور اُس نے سلطانہ کو اس پاخانہ کی بابت سب کچھ بتا دیا تھا کہ یہ نئے فیشن کا ہے، جس میں زنجیر ہلانے سے سب گندگی نیچے زمین میں دھنس جاتی ہے۔

خدابخش اور سلطانہ کا آپس میں کیسے سمبندھ ہوا۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ خدابخش راولپنڈی کا تھا۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد اُس نے لاری چلانا سیکھا چنانچہ چار برس تک وہ راولپنڈی اور کشمیر کے درمیان لاری چلانے کا کام کرتا رہا۔ اس کے بعد کشمیر میں اس کی دوستی ایک عورت سے ہو گئی۔ اُس کو بھگا کر وہ لاہور لے آیا۔ لاہور میں چونکہ اُس کو کوئی کام نہ ملا۔ اس لئے اُس نے عورت کو پیشے پر بٹھا دیا، دو تین برس تک وہ سلسلہ جاری رہا اور وہ عورت کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی۔ خدابخش کو معلوم ہوا کہ وہ انبالہ میں ہے، وہ اسی کی تلاش میں انبالہ آیا۔ جہاں اُس کو سلطانہ مل گئی۔ سلطانہ نے اس کو پسند کیا۔ چنانچہ دونوں کا سمبندھ ہو گیا

خدابخش کے آنے پر ایک دم سلطانہ کا کاروبار چمک اٹھا، عورت چونکہ ضعیف الاعتقاد تھی اس لئے اس نے سمجھا کہ خدابخش بڑا بھاگوان ہے جس کے آنے سے اتنی ترقی ہو گئی۔ چنانچہ اس خوش اعتقادی نے خدابخش کی وقعت اس کی نظروں میں اور بھی بڑھا دی۔

خدابخش آدمی محنتی تھا۔

سارا دن ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا پسند نہیں کرتا تھا۔

چنانچہ اس نے ایک فوٹو گرافر سے دوستی پیدا کی، جو ریلوے اسٹیشن کے باہر منٹ کیمرے سے فوٹو کھینچا کرتا تھا۔ اس لئے اُس نے فوٹو کھینچنا سیکھ لیا۔ پھر سلطانہ سے ساٹھ روپے لے کر کیمرہ بھی خرید لیا، آہستہ آہستہ ایک پردہ بنوایا، دو کرسیاں خریدیں اور فوٹو دھونے کا سب سامان لے کر اس نے اپنا علیحدہ کام شروع کر دیا۔"

کام چل نکلا۔ چنانچہ اس نے تھوڑی ہی دیر کے بعد اپنا اڈہ انبالے چھاؤنی میں قائم کر دیا، یہاں وہ گوروں کے فوٹو کھینچتا رہتا، ایک مہینے کے اندر اندر اُس کی چھاؤنی کے متعدد گوروں سے واقفیت ہو گئی، چنانچہ وہ سلطانہ کو وہیں لے گیا یہاں چھاؤنی میں خدابخش کے ذریعہ کئی گورے سلطانہ کے مستقل گاہک بن گئے اور اس کی آمدنی پہلے سے دگنی ہو گئی۔

سلطانہ نے کانوں کے لئے بُندے خریدے، ساڑھے پانچ تولہ کی آٹھ کنگنیاں بھی بنوالیں۔ دس پندرہ اچھی اچھی ساڑھیاں بھی جمع کر لیں۔ گھر میں فرنیچر وغیرہ بھی آ گیا۔ قصہ مختصر یہ کہ انبالہ چھاؤنی میں بڑی خوش حال تھی۔ مگر ایکا ایکی نہ جانے خدابخش کے دل میں کیا سمائی کہ اس نے دہلی جانے کی ٹھان لی۔ سلطانہ انکار کیسے کرتی۔ جبکہ خدابخش کو اپنے لئے بہت مبارک خیال کرتی تھی اس نے خوشی خوشی دہلی جانا قبول کر لیا۔ بلکہ اس نے یہ بھی سوچا کہ اتنے بڑے شہر میں جہاں لاٹ صاحب رہتے ہیں۔ اُن کا دھندا اور بھی اچھا چلے گا۔ اپنی سہیلیوں سے وہ دہلی کی تعریف سُن چکی تھی، پھر وہاں حضرت نظام الدین اولیا کی خانقاہ تھی جس سے اُسے بے حد عقیدت تھی، چنانچہ جلدی جلدی گھر کا بھاری سامان بیچ باچ کر خدابخش

کے ساتھ دہلی آگئی۔ یہاں پہنچ کر خدا بخش نے بیس روپے ماہوار پر ایک چھوٹا سا فلیٹ لے لیا جس میں دونوں رہنے لگے۔

ایک ہی قسم کے نئے مکانوں کی لمبی سی قطار سڑک کے ساتھ ساتھ چلی گئی تھی، میونسپل کمیٹی نے شہر کا یہ حصّہ خاص کسبیوں کے لئے مقرّر کر دیا تھا۔ تاکہ شہر میں وہ جگہ جگہ اپنے اڈّے نہ بنائیں۔ نیچے دوکانیں تھیں۔ اور اُوپر دو منزلہ رہائشی فلیٹ، چونکہ سب عمارتیں ایک ہی ڈیزائن کی تھیں، اس لئے شروع میں سلطانہ کو اپنا فلیٹ تلاش کرنے میں بہت دِقّت محسوس ہوتی تھی۔ پر جب لانڈری والے نے اپنا بورڈ گھر کی پیشانی پر لگا لیا تو اس کو ایک نشانی مل گئی۔ "یہاں میلے کپڑوں کی دھلائی کی جاتی ہے"۔ یہ بورڈ پڑھتے ہی اپنا فلیٹ تلاش کر لیا کرتی تھی۔ اسی طرح اُس نے اور بہت سی نشانیاں قائم کر لی تھیں۔ مثلاً بڑے بڑے حروف میں جہاں "کوئلوں کی دوکان" لکھا تھا، وہاں، اس کی سہیلی ہیرا بائی رہتی تھی جو کبھی کبھی ریڈیو گھر میں گانے جایا کرتی تھی، جہاں "شرفا کے کھانے کا اعلیٰ انتظام ہے" لکھا تھا وہاں اُس کی سہیلی مختار رہتی تھی۔ نواڑ کے کارخانہ کے اوپر انوری رہتی تھی جو اسی کارخانہ کے سیٹھ کے پاس ملازم تھی، چونکہ سیٹھ صاحب کو رات کے وقت اپنے کارخانہ کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی اسی لئے وہ انوری کے پاس ہی رہا کرتے تھے۔

دوکان کھولتے ہی گاہک تھوڑے ہی آتے ہیں، چنانچہ جب ایک مہینے تک سُلطانہ بے کار رہی تو اُس نے یہی سوچ کر اپنے دل کو تسلی دی، پر جب دو مہینے گزر گئے اور کوئی آدمی اس کے کوٹھے پر نہ آیا تو اُسے بہت تشویش ہوئی، اس نے خدا بخش سے کہا۔ "کیا بات ہے خدا بخش، دو مہینے آج پورے ہو گئے ہمیں یہاں آئے ہوئے

کسی نے ادھر کا رُخ بھی نہیں کیا۔ مانتی ہوں آجکل بازار بہت مندا ہے پر اتنا مندا بھی تو نہیں کہ مہینے بھر میں کوئی شکل دیکھنے میں ہی نہ آئے۔ خدابخش کو بھی یہ بات عرصہ سے کھٹک رہی تھی مگر وہ خاموش تھا۔ پر جب سُلطانہ نے خود بات چھیڑی تو اس نے کہا۔" میں کئی دنوں سے اس کی بابت سوچ رہا ہوں، ایک بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ جنگ کی وجہ سے لوگ باگ دوسرے دھندوں میں پڑکر ادھر کا راستہ بھول گئے ہیں یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ —— وہ اس کے آگے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی، خدابخش اور سُلطانہ دونوں اس آواز کی طرف متوجہ ہوئے۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ خدابخش نے لپک کر دروازہ کھولا۔ ایک آدمی اندر داخل ہوا جس سے تین روپے میں سودا طے ہوا، اس کے بعد پانچ اور آئے یعنی تین مہینے میں چھ، جن سے سلطانہ نے صرف ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کئے۔

بیس روپے ماہوار تو فلیٹ کے کرایہ میں چلے جاتے تھے۔ پانی کا ٹیکس اور بجلی کا بل جُدا تھا۔ اس کے علاوہ گھر کے دوسرے خرچ تھے۔ کھانا پینا۔ کپڑے لتے، دوا دارو، آمدن کچھ بھی نہیں تھی۔ ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینے میں آئے۔ تو اسے آمدن تو نہیں کہہ سکتے۔ سلطانہ پریشان ہو گئی۔ ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں جو اس نے انبالے میں بنوائی تھیں۔ آہستہ آہستہ بک گئیں۔ آخری کنگنی کی جب باری آئی تو اس نے خدابخش سے کہا" تم میری سُنو اور چلو —— واپس انبالے میں یہاں کیا دھرا ہے؟ دھرا بھی ہوگا، پر ہمیں تو یہ شہر راس نہیں آیا، تمہارا کام بھی وہاں خوب چلتا تھا، چلو، وہیں چلتے ہیں۔ جو نقصان ہوا ہے اُس کو اپنا

سر صدقہ سمجھو۔ اس کنگنی کو بیچ کر آؤ، میں اسباب وغیرہ باندھ کر تیار رکھتی ہوں۔ آج رات کی گاڑی سے یہاں سے چل دیں گے۔

خدابخش نے کنگنی سلطانہ کے ہاتھ سے لے لی اور کہا "نہیں، جانِ من انبالہ اب نہیں جائیں گے یہیں رہ کر دہلی میں کمائیں گے۔ یہ تمہاری چوڑیاں سب کی سب یہیں واپس آئیں گی، اللہ پر بھروسہ رکھو، وہ بڑا کارساز ہے۔ یہاں بھی کوئی نہ کوئی اسباب بنا ہی دے گا۔

سلطانہ چپ ہو رہی، چنانچہ آخری کنگنی بھی ہاتھ سے اتر گئی۔ بچے ہاتھ دیکھ کر اس کو بہت دکھ ہوتا تھا۔ پر کیا کرتی، پیٹ بھی تو آخر کسی حیلے سے بھرنا تھا۔

جب پانچ مہینے گزر گئے اور آمدن خرچ کے مقابلے میں چوتھائی سے بھی کچھ کم رہی تو سلطانہ کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی۔ خدابخش بھی اب سارا دن گھر سے غائب رہنے لگا تھا۔ سلطانہ کو اس کا بھی دکھ تھا اس میں کوئی شک نہیں کہ پڑوس میں اس کی دو تین ملنے والیاں موجود تھیں۔ جن کے ساتھ وہ اپنا وقت کاٹ سکتی تھی ہر روز ان کے یہاں جانا اور گھنٹوں بیٹھے رہنا اس کو بہت برا لگتا تھا چنانچہ آہستہ آہستہ اس نے ان سہیلیوں سے ملنا جلنا بالکل ترک کر دیا۔ سارا دن وہ اپنے سنسان مکان میں بیٹھی رہتی کبھی چھالیا کاٹتی رہتی۔ کبھی اپنے پرانے اور پھٹے ہوئے کپڑوں کو سیتی رہتی۔ اور کبھی باہر بالکونی میں آکر جنگلے کے ساتھ کھڑی ہو جاتی اور سامنے ریلوے شیڈ میں ساکت اور متحرک انجنوں کی طرف گھنٹوں بے مطلب دیکھتی رہتی۔

سڑک کی دوسری طرف مال گودام تھا۔ جو اس کونے سے اس کونے تک پھیلا ہوا تھا۔ داہنے ہاتھ کو لوہے کی چھت کے نیچے بڑی بڑی گانٹھیں پڑی رہتی تھیں اور

ہر قسم کے مال اسباب کے ڈھیر لگے رہتے تھے۔ بائیں ہاتھ کو کھلا میدان تھا جس میں بے شمار ریل کی پٹریاں بچھی ہوئی تھیں، دھوپ میں لوہے کی یہ پٹریاں چمکتیں۔ تو سلطانہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی جن پر نیلی نیلی رگیں بالکل ان پٹریوں کی طرح ابھری رہتی تھیں، اس لمبے اور کھلے میدان میں ہر وقت انجن اور گاڑیاں چلتی رہتی تھیں۔ کبھی ادھر اور کبھی ادھر۔ ان انجنوں اور گاڑیوں کی چھک چھک، پھک پھک سدا گونجتی رہتی تھی۔ صبح سویرے جب وہ اٹھ کر بالکونی میں آتی تو ایک عجیب سماں نظر آتا۔ دھند لکے میں انجنوں کے منہ سے گاڑھا گاڑھا دھواں نکلتا تھا اور گدلے آسمان کی جانب موٹے اور بھاری آدمیوں کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ بھاپ کے بڑے بڑے بادل بھی ایک شور کے ساتھ پٹریوں سے اٹھتے تھے اور آنکھ جھپکنے کی دیر میں ہوا کے اندر گھل مل جاتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے انجن نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہو، اکیلے پٹریوں پر چلتا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اسے بھی کسی نے زندگی کی پٹری پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود بخود جا رہی ہے، دوسرے لوگ کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چلی جا رہی ہے۔

نہ جانے کہاں، پھر ایک روز ایسا آئے گا جب اس دھکے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا اور وہ کہیں رک جائے گی۔ کسی ایسے مقام پر جو اس کا دیکھا بھالا ہو گا۔

یوں تو وہ بے مطلب گھنٹوں کی ریل ان ٹیڑھی بانکی پٹریوں اور ٹھہرے اور چلتے ہوئے انجنوں کی طرف دیکھتی رہتی تھی، پر طرح طرح کے خیال اس کے دماغ میں آتے رہتے تھے۔ انبالہ چھاؤنی میں جب وہ رہتی تھی تو اسٹیشن کے پاس ہی

اُس کا مکان تھا۔ مگر وہاں اُس نے کبھی ان چیزوں کو ایسی نظروں سے نہیں دیکھا تھا اب بھی تو کبھی کبھی اس کے دماغ میں یہ خیال نہ آتا تھا۔ کہ جو سامنے ریل کی پٹڑیوں کا جال سا بچھا ہے اور جگہ جگہ سے بھاپ، دھواں اُٹھ رہا ہے۔ ایک بہت بڑا چکلہ ہے، بہت سی گاڑیاں ہیں جن کو موٹے موٹے انجن اِدھر اُدھر دھکیلتے رہتے ہیں۔ سلطانہ کو بعض اوقات یہ انجن سیٹھ معلوم ہوتے ہیں۔ جو کبھی کبھی انبالہ میں اس کے ہاں آیا کرتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ کسی انجن کو آہستہ آہستہ گاڑیوں کی قطار کے پاس سے گزرتا دیکھتی تو اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ کوئی آدمی چکلے کے کسی بازار میں سے اُوپر کوٹھیوں کی طرف دیکھتا جا رہا ہے۔

سُلطانہ سمجھتی تھی کہ ایسی باتیں سوچنا دماغ کی خرابی کا باعث ہے۔ چنانچہ جب اس قسم کے خیال اُس کو آنے لگے تو اُس نے بالکونی میں جانا چھوڑ دیا خدابخش سے اُس نے بارہا کہا "دیکھو میرے حال پر رحم کرو۔ یہاں گھر میں رہا کرو۔ میں سارا دن یہاں بیماروں کی طرح پڑی رہتی ہوں مگر اُس نے بارہا سُلطانہ سے یہ کہہ کر اس کو تشفی کر دی۔ جانِ من میں باہر کچھ کمانے کی فکر کر رہا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو چند دنوں ہی میں بیڑا پار ہو جائے گا۔

پُورے پانچ مہینے ہو گئے تھے مگر ابھی تک نہ سُلطانہ کا بیڑا پار ہوا تھا، نہ خدابخش کا!

محرم کا مہینہ سر پر آ رہا تھا مگر سُلطانہ کے پاس کالے کپڑے بنوانے کے لئے کچھ بھی نہ تھا، مختار نے لیڈی ہملٹن کی ایک نئی وضع کی قمیص بنوائی تھی۔ جس کی آستینیں کالی جارجیٹ کی تھیں۔ اس کے ساتھ میچ کرنے کے لئے اُس کے پاس

کالی ساٹن کی شلوار تھی جو کاجل کی طرح چمکتی تھی۔ انوری نے ریشمی جارجٹ کی ایک بڑی نفیس ساڑھی خریدی تھی۔ اُس نے سلطانہ سے کہا تھا کہ وہ ساڑھی کے نیچے سفید بوسکی کا پیٹی کوٹ پہنے گی، کیونکہ یہ نیا فیشن ہے اس ساڑھی کے ساتھ پہننے کو انوری کالی مخمل کا ایک جوتا لائی تھی جو بڑا نازک تھا۔ سلطانہ نے جب یہ تمام چیزیں دیکھیں تو اس کو احساس نے دکھ دیا کہ وہ محرم منانے کے لئے ایسا لباس خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتی۔

انوری اور مختار کے پاس یہ لباس دیکھ کر جب وہ گھر آئی تو اُس کا دل بہت مغموم تھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پھوڑا سا اُس کے اندر پیدا ہو گیا تھا دیر تک وہ دری پر گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹی رہی۔ پر جب اس کی گردن اونچائی کے باعث اکڑ سی گئی تو اٹھ کر بالکونی میں چلی گئی تا کہ غم افزا خیالات کو اپنے دماغ میں سے نکال دے۔

سامنے پٹڑیوں پر گاڑیوں کے ڈبے کھڑے تھے۔ پر انجن کوئی بھی نہ تھا۔ شام کا وقت تھا، چھڑکاؤ ہو چکا تھا۔ اس لئے گرد و غبار دب گیا تھا بازار میں ایسے آدمی چلنے شروع ہو گئے تھے جو تاک جھانک کرنے کے بعد چپ چاپ گھروں کا رُخ کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک آدمی نے گردن اونچی کر کے سلطانہ کی طرف دیکھا سلطانہ مسکرا دی اور اس کو بھول گئی کیونکہ اب سامنے پٹڑیوں پر انجن نمودار ہو گیا تھا سلطانہ نے اس کی طرف غور سے دیکھنا شروع کر دیا اور آہستہ آہستہ یہ خیال اس کے دماغ میں آیا کہ انجن نے بھی کالا لباس پہن رکھا ہے یہ عجیب و غریب خیال دماغ میں سے نکالنے کی خاطر جب اُس نے سڑک کی جانب دیکھا۔ تو اُسے وہی آدمی بیل

گاڑی کے پاس کھڑا نظر آیا۔جس نے اس کی طرف للچائی نظروں سے دیکھا تھا سلطانہ نے ہاتھ سے اُسے اشارہ کیا، اس آدمی نے اِدھر اُدھر دیکھ کر ایک لطیف اشارے سے پوچھا، کدھر سے آؤں، سلطانہ نے اُسے راستہ بتا دیا۔ وہ آدمی تھوڑی دیر کھڑا رہا مگر پھر بڑی پھُرتی سے اُوپر چلا آیا۔

سلطانہ نے اُسے دری پر بٹھا دیا۔جب وہ بیٹھ گیا تو اس نے سلسلہ گفتگو شروع کرنے کے لئے کہا۔آپ اوپر آتے ڈرتے رہے تھے وہ آدمی یہ سُن کر مسکرایا تمہیں کیسے معلوم ہوا ——— ڈرنے کی بات ہی کیا تھی۔؟

اس پر سلطانہ نے کہا یہ میں نے اس لئے کہا کہ آپ دیر تک وہیں کھڑے رہے اور پھر کچھ سوچ کر ادھر آئے۔وہ یہ سُن کر مسکرایا۔" تمہیں غلط فہمی ہوتی ہے میں تمہارے اُوپر والے فلیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔وہاں کوئی عورت کھڑی ایک مرد کو ٹھینگا دکھا رہی تھی مجھے یہ منظر دیکھ کر پسند آیا۔پھر بالکونی میں سبز بلب روشن ہوا تو میں کچھ دیر کے لئے ٹھہر گیا۔سبز روشنی مجھے بہت پسند ہے۔آنکھوں کو بہت اچھی لگتی ہے یہ کہہ کر اس نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔پھر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ سُلطانہ نے پُوچھا، آپ جا رہے ہیں؟ اس آدمی نے جواب دیا، "نہیں" میں تمہارے اس مکان کو دیکھنا چاہتا ہوں ——— چلو مجھے تمام کمرے دکھاؤ۔"

سُلطانہ نے اس کو تینوں کمرے ایک ایک کر کے دکھا دیئے۔اُس آدمی نے بالکل خاموشی سے ان کمروں کا معائنہ کیا۔جب وہ دونوں پھر اُسی کمرے میں آگئے جہاں پہلے بیٹھے تھے تو اُس آدمی نے کہا،" میرا نام شنکر ہے۔"

سُلطانہ نے پہلی بار غور سے شنکر کی طرف دیکھا۔وہ متوسط قد کا معمولی شکل د

صورت کا آدمی تھا۔ مگر اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر صاف اور شفاف تھیں۔ کبھی کبھی اُن میں ایک عجیب قسم کی چمک بھی پیدا ہوتی تھی گٹھیلا اور کسرتی بدن کنپٹیوں پر اس کے بال سفید ہو رہے تھے۔ خاکستری رنگ کی گرم پتلون پہنے تھا۔ سفید قمیص تھی جس کا کالر گردن پر سے اُوپر کو اٹھا ہوا تھا۔

شنکر کچھ اس طرح دری پر بیٹھا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ شنکر کے بجائے سُلطانہ گاہک ہے۔ اس احساس نے سُلطانہ کو قدرے پریشان کر دیا۔ چنانچہ اُس نے شنکر سے کہا۔ "فرمایئے۔"

شنکر بیٹھا تھا۔ یہ سُن کر لیٹ گیا۔ "میں کیا فرماؤں، کچھ تُم ہی فرماؤ۔ بُلایا تمہیں نے ہے مجھے۔ جب سُلطانہ کچھ نہ بولی تو وُہ اٹھ بیٹھا۔" میں اب سمجھا، لو مجھ سے سنو، جو کچھ تم نے سمجھا غلط ہے، میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کچھ دے کر جاتے ہیں! ؟ ڈاکٹروں کی طرح میری بھی فیس ہے۔ جب مجھے بُلایا جائے تو فیس دینا ہی پڑتی ہے

سُلطانہ سُن کر چکرا گئی۔ مگر اس کے باوجود اُسے بے اختیار ہنسی آ گئی۔"

آپ کام کیا کرتے ہیں۔؟

شنکر نے جواب دیا۔ "یہی جو تم لوگ کرتے ہو۔

"کیا ؟"

"تم کیا کرتی ہو ؟

"میں —— میں —— میں کچھ بھی نہیں کرتی۔"

"میں کچھ بھی نہیں کرتا۔"

"سُلطانہ نے بھنّا کر کہا۔" یہ کوئی بات نہ ہوئی۔"

آپ کچھ نہ کچھ ضرور کرتے ہوں گے۔

تنشکر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا تم بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرتی ہوں گی۔

"جھک مارتی ہوں۔"

"میں بھی جھک مارتا ہوں۔"

"تو آؤ دونوں جھک ماریں۔"

"میں حاضر ہوں مگر جھک مارنے کے دام میں کبھی نہیں دیا کرتا۔"

"ہوش کی دوا کرو، یہ لنگر خانہ نہیں۔"

"اور میں بھی والنیٹر نہیں ہوں۔"

سلطانہ یہاں رک گئی۔ اس سے پوچھا یہ والنیٹر کون ہوتے ہیں۔"

تنشکر نے جواب دیا: "اُلّو کے پٹھے۔"

"میں بھی اُلّو کی پٹھی نہیں۔"

"مگر وہ آدمی خدا بخش جو تمہارے ساتھ رہتا ہے ضرور اُلّو کا پٹھا ہے۔"

"کیوں"

"اس لئے کہ وہ کئی دنوں سے ایک ایسے خدا رسیدہ فقیر کے پاس اپنی قسمت کھلوانے کی خاطر جا رہا ہے۔ جس کی اپنی قسمت زنگ لگے تالے کی طرح بند ہے۔ یہ تنشکر کہہ کر ہنسا۔"

اس پر سلطانہ نے کہا۔ تم ہندو ہو۔ اسی لئے ہمارے ان بزرگوں کا مذاق اڑاتے ہو۔

تنشکر مسکرایا۔ ایسی جگہوں پر ہندو مسلم کا سوال پیدا نہیں ہوا کرتے پنڈت اور

مولوی اگر یہاں آئیں تو وہ بھی شریف آدمی بن جائیں۔

"جانے تم کیا اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہو ———" بولو رہو گے۔

"اسی شرط پر جو پہلے بتا چکا ہوں۔"

سلطانہ اُٹھ کھڑی ہوئی "جاؤ رستہ پکڑو۔"

شنکر آرام سے اُٹھا۔ پتلون کی جیبوں میں اُس نے اپنے دونوں ہاتھ ٹھونسے اور جاتے ہوئے کہا "میں کبھی کبھی اس بازار سے گزرا کرتا ہوں جب بھی تمہیں ضرورت ہو بُلا لینا۔ میں بہت کام کا آدمی ہوں۔"

شنکر چلا گیا اور سلطانہ کالے لباس کو بھول کر دیر تک اس کے متعلق سوچتی رہی۔ اس آدمی کی باتوں نے اس کے دُکھ کو بہت ہلکا کر دیا تھا۔ اگر وہ انبالے میں آیا ہوتا جہاں وہ خوش حال تھی تو اُس نے کسی اور ہی رنگ میں اس آدمی کو دیکھا ہوتا اور ممکن ہے اس کو دھکے دے کر باہر نکال دیا ہوتا۔ مگر یہاں چونکہ وہ بہت اُداس رہتی تھی اس لئے شنکر کی باتیں اُسے بہت پسند آئیں۔

شام کو جب خدا بخش آیا تو سلطانہ نے اس سے پوچھا۔ "تم آج سارا دن کدھر غائب رہے ہو؟"

خدا بخش تھک کر چُور چُور ہو رہا تھا۔ کہنے لگا، "پُرانے قلعہ کے پاس سے آ رہا ہوں، وہاں ایک بزرگ کچھ دنوں سے ٹھہرے ہوتے ہیں۔ اُن ہی کے پاس ہر روز جاتا ہوں کہ ہمارے دن پھر جائیں۔

"کچھ اُنہوں نے تم سے کہا؟"

"نہیں، ابھی وہ مہربان نہیں ہوئے۔ پر سلطانہ، میں جو اُن کی خدمت کر رہا

ہوں وہ اکارت کبھی نہ جائے گی۔ اللہ کا فضل شامل حال رہا تو ضرور وارے نیارے ہو جائیں گے۔

سلطانہ کے دماغ میں محرم منانے کا خیال سمایا ہوا تھا۔ خدابخش سے رونی آواز میں کہنے لگی۔ سارا دن گھر سے غائب رہتے ہو، میں یہاں پنجرے میں قید رہتی ہوں۔ نہ کہیں جا سکتی ہوں نہ آسکتی ہوں۔ محرم سر پر آگیا ہے کچھ تم نے اس کی فکر بھی کی کہ مجھے کالے کپڑے چاہئیں۔ گھر میں پھوٹی کوڑی تک نہیں۔ کنگنیاں تھیں سو وہ ایک ایک کر کے بک گئیں، اب تم ہی بتاؤ، کیا ہوگا۔؟

یوں فقیروں کے پیچھے کب تک مارے مارے پھرا کرو گے۔ مجھے تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہاں دہلی میں خدا نے بھی ہم سے منہ موڑ لیا ہے۔ میری سُنو تو کام شروع کر دو۔ کچھ تو سہارا ہو ہی جائے گا۔

خدابخش دری پر لیٹ گیا کہنے لگا "پر یہ کام شروع کرنے کے لئے بھی تھوڑا سا سرمایہ چاہئے ——— خدا کے لئے تم ایسی دُکھ کی کبھی باتیں نہ کرو مجھ سے اب ——— برداشت نہیں ہو سکتیں، میں نے سچ مچ انبالہ چھوڑنے میں سخت غلطی کی۔ پر جو اللہ کرتا ہے اللہ ہی کرتا ہے۔ اور ہماری بہتری کے لئے کرتا ہے کیا پتہ ہے کچھ تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد ہم ———"

سلطانہ نے بات کاٹ کر کہا، تم خدا کے لئے کچھ کرو۔ چوری کرو یا ڈاکہ مارو پر مجھے ایک شلوار کا کپڑا ضرور لا دو۔ میرے پاس ایک سفید بوسکی کی قمیض پڑی ہے، اُس کو میں کالا رنگ دلوا لوں گی۔ سفید نینوں کا ایک نیا دوپٹہ بھی میرے پاس موجود ہے۔ وہی جو تم نے مجھے دیوالی پر لا کر دیا تھا۔ یہ بھی قمیض کے ساتھ کالا ہی رنگوا

لیا جائے۔ صرف ایک شلوار کی کسر ہے سو وہ تم کسی نہ کسی طرح پیدا کرو ۔۔۔ دیکھو تمہیں میری جان کی قسم کسی نہ کسی طرح ضرور لا دو ۔۔۔۔ میری بھتی کھاؤ اگر نہ لاؤ۔"

خدا بخش اٹھ بیٹھا، اب تم خواہ مخواہ زور دیتے چلی رہی ہو ۔۔۔۔ میں کہاں سے لاؤں گا ۔۔۔۔ افیم کھانے کے لئے تو میرے پاس پیسہ نہیں۔"

کچھ بھی کرو مجھے ساڑھے چار گز کالی ساٹن لا دو۔

"دعا کرو کہ آج رات ہی اللہ دو تین گاہک بھیج دے۔"

"لیکن تم کچھ نہیں کرو گے۔ تم اگر چاہو تو ضرور اتنے پیسے پیدا کر سکتے ہو جنگ سے پہلے یہ ساٹن بارہ چودہ آنہ گز مل جاتی تھی اب سوا روپے گز کے حساب سے ملتی ہے۔ ساڑھے چار گز پر کتنے روپے خرچ ہو جائیں گے۔

اب تم کہتی ہو تو میں کوئی حیلہ کروں گا۔ یہ کہہ کر خدا بخش اٹھا۔ تو اب ان باتوں کو بھول جاؤ، میں ہوٹل سے کھانا لے آؤں۔

ہوٹل سے کھانا آیا۔ دونوں نے مل کر زہر مار کیا اور سو گئے۔ صبح ہوئی۔ خدا بخش پرانے قلعے والے فقیر کے پاس چلا گیا۔ اور سلطانہ اکیلی رہ گئی۔ کچھ دیر لیٹی رہی۔ کچھ دیر سوئی رہی، ادھر ادھر کمروں میں ٹہلتی رہی۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اس نے اپنا سفید نینوں کا دوپٹہ اور سفید بوسکی کی قمیص نکالی اور نیچے لانڈری والے کو رنگنے کے لئے دے آئی۔ کپڑے دھونے کے علاوہ ان کے ہاں رنگنے کا کام بھی ہوتا تھا۔ یہ کام کرنے کے بعد اس نے واپس آ کر فلموں کی کتابیں پڑھیں جن میں اس کے دیکھے ہوئے فلموں کی کہانی اور گیت چھپے ہوتے تھے۔ یہ کتابیں پڑھتے ہوئے وہ سو گئی، جب اٹھی تو چار بج چکے تھے کیونکہ دھوپ آنگن میں سے موری کے پاس پہنچ چکی تھی۔ نہا دھو کر فارغ

ہوتی تو گرم چادر اوڑھ کر بالکونی میں آکھڑی ہوتی، قریباً ایک گھنٹہ بالکونی میں آکھڑی رہی، اب شام ہوگئی۔ اب بتیاں روشن ہو رہی تھیں، نیچے سڑک میں رونق کے آثار نظر آنے لگے۔ سردی میں تھوڑی سی شدت ہوگئی تھی۔ مگر سلطانہ کو یہ ناگوار معلوم نہ ہوئی وہ سڑک پر آتے جاتے گاہکوں اور موٹروں کی طرف عرصہ سے دیکھ رہی تھی۔ دفعتاً اُسے شنکر نظر آیا مکان کے نیچے پہنچ کر اُس نے گردن اُونچی کی اور سلطانہ کی طرف دیکھ مسکرایا سُلطانہ نے غیر ارادی طور پر اشارہ کیا، اور اُسے اُوپر بلا لیا۔

جب شنکر اُوپر آگیا تو سلطانہ بہت پریشان ہوئی کہ اس سے کیا کہے۔ دراصل اُس نے آتے ہی بلا سوچے سمجھے اُسے اشارہ کر دیا تھا شنکر بے حد مطمئن تھا۔ جیسے اُس کا اپنا گھر ہے۔ چنانچہ بڑی بے تکلفی سے پہلے روز کی طرح وہ گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا جب سلطانہ نے دیر تک اُس سے کوئی بات نہ کی تو اُس نے کہا تم مجھے سو دفعہ بلا سکتی ہو اور سو دفعہ ہی کہہ سکتی ہو کہ چلے جاؤ ——— میں ایسی باتوں پر کبھی ناراض نہیں ہوا کرتا۔

سلطانہ کشمکش و پیچ میں گرفتار ہوگئی، کہنے لگی، نہیں بیٹھو، تمہیں جانے کو کون کہتا ہے۔

"شنکر اس پر مسکرا دیا۔ تو میری شرطیں تمہیں منظور ہیں"۔

"کیسی شرطیں؟ سُلطانہ نے ہنس کر کہا۔ کیا نکاح کر رہے ہو مجھ سے؟"

"نکاح اور شادی کیسی؟ ——— نہ تم عمر بھر کسی سے شادی کرو گی نہ میں" یہ رسمیں ہم لوگوں کے لئے نہیں ——— چھوڑو ان فضولیات کو ——— کوئی کام کی بات کرو۔

بولو، کیا بات کروں۔؟

"تم عورت ہو —— کوئی ایسی بات شروع کرو جس سے دو گھڑی دل بہل جائے۔ اس دنیا میں صرف دوکانداری ہی دوکانداری نہیں، اور بھی کچھ ہے"

سلطانہ ذہنی طور پر اب تننکر کو قبول کر چکی تھی —— کہنے لگی، صاف صاف کہو تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔

"جو دوسرے چاہتے ہیں" اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تم میں اور دوسروں میں پھر فرق ہی کیا رہا"

تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں، اُن میں اور مجھ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایسی بہت سی باتیں ہوتی ہیں جو پوچھنا نہیں چاہئیں۔ خود ہی سمجھنا چاہئیں۔

سلطانہ نے تھوڑی دیر تک تننکر کی اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی پھر کہا۔

"میں سمجھ گئی ہوں"

"تو کہو، کیا ارادہ ہے۔"

تننکر اٹھ کھڑا ہوا اور ہنسنے لگا: میرا نام تننکر ہے —— یہ نام بھی عجیب اُوٹ پٹانگ ہوتے ہیں، چلو آؤ اندر چلیں۔

تننکر اور سلطانہ دری والے کمرے میں واپس آئے تو دونوں ہنس رہے تھے نہ جانے کس بات پر، جب تننکر جانے لگا تو سلطانہ نے کہا "تننکر میری ایک بات مانو گے؟"

تننکر نے جواباً کہا "پہلے بات بتاؤ۔"

سلطانہ کچھ جھینپ سی گئی "تم کہو گے کہ میں دام وصول کرنا چاہتی ہوں مگر..."

"کہو کہو ـــــ رُک کیوں گئی ہو؟"

سُلطانہ نے جرأت سے کام لے کر کہا "بات یہ ہے کہ محرم آ رہا ہے اور میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں کالی شلوار بنا سکوں ـــــ یہاں کے سارے دکھڑے تو تم مجھ سے سُن ہی چکے ہو، قمیص اور دوپٹہ میرے پاس موجود تھا۔ جو میں نے آج رنگوانے کے لئے دے دیا ہے۔"

شنکر نے یہ سُن کر، "تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں کچھ پیسے دیدوں۔ جو تم یہ کالی شلوار بنوا سکو۔"

سُلطانہ نے فوراً ہی کہا "نہیں میرا مطلب یہ ہے کہ اگر ہو سکے تو تم مجھے ایک کالی شلوار لا دو۔"

شنکر مسکرایا۔ میری جیب میں اتفاق ہی سے کچھ ہوتا ہے۔ بہرحال میں کوشش کروں گا محرم کی پہلی تاریخ کو تمہیں یہ شلوار مل جائے گی۔ بس اب خوش ہو گئیں سلطانہ کے بُندوں کی طرف دیکھ کر شنکر نے پوچھا کہ بُندے تم مجھے دے سکتی ہو۔"

سُلطانہ نے ہنس کر کہا "تم انہیں کیا کرو گے۔ چاندی کے معمولی بُندے ہیں زیادہ سے زیادہ پانچ روپے کے ہوں گے۔

اس پر شنکر نے کہا "میں نے تم سے بُندے مانگے ہیں ان کی قیمت نہیں پوچھی بولو، دیتی ہو؟"

"لے لو" یہ کہہ کر سُلطانہ نے بُندے اُتار کر شنکر کو دے دیئے۔ اس کے بعد افسوس ہوا مگر شنکر جا چکا تھا۔"

سُلطانہ کو قطعاً یقین نہیں تھا کہ شنکر اپنا وعدہ پورا کرے گا مگر آٹھ روز کے بعد

محرم کی پہلی تاریخ کو صبح نو بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ سلطانہ نے دروازہ کھولا تو شنکر کھڑا تھا۔ اخبار میں لپٹی ہوئی چیز اس نے سلطانہ کو دے دی اور کہا "ساٹن کی شلوار ہے ——— دیکھ لینا، شاید لمبی ہو، اب میں چلتا ہوں۔"

شنکر شلوار دے کر چلا گیا اور کوئی بات اس نے سلطانہ سے نہ کی۔ اس کی پتلون میں شکنیں پڑی ہوئی تھیں اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی سو کر اُٹھا ہے۔ اور سیدھا ادھر ہی چلا آیا ہے۔

سلطانہ نے کاغذ کھولا۔ ساٹن کی شلوار تھی، ایسی ہی جیسی کہ وہ انوری کے پاس دیکھ کر آئی تھی۔ سلطانہ بہت خوش ہوئی، بندوں کا اور اس سودے کا جو اسے افسوس ہوا تھا۔ اس شلوار نے اور شنکر کی وعدہ ایفائی نے دور کر دیا۔

دوپہر کو وہ نیچے لانڈری والے سے اپنی رنگی ہوئی قمیض اور دوپٹہ لے کر آئی۔ تینوں کالے کپڑے جب اس نے پہن لئے تو دروازہ پر دستک ہوئی۔ سلطانہ نے دروازہ کھولا تو انوری اندر داخل ہوئی۔ اس نے سلطانہ کے تینوں کپڑوں کی طرف دیکھا اور کہا "قمیض اور دوپٹہ تو رنگا ہوا ہے پر یہ شلوار نئی ہے۔ کب بنوائی؟"

سلطانہ نے جواب دیا "آج ہی درزی لایا ہے۔ یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں انوری کے کانوں پر پڑیں، یہ بندے تم نے کہاں سے لئے۔؟"

"انوری نے جواب دیا "آج ہی منگوائے ہیں۔"

اس کے بعد دونوں کو تھوڑی دیر تک خاموش رہنا پڑا۔

دھواں

وہ جب اسکول کی طرف روانہ ہوا تو اُس نے راستے میں ایک قصائی دیکھا جس کے سر پر ایک بہت بڑا ٹوکرا تھا۔ اس ٹوکرے میں دو تازہ ذبح کئے ہوئے بکرے تھے۔ کھالیں اُتری ہوئی تھیں اور اُن کے ننگے گوشت میں سے دھُواں اُٹھ رہا تھا جگہ جگہ پر یہ گوشت جس کو دیکھ کر مسعود کے ٹھنڈے گالوں پر گرمی کی لہریں سی دوڑ جاتی تھیں پھڑک رہا تھا۔ جیسے کبھی کبھی اس کی آنکھ پھڑکا کرتی تھی۔

اس وقت سوا نو بجے ہوں گے مگر جھکے ہوئے خاکستری بادلوں کے باعث ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت سویرا ہے۔ سردی میں شدت نہیں تھی لیکن راہ چلتے آدمیوں کے منہ سے گرم گرم سماوروں کی ٹونٹیوں کی طرح گاڑھا سفید دھواں نکل رہا تھا۔ ہر شے بوجھل دکھائی دیتی تھی جیسے بادلوں کے وزن کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ موسم کچھ ایسی ہی کیفیت کا حامل تھا۔ جو ربڑ کے جوتے پہن کر چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے باوجود کہ بازاروں میں لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی اور دکانوں میں زندگی کے آثار پیدا ہو

چکے تھے۔ آوازیں مدھم تھیں۔ جیسے سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔ کہ اُونچی آواز پیدا نہ ہو۔
مسعود بغل میں بستہ دباتے اسکول جا رہا تھا۔ آج اس کی چال بھی سست تھی۔ جب اُس نے بے کھال کے تازہ ذبح کئے ہوئے بکروں کے گوشت سے سفید سفید دھوآں اٹھتا دیکھا تو اُسے راحت محسوس ہوئی۔ اس دھوئیں نے اس کے ٹھنڈے گالوں پر گرم گرم لکیروں کا ایک جال سا بُن دیا۔ اس گرمی نے اُسے راحت پہنچائی اور وہ سوچنے لگا کہ سردیوں میں ٹھنڈے یخ ہاتھوں پر بید کھانے کے بعد اگر یہ دھوآں مل جایا کرے تو کتنا اچھا ہو۔

فضا میں اُجلا پن نہیں تھا۔ روشنی تھی مگر دھندلی کہر کی ایک پتلی سی تہہ ہر شے پر چڑھی ہوئی تھی جس سے فضا میں گدلا پن پیدا ہو گیا تھا۔ یہ گدلا پن آنکھوں کو اچھا معلوم ہوتا تھا اس لئے کہ نظر آنے والی چیزوں کی نوک پلک کچھ مدھم پڑ گئی تھی۔

مسعود جب اسکول پہنچا تو اُسے اپنے ساتھیوں سے یہ معلوم کر کے قطعی طور پر خوشی نہ ہوئی کہ اسکول سکتر صاحب کی موت کے باعث بند کر دیا گیا ہے۔ سب لڑکے خوش تھے کہ جس کا ثبوت یہ تھا کہ وہ اپنے بستے ایک جگہ رکھ کر اسکول کے صحن میں اوٹ پٹانگ کھیلوں میں مشغول تھے۔ کچھ چھٹی کا پتہ معلوم کرتے ہی گھر چلے گئے۔ کچھ آ رہے تھے۔ کچھ نوٹس بورڈ کے پاس جمع تھے اور بار بار ایک ہی عبارت پڑھ رہے تھے۔ مسعود نے جب سُنا کہ سکتر صاحب مر گئے ہیں تو اُسے بالکل افسوس نہ ہوا اس کا دل جذبات سے بالکل خالی تھا۔ البتہ اُس نے یہ ضرور سوچا کہ پچھلے برس جب اس کے دادا جان کا انتقال ان ہی دنوں میں ہوا تھا تو اُن کا جنازہ لے جانے میں بڑی دقت ہوئی تھی۔ اس لئے کہ بارش شروع ہو گئی تھی اور جنازے کے ساتھ گیا تھا اور قبرستان

میں چکنی کیچڑ کے باعث ایسا پھسلا تھا کہ کھدی ہوئی قبر میں گرتے گرتے بچا تھا۔ یہ سب باتیں اُس کو اچھی طرح یاد تھیں۔ سردی کی شدت، اس کے کیچڑ سے لت پت کپڑے، سُرخی مائل نیلے ہاتھ جن کو دبانے سے سفید سفید دھبّے پڑ جاتے تھے۔ ناک جو کہ برف کی ڈلی معلوم ہوتی تھی اور پھر آ کر ہاتھ پاؤں دھونے اور کپڑے بدلنے کا مرحلہ یہ سب کچھ اس کو اچھی طرح یاد تھا۔ جب اُس نے سکتر صاحب کی موت کی خبر سُنی تو اُسے یہ بیتی ہوئی باتیں یاد آگئیں اور اُس نے سوچا جب سکتر صاحب کا جنازہ اُٹھے گا تو بارش شروع ہو جائے گی اور قبرستان میں اتنی کیچڑ ہو جائے گی کہ کئی لوگ پھسلیں گے اور اُن کو ایسی چوٹیں آئیں گی کہ بلبلا اُٹھیں گے۔

مسعود نے یہ خبر سُن کر سیدھا اپنے کمرے کا رُخ کیا۔ کمرے میں پہنچ کر اُس نے اپنے ڈسک کا تالا کھولا۔ دو تین کتابیں جو کہ اُسے دوسرے روز لانا تھیں اس میں رکھیں، اور باقی بستہ اٹھا کر گھر کی جانب چل پڑا۔

راستے میں پھر اُس نے دو تازہ ذبح کئے ہوئے بکرے دیکھے۔ اُن میں سے ایک کو قصائی نے لٹکا دیا تھا۔ دُوسرا تختے پر پڑا تھا۔ جب مسعود دکان پر سے گزرا تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ گوشت کو جس میں سے دھُواں اُٹھ رہا تھا چھُو کر دیکھے۔ چنانچہ آگے بڑھ کر اُس نے اُنگلی سے بکرے کے اس حصّہ کو چھُو کر دیکھا جو ابھی تک پھڑک رہا تھا۔ گوشت گرم تھا مسعود کی ٹھنڈی اُنگلی کو یہ حرارت بہت بھلی معلوم ہوئی قصائی دکان کے اندر چھریاں تیز کرنے میں مصروف تھا چنانچہ مسعود نے ایک بار پھر گوشت کو چھُو کر دیکھا اور وہاں سے چل پڑا۔

گھر پہنچ کر جب اس نے اپنی اماں کو سکتر صاحب کی موت کی خبر سُنائی تو

اُسے معلوم ہوتا کہ اس کے ابا جی اُن ہی کے جنازے کے ساتھ گئے ہیں۔ اب گھر میں صرف دو آدمی تھے۔ ماں اور بڑی بہن۔ ماں باورچی خانہ میں بیٹھی سالن پکا رہی تھی اور بڑی بہن کلثوم پاس ہی ایک کاٹھ گڑی لئے درباری کی سرگم یاد کر رہی تھی۔

کیونکہ گلی کے دوسرے لڑکے گورنمنٹ اسکول میں پڑھتے تھے۔ جس پر اسلامیہ سکول کے سکتر کی موت کا کچھ اثر نہیں پڑا تھا۔ اس لئے مسعود نے خود کو بالکل بیکار محسوس کیا۔ اسکول کا کوئی کام بھی نہیں تھا۔ چھٹی جماعت میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ گھر میں اپنے اباجی سے پڑھ چکا تھا۔ کھیلنے کے لئے بھی اس کے پاس کوئی چیز نہ تھی۔ ایک میلا کچیلا تاش طاق میں پڑا تھا مگر اس سے مسعود کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ لُوڈو، اور اسی قسم کے دوسرے کھیل جو اس کی بڑی بہن اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہر روز کھیلتی تھی۔ اس کی سمجھ سے بالاتر تھے۔ سمجھ سے بالاتر یوں تھے کہ مسعود نے کبھی اُن کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی اس کو فطرتاً ایسے کھیلوں سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔

بستہ اپنی جگہ پر رکھنے اور کوٹ اتارنے کے بعد وہ باورچی خانے میں اپنی ماں کے پاس بیٹھ گیا۔ اور درباری کی سرگم سنتا رہا جس میں کئی دفعہ سارے گاما آتا تھا۔ اسکی ماں پالک کاٹ رہی تھی۔ پالک کاٹنے کے بعد اس نے سبز سبز پتّوں کا گیلا گیلا ڈھیر اٹھا کر ہنڈیا میں ڈال دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب پالک کو آنچ لگی تو اُس میں سے سفید سفید دھواں اُٹھنے لگا۔ اس دھوئیں کو دیکھ کر مسعود کو بکرے کا گوشت یاد آگیا۔ چنانچہ اُس نے اپنی اماں سے کہا۔ امی جان آج میں نے قصائی کی دکان پر دو بکرے دیکھے کھال اُتری ہوئی تھی اور اُن میں سے دھواں اُٹھ رہا تھا بالکل ایسے ہی جیسا کہ صبح سویرے منہ سے نکلا کرتا ہے۔“

"اچھا! یہ کہہ کر اس کی ماں چولھے میں لکڑیوں کے کوئلے جھاڑنے لگی۔

"ہاں اور میں نے گوشت کو انگلی سے چھو کر دیکھا۔ تو وہ گرم تھا۔

"اچھا۔! یہ کہکر اس کی ماں نے وہ برتن اُٹھایا جس میں اُس نے پالک کا ساگ دھویا تھا۔ اور باورچی خانے سے باہر چلی گئی۔

"اور یہ گوشت کئی جگہ پر پھڑکتا بھی تھا"

"اچھا" مسعود کی بڑی بہن نے درباری سرگم یاد کرنا چھوڑ دی اور اس کی طرف متوجہ ہوئی" کیسے پھڑکتا تھا۔؟

"یوں ——— یوں" مسعود نے انگلیوں سے پھڑکن پیدا کر کے اپنی بہن کو دکھائی"

"تو پھر کیا ہوا؟"

یہ سوال کلثوم نے اپنے سرگم بھرے دماغ سے کچھ اس طور پر نکالا کہ مسعود ایک لمحے کے لئے بالکل خالی الذہن ہو گیا۔

"پھر کیا ہونا تھا۔ میں نے ایسے ہی آپ سے بات کی تھی کہ قصائی کی دکان پر گوشت پھڑک رہا تھا۔ میں نے انگلی سے چھو کر بھی دیکھا تھا۔ گرم تھا۔

"گرم تھا ——— اچھا مسعود یہ بتاؤ کہ تم میرا ایک کام کرو گے۔

"بتایئے"

"آؤ میرے ساتھ آؤ"

"نہیں آپ پہلے بتایئے، کام کیا ہے"؟

"تم آؤ تو سہی میرے ساتھ"

"جی نہیں ـــــــ آپ پہلے کام بتایئے۔

"دیکھو، میری کمر میں بڑا درد ہو رہا ہے۔ میں پلنگ پر لیٹتی ہوں، تم ذرا پاؤں سے دبا دینا ـــــــ اچھے بھائی جو ہوتے اللہ کی قسم بڑا درد ہو رہا ہے یہ کہہ کر مسعود کی بہن نے اپنی کمر پر مکیاں مارنی شروع کر دیں۔

"یہ آپ کی کمر کو کیا ہوتا جاتا ہے۔ جب دیکھو درد ہو رہا ہے اور پھر دبواتی بھی مجھ ہی سے ہیں۔ کیوں نہیں اپنی سہیلیوں سے کہتیں۔ مسعود اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلیے، لیکن یہ کہے دیتا ہوں کہ دس منٹ سے زیادہ میں بالکل نہیں دباؤں گا۔

"شاباش، شاباش" اس کی بہن اٹھ کھڑی ہوئی اور سرگموں کی کاپی طاق میں رکھ کر اس کمرے کی طرف روانہ ہوگئی۔ جہاں وہ اور مسعود دونوں سوتے تھے۔

صحن میں پہنچ کر اس نے اپنی دکھتی ہوئی کمر سیدھی کی اور اوپر آسمان کی طرف دیکھا مٹیالے بادل جھکے ہوئے تھے۔ "مسعود آج ضرور بارش ہوگی" یہ کہہ اس نے مسعود کی طرف دیکھا۔ مگر وہ اندر چارپائی پر لیٹا تھا۔

جب کلثوم اپنے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹ گئی تو مسعود نے اٹھ کر گھڑی میں وقت دیکھا۔ دیکھئے باجی گیارہ بجنے میں دس منٹ باقی ہیں۔ میں پورے گیارہ بجے آپ کی کمر دبانا چھوڑ دوں گا۔

"بہت اچھا، لیکن تم اب خدا کے لئے زیادہ نخرے نہ بگھارو، ادھر میرے پلنگ پر آ کر جلدی کمر دباؤ۔ ورنہ یاد رکھو، بڑے زور سے کان اینٹھوں گی۔" کلثوم نے مسعود کو ڈانٹ پلائی۔ مسعود نے اپنی بڑی بہن کے حکم کی تعمیل کی اور دیوار کا سہارا لے کر پاؤں سے اس کی کمر دبانا شروع کر دی۔ مسعود کے وزن کے نیچے کلثوم کی چوڑی چکلی کمر میں

خفیف سا جھکاؤ پیدا ہو گیا۔ جب اس نے پیروں سے دبانا شروع کیا، ٹھیک اسی طرح جس طرح مزدور مٹی گوندھتے ہیں تو کلثوم نے مزا لینے کی خاطر ہولے ہولے ہائے ہائے کرنا شروع کیا۔

کلثوم کے کولھوں پر گوشت زیادہ تھا۔ جب مسعود کا پاؤں اس حصّے پر پڑا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس بکرے کے گوشت کو دبا رہا ہے جو اس نے قصائی کی دکان میں اپنی انگلیوں سے چھو کر دیکھا تھا۔ اس احساس نے چند لمحات کے لئے اس کے دل و دماغ میں ایسے خیالات پیدا کئے جن کا کوئی سر تھا نہ پیر، وہ ان کا مطلب نہ سمجھ سکا اور سمجھتا بھی کیسے جب کہ کوئی خیال مکمل نہ تھا۔

ایک دو بار مسعود نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کے پیروں کے نیچے گوشت کے لوتھڑوں میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ اس قسم کی حرکت جو اس نے بکرے کے گرم گرم گوشت میں دیکھی تھی اس نے بڑی بد دلی سے کمر دبانا شروع کی تھی۔ مگر اب اسے اس کام میں لذت محسوس ہونے لگی۔ اس کے وزن کے نیچے کلثوم ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ یہ بھینچی بھینچی آواز جو کہ مسعود کے پیروں کی حرکت کا ساتھ دے رہی تھی اس گمنام سی لذت میں اضافہ کر رہی تھی۔

ٹائم پیس میں گیارہ بج گئے مگر مسعود اپنی بہن کی کمر دباتا رہا۔ جب کمر اچھی طرح دبائی جا چکی تو کلثوم سیدھی ہو گئی اور کہنے لگی، شاباش مسعود شاباش۔ لو اب لگے ہاتھوں ٹانگیں بھی دبا دو۔ بالکل اسی طرح ——— شاباش میرے بھائی!

مسعود نے دیوار کا سہارا لے کر کلثوم کی رانوں پر جب اپنا پورا وزن ڈالا۔ تو اس کے پاؤں کے نیچے مچھلیاں سی تڑپ گئیں بے اختیار وہ ہنس پڑی اور دوہری

ہو گئی۔ مسعود گرتے گرتے بچا۔ لیکن اس کے پاؤں کی تلیوں میں مچھلیوں کی وہ تڑپ منجمد سی ہو گئی اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ پھر اسی طرح دیوار کا سہارا لے کر اپنی بہن کی رانیں دباتے۔ چنانچہ اس نے کہا: "یہ آپ نے ہنسنا کیوں شروع کر دیا۔ سیدھی لیٹ جائیے۔ میں آپ کی ٹانگیں دبا دوں۔"

کلثوم سیدھی لیٹ گئی۔ رانوں کی مچھلیاں اِدھر اُدھر ہونے کے باعث جو گدگدی پیدا ہوئی تھی اُس کا اثر ابھی تک اس کے جسم میں باقی تھا۔ "نا بھائی میرے گدگدی ہوتی ہے۔ تم اوٹ پٹانگ طریقے سے دباتے ہو۔"

مسعود نے خیال کیا کہ شاید اس نے غلط طریقہ استعمال کیا ہے۔ "نہیں، اب کی دفعہ میں پورا بوجھ آپ پر نہیں ڈالوں گا ــــــ آپ اطمینان رکھئے۔ اب ایسی اچھی طرح دباؤں گا کہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو گی۔"

دیوار کا سہارا لے کر مسعود نے اپنے جسم کو تولا اور اس انداز سے آہستہ آہستہ کلثوم کی رانوں پر پیر جماتے کہ اُس کا آدھا بوجھ کہیں غائب ہو گیا۔ ہولے ہولے بڑی ہوشیاری سے اُس نے اپنے پیر چلانے شروع کئے کہ کلثوم کی رانوں میں اکڑی ہوئی مچھلیاں اُس کے پیروں کے نیچے دَب دَب کر اِدھر اُدھر پھسلنے لگیں مسعود نے ایک بار اسکول میں تنے ہوتے رسے پر ایک بازیگر کو چلتے دیکھا تھا۔ اس نے سوچا کہ بازیگر کے پیروں کے نیچے تنا ہوا رسّا اسی طرح پھسلتا ہو گا۔

اس سے پہلے کتنی بار اس نے اپنی بہن کلثوم کی ٹانگیں دبائی تھیں مگر وہ لذت جو اب اسے محسوس ہو رہی تھی پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ بکرے کے گرم گرم گوشت کا اسے بار بار خیال آتا تھا۔ ایک دو مرتبہ اس نے سوچا کہ کلثوم کو اگر ذبح کر دیا جائے

تو کھال اُتر جانے پر کیا اس کے گوشت میں سے بھی دھواں نکلے گا۔؟ لیکن ایسی بیہودہ باتیں سوچنے پر اس نے اپنے آپ کو مجرم محسوس کیا اور دماغ کو اس طرح صاف کر دیا کہ جیسے وہ سلیٹ کو اسفنج سے صاف کیا کرتا تھا۔

”بس بس“ کلثوم تھک گئی۔ ”بس بس“

مسعود کو ایک دم شرارت سوجھی، وہ پلنگ پر سے نیچے اُترنے لگا تو کلثوم کی دونوں بغلوں میں گدگدی کرنا شروع کر دی۔ ہنسی کے مارے وہ لوٹ پوٹ ہو گئی اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ مسعود کے ہاتھوں کو پرے جھٹک دے لیکن جب اُس نے ارادہ کر کے لات جمانی چاہی تو مسعود اچھل کر زد سے باہر ہو گیا اور سلیپر پہن کر کمرے سے نکل گیا۔

جب وہ صحن میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہے بادل اور بھی جھک آتے تھے۔ پانی کے ننھے ننھے قطرے آواز پیدا کئے بغیر صحن کی اینٹوں میں آہستہ آہستہ جذب ہو رہے تھے مسعود کا جسم ایک دل نواز حرارت محسوس کر رہا تھا جب ہوا کا ٹھنڈا ٹھنڈا جھونکا اُس کے گالوں کے ساتھ مس ہوا اور دو تین ننھی ننھی بوندیں اُس کی نازک گردن پر پڑیں تو ایک جھرجھری سی اُس کے بدن میں لہرا اُٹھی۔ سامنے کوٹھے کی دیوار پر ایک کبوتر اور ایک کبوتری پاس پاس پَر پُھلائے بیٹھے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں دم پخت کی ہوئی ہنڈیا کی طرح گرم ہیں، گل داؤدی اور ناز بو کے ہرے ہرے پتے اُوپر لال گملوں میں نہا رہے تھے فضا میں نیندیں گھلی ہوئی تھیں ایسی نیندیں جن میں بیداری زیادہ ہوتی ہے اور انسان کے ارد گرد نرم نرم خواب یوں لپٹ جاتے ہیں، جیسے اُونی کپڑے۔

مسعود ایسی باتیں سوچنے لگا۔ جن کا مطلب اُن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا پھر بھی ایک گمنام سا مزہ اس سوچ وچار میں اُسے آرہا تھا۔

بارش میں کچھ دیر کھڑے رہنے کے باعث جب مسعود کے ہاتھ بالکل یخ ہو گئے اور دبانے سے اُن پر سفید دھبے پڑنے لگے تو اُس نے مٹھیاں کس لیں اور اُن کو منہ کی بھاپ سے گرم کرنا شروع کیا۔ ہاتھوں کو اس عمل سے کچھ گرمی تو پہنچی مگر وہ نم آلود ہو گئے۔ چنانچہ آگ تاپنے کے لیے وہ باورچی خانہ میں چلا گیا۔ کھانا تیار تھا۔ ابھی اُس نے پہلا ہی لقمہ اٹھایا تھا کہ اس کا باپ قبرستان سے واپس آگیا۔ باپ بیٹے میں کوئی بات نہ ہوئی۔ مسعود کی ماں فوراً اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اور وہاں دیر تک اپنے خاوند کے ساتھ باتیں کرتی رہی۔

کھانے سے فارغ ہو کر مسعود بیٹھک میں چلا گیا اور کھڑکی کھول کر فرش پر لیٹ گیا۔ بارش کی وجہ سے سردی کی شدت بڑھ گئی تھی۔ کیونکہ اب ہوا بھی چل رہی تھی۔ مگر یہ سردی ناخوشگوار معلوم نہیں ہوتی تھی۔ تالاب کے پانی کی طرح یہ اوپر ٹھنڈی اور اندر گرم تھی۔ مسعود جب فرش پر لیٹا تو اُس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اس سردی کے اندر دھنس جائے۔ جہاں اس کے جسم کو راحت انگیز گرمی پہنچے۔ دیر تک وہ ایسی ہی گرم باتوں کے متعلق سوچتا رہا۔ جس کے باعث اس کے پٹھوں میں ہلکی ہلکی سی دکھن پیدا ہو گئی اور ایک دو بار اُس نے انگڑائی لی اور اسے مزہ آیا۔ اُس کے جسم کے کسی حصہ میں، یہ اس کو معلوم نہیں تھا کہ کہاں، کوئی چیز اٹک سی گئی تھی۔ یہ چیز کیا تھی اس کے متعلق بھی مسعود کو کچھ علم نہ تھا۔ البتہ اس اٹکاؤ نے اس کے سارے جسم میں اضطراب، ایک دبے ہوئے اضطراب کی کیفیت پیدا کر دی تھی اس کا سارا جسم

کھنچ کر لمبا ہو جانے کا ارادہ بن گیا تھا۔

دیر تک گدگدے قالین پر کروٹیں بدلنے کے بعد وہ اُٹھا اور باورچی خانہ سے ہوتا ہوا صحن میں آنکلا۔ نہ کوئی باورچی خانہ میں تھا نہ صحن میں، ادھر ادھر جتنے کمرے تھے سب کے سب بند تھے۔ بارش اب رُک گئی تھی۔ مسعود نے ہاکی اور گیند نکالی اور صحن میں کھیلنا شروع کر دیا۔ ایک بار جب اُس نے زور سے ہٹ لگائی تو گیند صحن کے داہنے ہاتھ والے کمرے کے دروازے پر لگی۔ اندر سے مسعود کے باپ کی آواز آئی:" "کون؟"

"جی میں ہوں مسعود"

اندر سے آواز آئی:" کیا کر رہے ہو؟"

"جی کھیل رہا ہوں۔"

"کھیلو ——— پھر تھوڑے سے وقفے کے بعد اس کے باپ نے کہا۔ "تمہاری ماں میرا سر دبا رہی ہے شور نہ مچانا۔"

یہ سُن کر مسعود نے گیند وہیں پڑی رہنے دی اور ہاکی ہاتھ میں لئے سامنے والے کمرے کا رُخ کیا۔ اس کا ایک دروازہ بند تھا دوسرا نیم وا ——— مسعود کو ایک شرارت سوجھی دبے پاؤں وہ نیم وا دروازے کی طرف بڑھا اور دھماکے کے ساتھ دونوں پٹ کھول دیئے، دو چیخیں بلند ہوئیں اور کلثوم اور اس کی سہیلی بملا نے جو کہ پاس پاس بیٹھی تھیں۔ خوفزدہ ہو کر جھٹ سے لحاف اوڑھ لیا۔

بملا کے بلاؤز کے بٹن کھلے ہوتے تھے اور کلثوم اُس کے عُریاں سینے کو گھور رہی تھی۔

مسعود کچھ سمجھ نہ سکا۔ اُس کے دماغ میں دھواں سا چھا گیا۔ وہاں سے الٹے قدم لوٹ کر وہ جب بیٹھک کی طرف روانہ ہوا تو اُسے معاً اپنے اندر ایک اتھاہ طاقت کا احساس ہوا۔ جس نے کچھ دیر کے لئے اس کی سوچنے سمجھنے کی قوت بالکل کمزور کر دی۔ بیٹھک میں کھڑکی کے پاس جب مسعود نے ہاکی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر گھٹنے پر رکھا تو یہ سوچا کہ ہلکا سا دباؤ ڈالنے پر ہاکی میں خم پیدا ہو جائے گا اور زیادہ زور لگانے پر ہینڈل چٹاخ سے ٹوٹ جائے گا۔ اس کے گھٹنے پر ہاکی کے ہینڈل میں تو خم پیدا کر لیا مگر زیادہ زور لگانے پر بھی وہ ٹوٹ نہ سکا۔ دیر تک وہ ہاکی کے ساتھ کشتی لڑتا رہا جب وہ تھک ہار گیا تو جھنجھلا کر اِس نے ہاکی پرے پھینک دیا۔۔:

کبوتروں والا سائیں

پنجاب کے ایک سرد دیہات کے تکیے میں مائی جیواں صبح سویرے ایک غلاف چڑھی قبر کے پاس زمین کے اندر کھدے ہوئے گڑھے میں بڑے بڑے اپلوں سے آگ سلگا رہی تھی۔ صبح کے سرد اور مٹیالے دھندلکے میں جب وہ اپنی پانی بھری آنکھیں سکیڑ کر اور اپنی کمر کو دوہرا کر کے منہ کے قریب قریب زمین کے ساتھ لگا کر اوپر تلے رکھے ہوئے اپلوں کے اندر پھونک گھسیڑنے کی کوشش کرتی ہے تو زمین پر سے تھوڑی سی راکھ اڑتی ہے اور اس کے آدھے سفید اور آدھے کالے بالوں پر جو کہ گھسے ہوئے کمبل کا نمونہ پیش کرتے ہیں بیٹھ جاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بالوں میں تھوڑی سی سفیدی اور آ گئی ہے۔

اپلوں کے اندر آگ سلگتی ہے۔ اور یوں جو تھوڑی سی لال لال روشنی پیدا ہوتی ہے۔ مائی جیواں کے سیاہ چہرے پر جھریوں کو اور نمایاں کر دیتی ہے۔

مائی جیواں یہ آگ کتنی مرتبہ سلگا چکی ہے۔ یہ تکیہ یا چھوٹی سی خانقاہ جس کے

اندر بنی ہوئی قبر کی بابت اُس کے پردادا نے لوگوں کو یہ یقین دلایا تھا کہ وہ ایک بہت بڑے پیر کی آرام گاہ ہے۔ ایک زمانے سے اُن کے قبضہ میں تھی۔ گاما سائیں کے مرنے کے بعد اب اُس کی ہوشیار بیوی اس تکیے کی مجاور تھی۔ گاما سائیں سارے گاؤں میں ہر دل عزیز تھا۔ ذات کا وہ کمہار تھا۔ مگر چونکہ اس تکیے کی دیکھ بھال کرنی ہوتی تھی، اس لئے اُس نے برتن بنانے چھوڑ دیئے تھے لیکن اس کے ہاتھ کی بنائی ہوئی کونڈیاں اب بھی مشہور ہیں۔ بھنگ گھوٹنے کے لئے سال بھر میں چھ کونڈیاں بنایا کرتا تھا جن کے متعلق وہ بڑے فخر سے کہا کرتا تھا کہ چوہدری لوہا ہے لوہا — فولاد کی کونڈی ٹوٹ جائے پر گاما سائیں کی یہ کونڈی دادا لے تو اس کا پوتا بھی بھنگ گھوٹا کرے۔

مرنے سے پہلے گاما سائیں چھ کونڈیاں بنا کر رکھ گیا تھا۔ جو اب مائی جیواں بڑی احتیاط سے کام میں لاتی تھی۔

گاؤں کے اکثر بڈھے اور جوان تکیے میں جمع ہوتے تھے اور سردائی پیا کرتے تھے۔ گھوٹنے کے لئے گاما سائیں نہیں تھا پر اس کے بہت سے چیلے چانٹے جو اب سر اور بھویں منڈا کر سائیں بن گئے تھے اس کی بجائے بھنگ گھوٹا کرتے تھے اور مائی جیواں کی سلگائی ہوئی آگ سُلفہ پینے والوں کے کام آتی تھی۔

صبح اور شام تو خیر کافی رونق رہتی تھی مگر دوپہر کو آٹھ دس آدمی مائی جیواں کے پاس بیری کی چھاؤں میں بیٹھے ہی رہتے تھے۔ ادھر ادھر کونے میں لمبی لمبی بیل کے ساتھ ساتھ کئی گاہک تھے۔ جن میں گاما سائیں کے ایک بہت پرانے دوست اللو پہلوان نے سفید کبوتر پال رکھے تھے۔ تکیے کی دھوئیں بھری فضا میں اُن سفید اور چتکبرے

کبوتروں کی پھڑپھڑاہٹ بہت بھلی سی معلوم ہوتی تھی جس طرح تکیے میں آنے والے لوگ شکل وصورت میں معصومانہ حد تک بے عقل نظر آتے تھے۔ اسی طرح یہ کبوتر جن میں سے اکثر کے پیروں میں مائی جیواں کے بڑے لڑکے نے جھانجھر پہنا رکھے تھے بے عقل اور معصوم دکھائی دیتے تھے۔

مائی جیواں کے بڑے لڑکے کا اصلی نام عبدالغفار تھا۔ اس کی پیدائش کے وقت یہ نام شہر کے تھانیدار کا تھا، جو کبھی کبھی گھوڑی پر چڑھ کر موقع دیکھنے کے لیے گاؤں میں آیا کرتا تھا۔ اور گاماں سائیں کے ہاتھ کا بنا ہوا ایک پیالہ سردائی کا ضرور پیا کرتا تھا۔ لیکن اب وہ بات نہ رہی تھی جب وہ گیارہ برس کا تھا تو مائی جیواں اس کے نام میں تھانیداری کی بو سونگھ سکتی تھی۔ مگر جب اس نے بارھویں سال میں قدم رکھا تو اس کی حالت ہی بگڑ گئی۔ خاصا تگڑا جوان تھا پر نہ جانے کیا ہوا کہ بس ایک دو برس میں ہی سچ مچ کا سائیں بن گیا۔ یعنی ناک سے رینٹھ بہنے لگا۔ اور چپ چپ رہنے لگا۔ سر پہلے ہی چھوٹا تھا پر اب کچھ اور بھی چھوٹا ہو گیا اور منہ سے ہر وقت لعاب سا نکلنے لگا۔ پہلے پہل ماں کو اپنے بچے کی اس تبدیلی پر بہت صدمہ ہوا مگر جب اس نے دیکھا کہ اس کی ناک سے رینٹھ اور منہ سے لعاب بہتے ہی گاؤں کے لوگوں نے اس سے غیب کی باتیں پوچھنا شروع کر دی ہیں اور اس کی ہر جگہ خوب آؤ بھگت کی جاتی ہے تو اسے ڈھارس ہوئی کہ چلو یوں بھی تو کما ہی لے گا۔ کما نا دھانا کیا تھا۔ عبدالغفار جس کو اب کبوتروں والا سائیں کہتے تھے۔ گاؤں میں پھر پھرا کر آٹا، چاول اکٹھا کر لیا کرتا تھا۔ وہ بھی اسی لئے اس کی ماں نے اس کے گلے میں ایک جھولی لٹکا دی تھی۔ جس میں لوگ کچھ نہ کچھ ڈال دیا کرتے تھے کبوتروں

والا سائیں اُسے اس لئے کہا جاتا تھا کہ اُسے کبوتروں سے بہت پیار تھا۔ تکیئے میں جتنے کبوتر تھے اُن کی دیکھ بھال اُلّو پہلوان سے زیادہ یہی کیا کرتا تھا۔

اس وقت وہ سامنے کوٹھڑی میں ایک ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر اپنے باپ کا میلا کچیلا لحاف اوڑھے سو رہا تھا۔ باہر اُس کی ماں آگ سُلگا رہی تھی ——— !"

چونکہ سردیاں اپنے جوبن پر تھیں۔ اس لئے گاؤں ابھی تک رات اور صبح کے دھوئیں میں لپٹا ہوا تھا۔ یوں تو گاؤں میں سب لوگ بیدار تھے اور اپنے کام دھندوں میں مصروف تھے۔ مگر تکیہ جو کہ گاؤں کے کچھ فاصلہ پر تھا، ابھی تک آباد نہ ہوا تھا۔ البتہ دُور کونے میں مائی جیواں کی بکری ممیا رہی تھی۔

مائی جیواں آگ سُلگا کر بکری کے لئے چارہ تیار کرنے ہی لگی تھی کہ اُسے اپنے پیچھے آہٹ سنائی دی۔ مُڑ کر دیکھا تو اُسے ایک اجنبی سر پر ٹھاٹا اور موٹا سا کمبل اوڑھے نظر آیا۔ پگڑی کے ایک پلّو سے اس آدمی نے اپنا چہرہ آنکھوں تک چھپا رکھا تھا۔ جب اُس نے موٹی آواز میں "مائی جیواں السلام علیکم" کہا تو پگڑی کا کھُردرا کپڑا اس کے منہ پر تین چار مرتبہ سکڑا اور پھیلا۔

مائی جیواں نے چارہ بکری کے آگے رکھ دیا اور اجنبی کو پہچاننے کی کوشش کئے بغیر کہا "وعلیکم السلام" "آؤ بھائی بیٹھو۔ آگ تاپو۔"

مائی جیواں کمر پر ہاتھ رکھ کر اس گڑھے کی طرف بڑھی جہاں ہر روز آگ سلگتی رہتی تھی۔ اجنبی اور وہ دونوں پاس بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر ہاتھ تاپ کر اُس آدمی نے مائی جیواں سے کہا "ماں۔ اللہ بخشے گا ماسائیں مجھے باپ کی طرح چاہتا تھا۔ اس کے مرنے کی خبر ملی تو مجھے صدمہ ہوا۔ مجھے آسیب ہو گیا تھا۔ قبرستان کا جن ایسا چمٹا

تھا کہ اللہ کی پناہ گاما سائیں کے ایک ہی تعویذ سے یہ کالی بلا دور ہوگئی۔''

مائی جیواں خاموشی سے اجنبی کی باتیں سنتی رہی جو کہ اس کے شوہر کا بہت ہی معتقد نظر آتا تھا۔ اُس نے اِدھر اُدھر کی اور بہت سی باتیں کرنے کے بعد بڑھیا سے کہا۔ ''میں بارہ کوس سے چل کر آیا ہوں، ایک خاص بات کہنے کے لئے۔''

اجنبی نے رازداری کے انداز میں اپنے چاروں طرف دیکھا کہ اس کی بات کوئی اور تو نہیں سُن رہا اور بھنچے ہوئے لہجہ میں کہنے لگا۔ ''میں سُندر ڈاکو کے گروہ کا آدمی ہوں۔ پرسوں رات ہم لوگ اس گاؤں پر ڈاکہ مارنے والے ہیں، خون خرابہ ہوگا اس لئے میں یہ کہنے آیا ہوں کہ اپنے لڑکے کو دُور ہی رکھنا۔ میں نے سُنا ہے گاما سائیں مرحوم نے اپنے پیچھے دو لڑکے چھوڑے ہیں۔ جوان آدمیوں کا لہو ہے بابا! ایسا نہ ہو کہ جوش مار اُٹھے اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔ تم اُن کو پرسوں گاؤں سے کہیں باہر بھیج دو۔ تو ٹھیک رہے گا —— بس مجھے یہی کہنا تھا۔ میں نے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔

''السلام علیکم۔''

اجنبی اپنے ہاتھوں کو آگ کے الاؤ پر زور زور سے مل کر اٹھا اور جس راستے سے آیا تھا۔ اُسی راستے سے باہر چلا گیا۔

سُندر جاٹ بہت بڑا ڈاکو تھا اس کی دہشت اتنی تھی کہ مائیں اپنے بچّوں کو اُسی کا نام لے کر ڈرایا کرتی تھیں۔

بے شمار گیت اس کی بہادری اور بے باکی کے گاؤں کی جوان لڑکیوں کو یاد تھے۔ اُس کا نام سُن کر بہت سی کنواریوں کے دل دھڑکنے لگتے تھے۔ سُندر جاٹ کو بہت کم لوگوں نے دیکھا تھا مگر جب چوپال میں لوگ جمع ہوتے تھے تو ہر شخص اُس

سے اچانک ملاقات کے من گھڑت قصے سنانے میں ایک خاص لذت محسوس کرتا تھا
اس کے قدو قامت اور ڈیل ڈول کے بارے میں مختلف بیان تھے بعض کہتے تھے
کہ وہ بہت قدآور جوان ہے، بڑی بڑی مونچھوں والا۔ ان مونچھوں کے بالوں کے
متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ دو بڑے بڑے لیموں ان کی مدد سے اٹھا سکتا ہے۔ بعض
لوگوں کا یہ بیان تھا کہ اس کا قد معمولی ہے۔ مگر بدن اس قدر گٹھا ہوا ہے کہ گینڈے کا بھی
نہ ہوگا۔ بہر حال سب متفقہ طور پر اس کی طاقت اور بیباکی کے معترف تھے۔

جب مائی جیواں نے یہ سنا کہ سندر جاٹ ان کے گاؤں پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے
آرہا ہے تو اس کے آتے اوسان خطا ہو گئے اور وہ اس اجنبی کے سلام کا جواب
تک نہ دے سکی اور نہ اس کا شکریہ ہی ادا کر سکی۔ مائی جیواں کو اچھی طرح معلوم تھا
کہ سندر جاٹ کا ڈاکہ معنی رکھتا ہے۔ پچھلی دفعہ جب اس نے ساتھ والے گاؤں
پر حملہ کیا تھا۔ تو مکھی مہاجن کی ساری جمع کی ہوئی پونجی غائب ہو گئی تھی۔ اور گاؤں
کی سب سے سندر اور چنچل چھوکری ایسی گم ہوئی تھی کہ اب تک اس کا پتہ نہیں ملتا
تھا۔ یہ بلا اب ان کے گاؤں پر نازل ہونے والی تھی اور اس کا علم سوائے
مائی جیواں کے گاؤں کے کسی اور کو نہ تھا۔ مائی جیواں نے سوچا کہ وہ اس آنے
والے بھونچال کی خبر کس کس کو دے۔ چوہدری کے گھر خبر کر دے۔ لیکن نہیں
وہ تو بڑے کمینے لوگ تھے، پچھلے دنوں اس نے تھوڑا سا ساگ مانگا تھا۔ تو انہوں
نے انکار کر دیا تھا۔ گھسیٹا رام حلوائی کو متنبہ کر دے ——— نہیں وہ
بھی ٹھیک آدمی نہ تھا۔

وہ دیر تک ان ہی خیالات میں غرق رہی، گاؤں کے سارے آدمی وہ ایک

ایک کر کے اپنے دماغ میں لائی اور ان میں سے کسی ایک کو بھی اس نے مہربانی کے قابل نہ سمجھا۔ اس کے علاوہ اُس نے سوچا کہ اگر اس نے کسی کو ہمدردی کے طور پہ اس راز سے آگاہ کر دیا تو وہ کسی اور پہ مہربانی کرے گا۔ اور یوں تو سارے گاؤں والوں کو پتہ چل جائے گا۔ جس کا نتیجہ اچھا نہیں ہو گا۔ آخر میں وہ یہ فیصلہ کر کے اُٹھی کہ اپنی ساری جمع پونجی نکال کر وہ سبز رنگ کی غلاف چڑھی قبر کے سرہانے گاڑ دے گی اور رحمان کو پاس والے گاؤں میں بھیج دے گی۔

جب وہ سامنے والی کوٹھڑی کی طرف بڑھی تو دہلیز میں اُسے عبدالغفار یعنی کبوتروں والا سایئں کھڑا نظر آیا۔ ماں کو دیکھ کر وہ ہنسا۔ اس کی یہ ہنسی آج خلافِ معمول معنی خیز تھی۔ مائی جیواں کو اس کی آنکھوں میں سنجیدگی اور متانت کی جھلک بھی نظر آئی جو کہ ہوش مندی کی نشانی ہے۔

جب وہ کوٹھڑی کے اندر جانے لگی تو عبدالغفار نے پوچھا " ماں یہ صبح سویرے کون آدمی آیا تھا؟"

عبدالغفار اس قسم کے سوال عام طور پر پوچھا کرتا تھا اس لئے اس کی ماں جواب دیئے بغیر چلی گئی۔ اور اپنے چھوٹے لڑکے کو جگانے لگی۔ ارے رحمان اے رحمان اٹھ اٹھ۔

بازو جھنجھوڑ کر مائی جیواں نے اپنے چھوٹے لڑکے رحمان کو جگایا اور جب آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھا اور اچھی طرح ہوش آگیا تو اس کی ماں نے ساری بات سنا دی۔ رحمان کے اوسان خطا ہو گئے، وہ بہت ڈرپوک تھا۔ گو اس وقت اس کی عمر بائیس سال کی تھی۔ اور کافی طاقتور جوان تھا مگر اس میں ہمت اور شجاعت نام کو نہ تھی

سندر جاٹ! —— اتنا بڑا ڈاکو جس کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ تھوک پھینکتا تھا تو پورے بیس گز کے فاصلے پر جا کر گرتا تھا۔ پرسوں ڈاکہ ڈالنے اور لوٹ مار کرنے آ رہا تھا۔ وہ فوراً اپنی ماں کے مشورے پر راضی ہو گیا۔ بلکہ یوں کہیئے کہ وہ اسی وقت گاؤں چھوڑنے کی تیاریاں کرنے لگا۔

رحمان کو نیتی چمارن یعنی عنایت سے محبت تھی۔ جو کہ گاؤں کی ایک بے باک اور شوخ چنچل لڑکی تھی۔ گاؤں کے سب لڑکے شباب کی یہ پوٹلی حاصل کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ مگر وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ بڑے بڑے ہوشیار لڑکوں کو وہ باتوں باتوں میں اڑا دیتی تھی۔ چوہدری دین محمد کے لڑکے فضل دین کو کلائی پکڑنے میں کمال حاصل تھا۔ اس فن کے بڑے بڑے ماہر دُور دُور سے اس کو نیچا دکھانے کے لئے آتے تھے مگر اس کی کلائی کسی سے بھی نہ مڑی تھی وہ گاؤں میں اکڑ اکڑ کر چلتا تھا۔ مگر اس کی یہ ساری اکڑفوں نیتی نے ایک ہی دن میں غائب کر دی تھی۔ جب اُس نے دھان کے کھیت میں اس سے کہا:۔ "مجھے، اگنڈا سنگھ کی کلائی مروڑ کر تو اپنے من میں یہ مت سمجھ کہ بس اب تیرے مقابلے میں کوئی آدمی ہی نہیں رہا —— آ میرے سامنے بیٹھ میری کلائی پکڑ، ان دو انگلیوں کی ایک ہی ٹھمکی سے تیرے دونوں ہاتھ نہ اڑا دوں تو نیتی نام نہیں"۔

فضل دین اس کو محبت کی نگاہوں سے دیکھتا تھا اور اسے یقین تھا۔ کہ اس کی طاقت اور شہ زوری کے رعب اور دبدبے میں آ کر وہ خود بخود ایک روز رام ہو جائے گی۔ لیکن جب اس نے کئی آدمیوں کے سامنے اس کو مقابلے کی دعوت دی تو وہ پسینہ پسینہ ہو گیا۔ اگر وہ انکار کرتا ہے تو نیتی اور بھی سر چڑھ جاتی ہے

اور وہ اگر اس کی دعوت قبول کرتا ہے تو لوگ یہی کہیں گے۔ عورت ذات سے مقابلہ کرتے ہوئے شرم تو نہیں آتی مرد کو۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے چنانچہ اُس نے نیتی کی دعوت قبول کر لی تھی۔ اور جیسا کہ لوگوں کا بیان ہے اُس نے جب نیتی کی گدراتی ہوئی کلائی اپنے ہاتھوں میں لی تو وہ سارے کا سارا کانپ رہا تھا۔ نیتی کی موٹی موٹی آنکھیں اس کی آنکھوں میں دھنس گئیں۔ ایک نعرہ بلند ہوا اور نیتی کی کلائی فضل کی گرفت سے آزاد ہو گئی ——— اس دن سے لے کر اب تک فضل نے پھر کبھی کسی کی کلائی نہیں پکڑی"!

ہاں تو رحمان کو اس نیتی سے محبت تھی، جیساکہ وہ آپ ڈرپوک تھا۔ اسی طرح اس کا پریم بھی ڈرپوک تھا۔ دُور دُور سے دیکھ کر وہ اپنے دل کی ہوس پوری کیا کرتا تھا۔ اور جب کبھی اس کے پاس ہوتی تو اس کو اتنی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ چھوکرا جو درختوں کے تنوں کے ساتھ پیٹھ ٹیکے کھڑا رہتا ہے اس کے عشق میں گرفتار ہے۔ اس کے عشق میں کون گرفتار نہ تھا؟ سب اُس سے محبت کرتے تھے۔ اس قسم کی محبت جو کہ بیریوں کے بیر پکنے پر گاؤں کے جوان لڑکے اپنی رگوں کے تناؤ کے اندر محسوس کیا کرتے ہیں، مگر وہ ابھی تک کسی کی محبت میں گرفتار نہیں ہوئی تھی۔ محبت کرنے کی خواہش البتہ اس کے دل میں اس قدر موجود تھی کہ بالکل اس شرابی کے مانند معلوم ہوتی تھی جس کے متعلق ڈر رہا ہے کہ اب گرا اور اب گرا ——— وہ بے خبری کے عالم میں ایک بہت اُونچی چٹان پر پہنچ چکی تھی اور اب تمام گاؤں والے اس کی افتاد کے منتظر تھے جو کہ یقینی تھی ———"

رحمان کو بھی اس افتاد کا یقین تھا۔ مگر اس کا ڈرپوک دل ہمیشہ اسے ڈھارس دیا کرتا تھا کہ نہیں، نیتی آخر تیری ہی باندی بنے گی۔ اور وہ یوں خوش ہو جایا کرتا تھا۔ جب رحمان دس کوس طے کر کے دوسرے گاؤں میں پہنچنے کے لئے تیار ہو کر تکیے سے باہر نکلا تو اُسے راستے میں نیتی کا خیال آیا۔ مگر اس وقت اس نے یہ نہ سوچا کہ سندر جاٹ دھاوا بولنے والا ہے۔ وہ دراصل نیتی کے تصوّر میں اس قدر مگن تھا اور اکیلے میں اس کے ساتھ من ہی من میں اتنے زوروں سے محبت کر رہا تھا کہ اُسے کسی اور بات کا خیال ہی نہ آیا۔ البتہ جب وہ گاؤں سے پانچ کوس آگے نکل گیا تو ایکا ایکی اُس نے سوچا کہ نیتی کو بتا دینا چاہئے تھا کہ سندر جاٹ آ رہا ہے لیکن اب واپس کون جاتا۔

عبدالغفار ——— یعنی کبوتروں والا سائیں تکیے سے باہر نکلا۔ اس کے منہ سے لعاب نکل رہا تھا جو کہ میلے کُرتے پر گر کر دیر تک گلیسرین کی طرح چمکتا رہتا تھا۔ تکیے سے نکل کر سیدھا کھیتوں کا رُخ کیا کرتا تھا اور سارا دن وہیں گذار دیا کرتا تھا۔ شام کو جب ڈھور ڈنگر واپس گاؤں کو آتے تو اُن کے چلنے سے جو دھول اڑتی ہے اس کے پیچھے کبھی کبھی غفار کی شکل نظر آ جاتی تھی۔ گاؤں اُس کو پسند نہیں تھا اجاڑ اور سنسان جگہوں سے اُسے غیر محسوس طور پر محبت تھی یہاں بھی لوگ اس کا پیچھا نہ چھوڑتے تھے اور اس سے طرح طرح کے سوال پوچھتے تھے۔ جب برسات میں دیر ہو جاتی تو قریب قریب سب کسان اُس سے درخواست کرتے تھے کہ وہ پانی بھرے بادلوں کے لئے دُعا مانگے اور گاؤں کے عشق پیشہ جوان اس سے اپنے دل کا حال بیان کرتے اور پوچھتے کہ وہ کب

اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے۔ نوجوان چھوکریاں بھی چپکے چپکے دھڑکتے ہوتے دلوں سے اس کے سامنے اپنی محبّت کا اعتراف کرتی تھیں اور یہ جاننا چاہتی تھیں کہ ان کے "ماہیا" کا دل کیسا ہے۔ عبدالغفار ان سوالوں کو اوٹ پٹانگ جواب دیا کرتا تھا۔ اس لئے کہ اُسے غیب کی باتیں کہاں معلوم تھیں لیکن لوگ جو اُس کے پاس سوال لے کر آتے تھے اس کی بے ربط باتوں میں اپنا مطلب ڈھونڈ لیا کرتے تھے۔ عبدالغفار مختلف کھیتوں میں ہوتا ہوا اس کنوئیں کے پاس پہنچ گیا جو کہ ایک زمانے سے بیکار پڑا تھا۔ اس کنوئیں کی حالت بہت ابتر تھی اُس بوڑھے برگد کے پتے جو کہ سالہا سال سے اس کے پہلو میں کھڑا تھا اس قدر جمع ہو گئے تھے کہ اب پانی نظر ہی نہ آتا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت سی لکڑیوں نے مل کر پانی کی سطح پر موٹا سا جالا بُن دیا ہے۔ اس فضا میں اُس نے اپنے وجود سے اور بھی اُداسی پیدا کر دی۔

دفعتاً اُڑتی ہوئی چیلوں کی اُداس چیخوں کو عقب میں چھوڑتی ہوئی ایک بلند آواز اُٹھی اور بوڑھے برگد کی شاخوں میں ایک کپکپاہٹ سی دوڑ گئی۔

نیتی گا رہی تھی ؎

ماہیا مرے نے باغ لوایا — چمپا، مروا خواب کھلایا

اسیں نتے لوایاں کھٹیاں دے

راتیں سون نہیں دیندیاں اکھیاں وے

اس گیت کا مطلب یہ تھا کہ میرے ماہیا یعنی چاہنے والے نے ایک باغ لگایا ہے۔ اس میں ہر طرح کے پھول اُگاتے ہیں، چمپا، مروا وغیرہ کھلائی ہیں

اور ہم نے تو صرف نارنگیاں لگائی ہیں۔ رات کو آنکھیں سونے نہیں دیتیں، کتنی انکساری برتی گئی ہے۔ معشوق عاشق کے لگاتے ہوتے باغ کی تعریف کرتا ہے لیکن وہ اپنی جوانی کے باغ کی طرف نہایت انکسارانہ طور پر اشارہ کرتا ہے۔ جس میں حقیر نارنگیاں لگی ہیں اور پھر شب جوانی کا گلہ کس خوبی سے کیا گیا ہے۔

گو عبدالغفار میں جذباتِ نازک بالکل نہیں تھے ـــــ پھر بھی نیتی کی جوان آواز نے اس کو چونکا دیا۔ اور وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس نے پہچان لیا کہ یہ نیتی کی آواز ہے۔

نیتی گاتی کنوئیں کی طرف آنکلی۔ غفار کو دیکھ کر وہ دوڑی ہوئی اُس کے پاس آئی اور کہنے لگی:۔ اوہ غفار سائیں ـــــ تم ـــــ اوہ مجھے تم سے کتنی باتیں پوچھنا ہیں ـــــ اور اس وقت یہاں تمہارے اور میرے سوا اور کوئی بھی نہیں ـــــ دیکھو میں تمہارا منہ میٹھا کراؤں گی اگر تم نے میرے دل کی بات بوجھ لی اور ـــــ لیکن تم تو سب کچھ جانتے ہو ـــــ اللہ والوں سے کسی کے دل کا حال چھپا تھوڑی رہتا ہے۔

وہ اس کے پاس زمین پر بیٹھ گئی۔ اور اُس کے میلے کرتے پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ خلافِ معمول کبوتروں والا سائیں مسکرایا مگر نیتی اس کی طرف دیکھ نہیں رہی تھی اس کی نگاہیں گاڑھے کے تانے بانے پر بغیر کسی مطلب کے تیر رہی تھیں۔ کھردرے کپڑے پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے اس نے گردن اٹھائی اور آہوں میں کہنا شروع کیا غفار سائیں تم اللہ میاں سے محبت کرتے ہو اور میں ایک آدمی سے محبت کرتی ہوں۔ تم میرے دل کا حال سمجھو گے ـــــ! ـــــ اللہ میاں کی محبت اور اس کے بندے کی محبت ایک

جیسی تو ہو نہیں سکتی ـــــ ارے تم بولتے کیوں نہیں ـــــ کچھ تو بولو ـــــ کچھ کہو ـــــ اچھا تو میں ہی بولے جاؤں گی ـــــ تم نہیں جانتے کہ آج میں کتنی دیر بول سکتی ہوں ـــــ تم سنتے سنتے تھک جاؤ گے پر میں نہیں تھکوں گی۔

یہ کہتے کہتے وہ خاموش ہو گئی اور اس کی سنجیدگی زیادہ بڑھ گئی، اپنے من میں غوطہ لگانے کے بعد جب وہ ابھری تو اس نے ایکا ایکی عبدالغفار سے پوچھا۔ سائیں میں کب تھکوں گی؟"

عبدالغفار کے منہ سے لعاب نکلنا بند ہو گیا۔ اس نے کنوئیں کے اندر جھک کر کہا۔ دیکھتے ہوئے کہا بہت جلد"

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اس پر نینتی نے اس کے کرتے کا دامن پکڑ لیا اور گھبرا کر پوچھا۔ کب؟ ـــــ کب؟ ـــــ سائیں کب؟

عبدالغفار نے اس کا جواب نہ دیا۔ اور ببول کے جھنڈ کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ نینتی کچھ دیر کنوئیں کے پاس سوچتی رہی۔ پھر تیز قدموں سے جدھر سائیں گیا تھا اُدھر چل دی۔

وہ رات جس میں سُندر جاٹ گاؤں پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے آ رہا تھا۔ مائی جیواں نے آنکھوں میں کاٹی۔ ساری رات وہ اپنی کھاٹ پر لحاف اوڑھے جاگتی رہی وہ بالکل اکیلی تھی۔ رحمان کو اس نے دوسرے گاؤں بھیج دیا اور عبدالغفار نہ جانے کہاں سو گیا تھا۔ الّو پہلوان کبھی کبھی تکیے میں آگ تاپتے تاپتے وہیں الاؤ کے پاس سو جایا کرتا تھا۔ مگر وہ صبح ہی سے دکھائی نہیں دیا تھا۔ چنانچہ کبوتروں کو دانہ مائی جیواں نے ہی کھلایا تھا۔

تکیہ گاؤں کے اس سرے پر واقعہ تھا۔ جہاں لوگ گاؤں کے اندر داخل ہوتے تھے۔ مائی جیواں ساری رات جاگتی رہی مگر اس کو ہلکی سی آہٹ بھی نہ سنائی دی جب رات گزر گئی اور گاؤں کے مرغوں نے اذانیں دینا شروع کر دیں تو وہ سندر جاٹ کی بابت سوچتی سوچتی سو گئی۔

چونکہ رات کو بالکل نہ سوئی تھی اس لئے صبح بہت دیر کے بعد جاگی کوٹھڑی سے نکل کر جب وہ باہر آئی تو الّو پہلوان کبوتروں کو دانہ دے رہا ہے اور دھوپ سارے تکیئے میں پھیلی ہوتی ہے اس نے باہر نکلتے ہی اس سے کہا ساری رات مجھے نیند نہیں آئی یہ موا ہڑا پابڑا تنگ کر رہا ہے۔ صبح سوئی ہوں اور اب اٹھی ہوں

"ہاں تم سناؤ کل کہاں رہے ہو؟"

الّو نے جواب دیا "گاؤں میں"

اس پر مائی جیواں نے کہا "کوئی تازہ خبر سناؤ"

الّو نے جھولی کے سب دانے زمین پر گرا کر اور جھپٹ کر ایک کبوتر کو بڑی صفائی سے اپنے ہاتھ میں دبوچتے ہوئے کہا۔ آج صبح چوپال پر نتھا سنگھ کہہ رہا تھا کہ گام چمار کی وہ لونڈیا — کیا نام ہے اس کا؟ — ہاں وہ بینتی کہیں بھاگ گئی ہے؟ — میں تو کہتا ہوں اچھا ہوا — حرام زادی نے سارے گاؤں کو سر پر اٹھا رکھا تھا۔

کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے یا کوئی اٹھا کر لے گیا ہے۔؟

مائی جیواں کو اس گفتگو سے اطمینان نہ ہوا۔ سندر جاٹ نے ڈاکہ نہیں ڈالا تھا۔ پر ایک چھوکری تو غائب ہو گئی تھی اب وہ چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح بینتی کا غائب

ہو جانا سندر جاٹ سے متعلق ہو جاتے۔ چنانچہ وہ تمام لوگوں سے نیتی کے بارے میں پوچھتی رہی جو تکیئے میں آتے جاتے رہے لیکن جو کچھ ابّو نے بتایا تھا اس سے زیادہ اُسے کوئی بھی نہ بتا سکا۔

شام کو رحمان لوٹ آیا اُس نے آتے ہی ماں سے سندر جاٹ کے ڈاکہ کے متعلق پوچھا۔ اس پر مائی جیواں نے کہا۔ سُندر جاٹ تو نہیں آیا بیٹیا۔ نیتی کہیں غائب ہو گئی ہے۔ ایسی کہ کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔

رحمان کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کی ٹانگوں میں دس کوس اور چلنے کی تھکاوٹ پیدا ہو گئی ہے وہ اپنی ماں کے پاس بیٹھ گیا۔ اُس کا چہرہ خوفناک طور پر زرد تھا ایک دم یہ تبدیلی دیکھ کر ماں جیواں نے تشویشناک لہجہ میں اس سے پوچھا کیا ہوا بیٹیا؟"

رحمان نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور کہا: "کچھ نہیں ماں ——— تھک گیا ہوں!"

"اور نیتی کل مجھ سے پوچھتی تھی۔ میں کب تھکوں گی؟"

رحمان نے پلٹ کر دیکھا تو اس کا بھائی عبدالغفار آستین سے اپنے منہ کا لعاب پونچھ رہا تھا۔ رحمان نے گھور کر دیکھا اور پوچھا، کیا کہا تھا۔ اُس نے تجھ سے عبدالغفار الاؤ کے پاس بیٹھ گیا: "کہتی تھی کہ میں تھکتی نہیں پر اب وہ تھک جائے گی!"

رحمان نے تیزی سے پوچھا "کیسے"؟

غفار سائیں کے چہرے پر ایک بے معنی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

"مجھے کیا معلوم؟ ——— سُندر جاٹ جانے اور وہ جانے!"

یہ سُن کر رحمان کے چہرے پر اور زیادہ زردی چھا گئی - اور ماتھے کی جھریاں اور زیادہ گہرائی اختیار کر گئیں :

اُلّو کا پٹھا

قاسم صبح سات بجے لحاف سے باہر نکلا اور غسل خانے کی طرف چلا۔ راستے میں، یہ اس کو ٹھیک طور پر معلوم نہیں، کہ سونے والے کمرے میں، صحن میں یا غسل خانے کے اندر اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ کسی کو اُلّو کا پٹھا کہے بس صرف ایک بار غصّے میں طنزیہ انداز میں کسی کو اُلّو کا پٹھا کہہ دے۔

قاسم کے دل میں اس سے پہلے کئی بار بڑی انوکھی —— خواہشیں پیدا ہو چکی تھیں۔ مگر یہ خواہش سب سے نرالی تھی۔ وہ بہت خوش تھا۔ رات کو اس کو بڑے پیار کی نیند آئی تھی۔ وہ خود کو تر و تازہ محسوس کر رہا تھا لیکن پھر یہ خواہش کیسے اس کے دل میں داخل ہو گئی، دانت صاف کرتے وقت اس نے ضرورت سے زیادہ وقت صرف کیا۔ جس کے باعث اُس کے مسوڑھے چھل گئے، دراصل وہ سوچتا رہا کہ عجیب و غریب خواہش کیوں پیدا ہوتی۔ مگر وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔

بیوی سے وہ بہت خوش تھا اُن میں کبھی لڑائی نہیں ہوتی تھی۔ نوکروں

سے بھی وہ ناراض نہیں تھا۔ اس لئے غلام محمد یا نبی بخش دونوں خاموشی سے کام کرنے والے مستعد نوکر تھے۔ موسم بھی نہایت خوش گوار تھا۔ فروری کے سہانے دن تھے جن میں کنوار کے پتے کی تازگی تھی۔ ہوا خنک اور ہلکی ——— دن چھوٹے نہ راتیں لمبی۔ نیچر کا توازن بالکل ٹھیک اور قاسم کی صحت بھی خوب تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کسی کو بغیر وجہ کے اُلّو کا پٹھا کہنے کی خواہش اس کے دل میں کیوں کر پیدا ہوئی۔

قاسم نے اپنی زندگی کے اٹھائیس برسوں میں متعدد لوگوں کو اُلّو کا پٹھا کہا ہوگا۔ اور بہت ممکن ہے کہ اس سے بھی کڑے لفظ اس نے بعض موقعوں پر استعمال کئے ہوں گے۔ اور گندی گالیاں دی ہوں گی۔ مگر اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ ایسے موقعوں پر خواہش بہت پہلے اس کے دل میں پیدا نہیں ہوئی تھی مگر اچانک طور پر اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ کسی کو اُلّو کا پٹھا کہنا چاہتا ہے اور یہ خواہش لمحہ بہ لمحہ شدت اختیار کرتی چلی گئی۔ جیسے اس نے اگر کسی کو اُلّو کا پٹھا نہ کہا تو بہت بڑا حرج ہو جائے گا۔

دانت صاف کرنے کے بعد اُس نے چھلے ہوئے مسوڑوں کو اپنے کمرے میں جاکر آئینے میں دیکھا۔ مگر دیر تک اُن کو دیکھتے رہنے سے بھی وہ خواہش نہ دبی۔ جو ایکا ایکی اس کے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔

قاسم منطقی قسم کا آدمی تھا وہ بات کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کا عادی تھا۔ آئینہ میز پر رکھ کر وہ آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور ٹھنڈے دماغ سے سوچنے لگا۔ "مان لیا کہ میرا کسی کو اُلّو کا پٹھا کہنے کو جی چاہتا ہے ——— مگر یہ

کوئی بات تو نہ ہوتی ——— میں کسی کو اُلّو کا پٹھا کیوں کہوں؟ ——— میں کسی سے ناراض بھی تو نہیں ہوں۔

یہ سوچتے سوچتے اس کی نظر سامنے دروازے کے بیچ میں رکھے ہوئے حقّے پر پڑی۔ ایک دم اُس کے دل میں یہ باتیں پیدا ہوئیں عجیب واہیات نوکر ہے۔ دروازے کے عین بیچ میں حقہ ٹکا دیا ہے میں بھی اس دروازے سے اندر آیا ہوں۔ اگر ٹھوکر سے بھری ہوئی چلم گر پڑتی تو پا انداز جو کہ مُونج کا بنا ہوا ہے چلنا شروع ہو جاتا اور ساتھ ہی قالین بھی۔

اُس کے جی میں آئی کہ غلام محمد کو آواز دے۔ جب وہ بھاگتا ہوا اس کے سامنے آ جائے تو وہ بھرے ہوئے حقّے کی طرف اشارہ کر کے اس سے صرف اتنا کہے "تم نرے اُلّو کے پٹھے ہو۔" مگر اس نے ٹال گیا اور سوچا کہ یوں بگڑنا اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ اگر غلام محمد کو اُلّو کا پٹھا کہہ بھی دیا تو وہ بات پیدا نہ ہو گی اور پھر اس بیچارے کا کوئی قصور بھی تو نہیں ہے۔ میں دروازے کے پاس بیٹھ کر ہی تو ہر روز حقہ پیتا ہوں۔"

چنانچہ وہ خوشی جو ایک لمحہ کے لیئے قاسم کے دل میں پیدا ہوئی تھی کہ اس نے اُلّو کا پٹھا کہنے کے لیئے ایک اچھا موقع تلاش کر لیا، غائب ہو گئی۔

دفتر کے وقت میں ابھی کافی دیر تھی، پورے دو گھنٹے پڑے تھے دروازہ کے پاس کرسی رکھ کر قاسم اپنے معمول کے مطابق بیٹھ گیا اور حقہ نوشی میں مصروف ہو گیا۔

کچھ دیر وہ سوچ وچار کئے بغیر حقّے کا دھواں پیتا رہا۔ اور دھوئیں کے انتشار

کو دیکھتا رہا۔ جونہی وہ حقّے کو چھوڑ کر کپڑے تبدیل کرنے کے لئے ساتھ کے کمرے میں گیا تو اُس کے دل میں وہی خواہش نئی تازگی کے ساتھ پیدا ہوئی۔

قاسم گھبرا گیا۔ بھئی حد ہوگئی ——— اُلّو کا پٹھا ——— میں کسی کو اُلّو کا پٹھا کیوں کہوں اور بفرضِ محال میں نے کسی کو اُلّو کا پٹھا کہہ بھی دیا تو کیا ہوگا ———"

قاسم دل ہی دل میں ہنسا وہ صحیح الدماغ آدمی تھا اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ جو خواہش اُس کے دل میں پیدا ہوئی ہے وہ بالکل بیہودہ اور بے سروپا ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج تھا کہ دبانے پر اور بھی زیادہ اُبھر آتی ہے۔

قاسم اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ بغیر کسی وجہ کے اُلّو کا پٹھا نہ کہے گا۔ خواہ یہ خواہش صدیوں تک اُس کے دل میں تلملاتی رہے۔ شاید اسی احساس کے باعث یہ خواہش جو بھٹکی ہوئی چمگادڑ کی طرح اس کے روشن دل میں چلی آتی ہے۔ اس قدر تڑپ رہی تھی۔

پتلون کے بٹن کے بند کرتے وقت جب اُس نے دماغی پریشانی کے باعث اوپر کا بٹن نچلے کاج میں داخل کر دیا تو وہ جھلّا اٹھا! بھئی ہوگا۔ یہ کیا بیہودگی ہے ——— دیوانہ پن نہیں تو اور کیا ہے ——— اُلّو کا پٹھا کہو اور یہ پتلون کے سارے بٹن مجھے پھر بند کرنے پڑیں گے۔ لباس پہن کر وہ میز پر آ بیٹھا اس کی بیوی نے چائے بنا کر اس کے سامنے رکھ دی۔ اور توس پر مکھن لگانا شروع کر دیا۔ روزانہ معمول کی طرح ہر چیز ٹھیک ٹھاک تھی توس اتنے اچھے سِکے ہوئے تھے کہ بسکٹ کی طرح کرکرے تھے اور ڈبل روٹی بھی اعلیٰ

قسم کی تھی۔ خمیرے سے خوشبو آرہی تھی، مکھن صاف تھا۔ چائے کی کیتلی بے داغ تھی۔ اس کی ہتھیلی کے ایک کونے پر قاسم ہر روز میل دیکھا کرتا تھا۔ مگر آج وہ بھی دھبّہ نہیں تھا۔

اُس نے چائے کا ایک گھونٹ پیا۔ اس کی طبیعت خوش ہو گئی۔ خالص دارجلنگ کی چائے تھی۔ جس کی مہک پانی میں بھی برقرار تھی۔ دُودھ کی مقدار بھی صحیح تھی۔

قاسم نے خوش ہو کر اپنی بیوی سے کہا۔ آج چائے کا رنگ بہت ہی پیارا ہے اور بڑے سلیقے سے بنائی گئی ہے۔

بیوی تعریف سُن کر بہت خوش ہوئی مگر اُس نے منہ بنا کر ایک" اسے کہا"
جی، ہاں۔ بس آج اتفاق سے اچھی بن گئی ہے۔ ورنہ ہر روز تو آپ کو نیم گھول کر پلائی جاتی ہے ــــــ مجھے سلیقہ کہاں آتا ہے ــــــ سلیقے والیاں تو وہ موئی ہوٹل کی چھوکریاں ہیں۔ جن کے آپ ہر وقت گن گایا کرتے ہیں۔"

یہ تقریر سُن کر قاسم کی طبیعت مکدّر ہو گئی۔ ایک لمحے کے لئے اس کے جی میں آئی کہ چائے کی پیالی میز پر اُلٹ دے اور وہ نیم جو اس نے اپنے بچّے کی پھنسیوں کے لئے غلام محمد سے منگوائی تھی اور سامنے بڑے طاقچے پر پڑی تھی گھول کر پی لے۔ مگر اُس نے بردباری سے کام لیا۔ "یہ عورت میری بیوی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی بات بہت ہی بھونڈی ہے مگر ہندوستان میں سب لڑکیاں بیوی بن کر ایسی بھونڈی باتیں ہی کرتی ہیں۔" اور بیوی بننے سے پہلے اپنے گھروں میں وہ اپنی ماؤں سے کیسی باتیں سنتی ہیں؟ بالکل ادنیٰ قسم

کی باتیں اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ عورتوں کو عمومی زندگی میں اپنی حیثیت کی خبر ہی نہیں —— میری بیوی تو پھر بھی غنیمت ہے یعنی صرف ایک ادا کے طور پر ایسی بھونڈی بات کہہ دیتی ہے۔ اس کی نیت نیک ہوتی ہے۔ بعض عورتوں کا تو یہ شعار ہوتا ہے کہ ہر وقت بکواس کرتی رہتی ہیں۔

یہ سوچ کر قاسم نے اپنی نگاہیں طاقچے پر سے ہٹا لیں۔ جس میں نیم کے پتے دھوپ میں سوکھ رہے تھے۔ اور بات کا رُخ بدل کر اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ دیکھو آج نیم کے پانی سے بچے کی ٹانگیں ضرور دھو دینا۔ نیم زخموں کے لئے بڑی اچھی ہوتی ہے —— اور دیکھو موسمبیوں کا رس ضرور پیا کرو، میں دفتر سے لوٹتے ہوئے ایک درجن ضرور لے آؤں گا۔ یہ رس تمہاری صحت کے لئے بہت ضروری ہے۔

بیوی مسکرا دی۔ آپ کو تو بس ہر وقت میری ہی صحت کا خیال رہتا ہے اچھی بھلی تو ہوں۔ کھاتی ہوں۔ پیتی ہوں۔ دوڑتی ہوں، بھاگتی ہوں —— میں نے جو آپ کے لئے بادام منگوا رکھے ہیں —— بھئی آج دس بیس آپ کی جیب میں ڈالے نہ رہوں گی —— لیکن دفتر میں کہیں نہ بانٹ دیجئے گا۔

قاسم خوش ہو گیا کہ چلو موسمبیوں کے رس اور باداموں نے اس کی بیوی کے مصنوعی غصّے کو دُور کر دیا اور یہ مرحلہ آسانی سے طے ہو گیا۔ دراصل قاسم ایسے مرحلوں کو آسانی کے ساتھ ان طریقوں ہی سے طے کیا کرتا تھا۔ جو اُس نے پڑوس کے پرانے شوہروں سے سیکھے تھے اور اپنے گھر کے ماحول کے مطابق اُن میں بہت یا تھوڑا ردّ و بدل کر لیا تھا۔

چائے سے فارغ ہو کر اُس نے جیب سے سگریٹ نکال کر سُلگایا اور اُٹھ کر دفتر جانے کی تیاری کرنے ہی والا تھا کہ پھر وُہی خواہش پیدا ہو گئی اس مرتبہ اُس نے سوچا کہ اگر میں کسی کو اُلّو کا پٹھا کہہ دُوں تو کیا حرج ہے۔ زیر لب بالکل ہولے سے یہ کہہ دُوں۔ اُلّو ——— کا ——— پٹھا ——— تو میرا خیال ہے کہ مجھے دلی تسکین ہو جائے گی۔ یہ خواہش میرے سینے میں بوجھ بن کر بیٹھ گئی ہے کیوں نہ اس کو ہلکا کر دوں۔ دفتر میں۔

اس کو صحن میں بچے کا کموڈ نظر آیا۔ یوں صحن میں کموڈ رکھنا سخت بدتمیزی تھی اور خصوصاً جب کہ ناشتہ کر چکا تھا۔ اور خوشبودار کُرکُرے توس اور تلے ہوئے انڈوں کا ذائقہ ابھی تک اس کے منہ میں تھا ——— اس نے زور سے آواز دی۔ "غلام محمد"

قاسم کی بیوی جو ابھی تک ناشتہ کر رہی تھی بولی۔ "غلام محمدؐ باہر گوشت لینے گیا ہے ——— کوئی کام تھا آپ کو اُس سے؟

ایک سیکنڈ کے اندر اندر قاسم کے دماغ میں بہت سی باتیں آئیں۔ کہہ دوں، یہ غلام محمد اُلّو کا پٹھا ہے۔ اور یہ کہہ کر جلدی سے باہر نکل جاؤں ——— نہیں وہ خود تو موجود ہی نہیں پھر ——— بالکل بیکار ہے ——— لیکن سوال یہ ہے کہ بیچارے غلام محمد ہی کو کیوں نشانہ بنایا جائے۔ اُس کو تو میں ہر وقت اُلّو کا پٹھا کہہ سکتا ہوں۔

قاسم نے اُدھ جلا سگریٹ گرا دیا اور بیوی سے کہا۔ "کچھ نہیں۔ میں اُس سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ دفتر میں میرا کھانا بے شک ڈیڑھ بجے لے آیا کرے ——— تمہیں

کھانا پکانے میں، اور جلدی بھیجنے میں بہت تکلیف کرنی پڑتی ہے۔ یہ کہتے ہوئے اپنی بیوی کی طرف دیکھا جو فرش پر اُس کے گرائے ہوئے سگریٹ کو دیکھ رہی تھی قاسم کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ یہ سگریٹ اگر بجھ گیا اور یہاں پڑا رہا تو اس کا بچہ رینگتا رینگتا آئے گا اور اُسے اٹھا کر منہ میں ڈال لے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے پیٹ میں گڑبڑ مچ جائے گی۔ قاسم نے سگریٹ کا ٹکڑا اٹھا کر غسل خانے کی موری میں پھینک دیا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر غلام محمد کو اُلّو کا پٹھا نہیں کہہ دیا۔ اس سے اگر غلطی ہوتی ہے تو ابھی ابھی مجھ سے بھی تو غلطی ہوئی تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ میری غلطی زیادہ شدید تھی۔"

قاسم بڑا صحیح الدماغ آدمی تھا۔ اُسے اس بات کا احساس تھا کہ وہ صحیح خطوط پر غور و فکر کرنے والا آدمی تھا۔ مگر اس احساس نے اُس کے اندر برتری کا خیال کبھی پیدا نہیں کیا تھا۔ یہاں پر پھر اس کی صحیح الدماغی کو دخل تھا کہ وہ احساس برتری کو اپنے اندر دبا کرتا تھا۔

موری میں سگریٹ کا ٹکڑا پھینکنے کے بعد اُس نے بلا ضرورت صحن میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ دراصل کچھ دیر کے لئے بالکل خالی الذہن ہو گیا تھا۔

اُس کی بیوی ناشتے کا آخری توس کھا چکی تھی۔ قاسم کو یوں ٹہلتے دیکھ کر وہ اس کے پاس آئی اور کہنے لگی: "کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

قاسم چونک پڑا۔ "کچھ نہیں ———— کچھ نہیں ———— دفتر کا وقت ہو گیا کیا؟" یہ لفظ اس کی زبان سے نکلے اور دماغ میں وہی اُلّو کا پٹھا کہنے کی خواہش تڑپنے لگی۔

اُس کے جی میں آئی کہ بیوی سے صاف صاف کہہ دے کہ یہ عجیب وغریب خواہش اُس کے دل میں پیدا ہو گئی ہے، جس کا سر ہے نہ پیر، بیوی ضرور سنے گی، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ بیوی کا ساتھ دینا پڑ گیا۔ چنانچہ یوں ہنسی ہنسی میں اُلّو کا پٹھا کہنے کی خواہش اُس کے دماغ سے نکل جائے گی مگر اُس نے غور کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ بیوی ہنسے گی۔ اور میں خود بھی ہنسوں گا۔ لیکن ایسا نہ ہو کہ یہ بات مستقل مذاق بن جائے ـــــــ ایسا ہو سکتا ہے ـــــــ ہو سکتا ہے، کیا ضرور ہو جائے گا۔ اور بہت ممکن ہے کہ انجام کار خوشگواری پیدا ہو، چنانچہ اس نے اپنی بیوی سے کچھ نہ کہا اور ایک لمحہ تک اُس کی طرف یوں ہی دیکھتا رہا۔

بیوی نے بچے کا کموڈ اٹھا کر کونے میں رکھ دیا اور کہا "آج صبح کو آپ کے برخوردار نے وہ ستایا کہ اللہ کی پناہ ـــــــ بڑی مشکلوں کے بعد میں نے اسے کموڈ پہ بٹھایا۔ اس کی مرضی یہ تھی کہ بستر ہی کو خراب کرے ـــــ آخر لڑکا کس کا ہے ؟ ـــــ"

قاسم کو اس قسم کی چخ چخ پسند تھی۔ ایسی باتوں میں وہ تیکھے مزاج کی جھلک دیکھتا تھا۔ مسکرا کر اُس نے بیوی سے کہا "لڑکا میرا ہی ہے مگر ـــــ میں نے تو آج تک کبھی خراب نہیں کیا۔ یہ عادت اس کی اپنی ہو گی۔"

بیوی نے اس کی بات کا مطلب نہ سمجھا۔ قاسم کو مطلقاً افسوس نہ ہوا۔ اس لئے کہ ایسی باتیں وہ صرف اپنے منہ کا ذائقہ درست رکھنے کے لئے کیا کرتا تھا وہ اور بھی خوش ہوا جب اس کی بیوی نے جواب نہ دیا۔ اور خاموش ہو گئی۔"

"اچھا! بھئی اب میں چلتا ہوں۔ خدا حافظ!"

یہ لفظ جو ہر روز اس کے منہ سے نکلتے تھے۔ آج بھی اپنی پرانی آسانی کے ساتھ نکلے اور قاسم دروازہ کھول کر باہر چل دیا۔

کشمیری گیٹ سے نکل کر جب وہ نکلسن پارک کے پاس سے گزر رہا تھا تو اسے ایک داڑھی والا آدمی نظر آیا۔ ایک ہاتھ میں کھلی ہوئی شلوار تھامے وہ دوسرے ہاتھ سے استنجا کر رہا تھا اس کو دیکھ کر قاسم کے دل میں پھر اُلّو کا پٹھا کہنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ لو بھئی جس کو اُلّو کا پٹھا کہہ دینا چاہئے۔ یعنی جو صحیح معنوں میں اُلّو کا پٹھا ہے —— ذرا اندر ملاحظہ ہو —— کس انہماک سے ڈرائی کلین کئے جا رہا ہے —— جیسے کوئی بہت اہم کام سر انجام پا رہا ہے لعنت ہے!

لیکن قاسم صحیح الدماغ آدمی تھا۔ اس نے تعجیل سے کام نہ لیا۔ اور تھوڑی دیر غور کیا۔ میں اس فٹ پاتھ پر جا رہا ہوں اور وہ دوسرے فٹ پاتھ پر۔ اگر میں نے بلند آواز میں بھی اس کو اُلّو کا پٹھا کہا بھی تو وہ چونکے گا نہیں اس لئے کمبخت اپنے کام میں بہت بری طرح مصروف ہے چاہئے تو یہ کہ اس کے کان کے پاس زور سے نعرہ بلند کیا جائے اور جب وہ چونک اُٹھے تو اسے شریفانہ طور پر سمجھایا جائے۔ قبلہ آپ اُلّو کے پٹھے ہیں —— لیکن اس طرح بھی خاطر خواہ نتیجہ بر آمد نہ ہوگا۔

چنانچہ قاسم نے ارادہ ترک کر دیا۔

اسی اثنا میں اس کے پیچھے سے ایک سائیکل نمودار ہوئی۔ کالج کی ایک

لڑکی اس پر سوار تھی۔ اس لئے کہ پیچھے بستہ بندھا ہوا تھا۔ آناً فاناً اس لڑکی کی ساڑھی فری وہیل کے دانتوں میں پھنسی۔ لڑکی نے گھبرا کر اگلے پہیئے کا بریک دبایا ایک دم سائیکل بے قابو ہوئی اور جھٹکے کے ساتھ لڑکی سائیکل سمیت سڑک پر گر پڑی۔ قاسم نے آگے بڑھ کر لڑکی کو اٹھانے میں عجلت سے کام نہ لیا۔ اس لئے کہ اس نے حادثہ کے ردِعمل پر غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ لڑکی کی ساڑھی وہیل کے دانتوں نے چبا ڈالی ہے اور اس کا بورڈ بہت بری طرح ان میں اُلجھ گیا ہے تو وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ لڑکی کی طرف دیکھے بغیر اس نے سائیکل کا پچھلا پہیہ ذرا اونچا اٹھایا۔ تاکہ اسے گھما کر ساڑھی کو فری وہیل کے دانتوں میں سے نکال لے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ پہیہ گھمانے سے ساڑھی کچھ اس طرح تاروں کی لپیٹ میں آئی کہ ادھر بیٹی کوٹ کی گرفت سے باہر نکل آئی۔ قاسم بوکھلا گیا۔ اس کی بوکھلاہٹ نے لڑکی کو بہت پریشان کر دیا۔ زور سے اس نے ساڑھی کو اپنی طرف کھینچا فری وہیل کے دانتوں میں ایک ٹکڑا اڑا رہ گیا اور ساڑھی باہر آئی۔

لڑکی کا رنگ لال ہو گیا۔ قاسم کی طرف غضبناک نگاہوں سے دیکھا۔ اور بھینچے ہوئے لہجہ میں کہا "اُلّو کا پٹھا"۔

ممکن ہے کچھ دیر لگی ہو گی۔ مگر قاسم نے ایسا محسوس کیا کہ لڑکی نے جھٹ پٹ نہ جانے اپنی ساڑھی کو کیا کیا۔ اور ایک دم سائیکل پر سوار ہو کر نظروں سے غائب ہو گئی۔

قاسم کو لڑکی کی گالی سن کر بہت دکھ ہوا۔ خاص کر اس لئے کہ وہ یہی گالی خود

کسی کو دینا چاہتا تھا۔ مگر وہ بہت صحیح الدماغ تھا۔ ٹھنڈے دل سے اس نے اس حادثہ پر غور کیا اور اُس لڑکی کو معاف کر دیا۔ اس کو معاف کرنا ہی پڑے گا اس لیئے کہ اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں۔ عورتوں کو سمجھنا بہت مشکل کام ہے اور ان عورتوں کو سمجھنا تو اور بھی مشکل ہو جاتا ہے جو سائیکل پر سے گری ہوئی ہوں۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نے اپنی لمبی جراب میں اُوپر ران کے پاس تین چار کاغذ کیوں اُڑس رکھے تھے؟

تلوّن؟

بارش کا شور آہستہ آہستہ یہ شور شدّت پکڑتا ہے۔

نیلم :۔ (ڈرتے ہوئے لہجہ میں) کھڑکی بند کردو جمیل —— "باہر رات کا اندھیرا ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا ہمیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے —— اُف یہ کالی رات کیسی بھیانک ہے۔

جمیل :۔ "ہنستا ہے" ان کالی رسیوں سے، جو سانپ کی طرح بل تو کھاتی ہیں۔ مگر ڈس نہیں سکتیں۔ (ہنستا ہے تمہارے سر کے یہ کالے دھاگے صرف شاعروں ہی کے لئے جان بن سکتے ہیں، نیلم —— ہاں تو کھڑکی کیا سچ مچ بند کردوں —— کیا تمہیں واقعی ڈر لگتا ہے۔

نیلم :۔ اس بھیانک رات سے زیادہ اس وقت مجھے تم سے خوف محسوس ہوتا ہے (کھڑکی بند کر دیتی ہے)

جمیل :۔ (جلدی سے، اتنی بھیانک نہیں جتنی تمہاری کالی زلفیں ہیں۔

نیلم :- تو ڈرنا چاہیئے آپ کو۔

جمیل :- خوف ــــــ مجھ سے تمہیں خوف محسوس ہوتا ہے ــــــ ہونا چاہیئے۔ اس لیئے کہ خوف ہی تم جیسی عورتوں کو رام کر سکتا ہے ــــــ وہ شاعر ــــــ وہ شاعر ــــــ کیا نام تھا اس شاعر کا؟

نیلم :- اب تم اپنے دوست کو اتنی جلدی بھول گئے۔

جمیل :- میں اُسے اُس کی موت کے بعد بھولا ہوں۔ اس لیئے کہ اب اس کو یاد رکھنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا ــــــ اور تم اُسے تو اس کی زندگی ہی میں بھول گئی تھیں۔

نیلم :- خدا کے لیئے ــــــ خدا کے لیئے گڑے مردے نہ اکھاڑو جمیل!

جمیل :- جو تم کفنائے بغیر دفن کر چکی ہو ــــــ نیلم واللہ، اگر میں کبھی تمہاری محبت میں گرفتار ہو جاؤں، تو مزا آجائے ــــــ تمہیں اپنی اس انگوٹھی میں نگینے، کی طرح نہ جڑ لوں تو میرا نام جمیل نہیں ــــــ وہ لوگ بیوقوف تھے جو تمہارے عشق میں آہیں بھرتے مر گئے ــــــ مجھے تعجب ہے کہ ان میں سے کسی نے تمہارا گلا کیوں نہیں کاٹ ڈالا۔ یہ سفید سفید گلا جس میں سے تم اتنے اچھے سُر نکال سکتی ہو، اور اپنے راگ کو جادو بنا سکتی ہو۔

نیلم :- تم کیوں نہیں کاٹ ڈالتے۔

جمیل :- اس لیئے کہ میں تم سے محبت نہیں کرتا۔

نیلم :- مانتی ہوں، لیکن پھر تم مجھ سے دلچسپی کیوں لیتے ہیں۔؟

جمیل :- سیاح جب بمبئی آتے ہیں تو مالا بار کی پہاڑی پر وہ مقام دیکھنے کے لیئے

ضرور ٹھہر جاتے جہاں بائرن قتل کیا گیا تھا ـــــــ تم سے ملتا ہوں اس لئے کہ تم ایک ایسا تاریخی مقام بن گئی ہو، جہاں کئی بیوقوفوں نے جان دے دی ہے۔

نیلم :- تم چاہو تو شاعر بن سکتے ہو۔

جمیل :- مگر تم چاہو تو کچھ بھی نہیں بن سکتیں! ـــــــ عورت ازل سے ایک ہی راگ لے کر آئی ہے۔ جیسے وہ وقت، بے وقت گاتی رہتی ہے۔ بتاؤ تمہارے سازِ حیات میں دھوکے اور فریب کے سوا کیا اور کوئی راگ ہے۔

نیلم :- بہت سے راگ ہیں، جب تم مجھ سے محبت کرو گے سناؤں گی فی الحال یہ چند شعر سنو!

جمیل :- کیا اُس بیوقوف شاعر کے ہیں۔

نیلم :- نہیں میرے اپنے ہیں۔

(باجے پر انگلیاں چلاتی ہے اور ذیل کے شعر گاتی ہے (احمد ندیم قاسمی)

زندگی ایک سرگرانی ہے یہ میرا عالم جوانی ہے۔
یہ جو پلکوں پہ قطرۂ خون ہے تیرے اکرام کی نشانی ہے
مسکرانا جسے نصیب نہ ہو وہ جوانی بھی کیا جوانی ہے

جمیل :- اچھا گاتی ہو ـــــــ (گلاس میں شراب انڈیلتا ہے)

اور یہ شراب بھی بری نہیں

نیلم :- (آخری شعر گاتی ہے)

ہے ان آنکھوں کا رنگ پانی میں
ورنہ کیا ہے شراب پانی میں

جمیل :- خود ستائی کا دوسرا نام عورت ہے - کیوں نیلم ـــــــ ؟ اور معلوم ہوتا ہے آج کسی نے تمہاری آنکھوں کی تعریف نہیں کی - جب ہی تمہیں ان کا رنگ شراب میں گھولنا پڑا ـــــــ بخدا نیلم تم بڑی دلچسپ عورت ہو - تمہاری پلکوں میں پھنسے ہوتے آنسو دیکھ کر مجھے ریگستان کے کنوئیں یاد آجاتے ہیں ہاں یہ تو بتاؤ آج تم رو کیوں رہی ہو ـــــــ اگر مجھے مرغوب کرنے کے لئے تم نے یہ آنسو بہاتے ہیں، تو میں کہوں گا کہ تم نے ناحق تکلیف کی، میرے دل کی چھت ٹپکتی نہیں -

نیلم :- (باجے کے پردے چھیڑتی ہے اور ایک ٹھنڈی سانس بھرتی ہے) جمیل . عورتیں روتی ہیں ـــــــ جانتے ہو عورتیں کیوں روتی ہیں ؟

جمیل :- کہ مرد زیادہ شراب پئیں - (اور گلاس میں شراب ڈالتا ہے)

نیلم :- (تنگ آکر بلند آواز میں) ـــــــ جمیل ـــــــ (ایک دم آواز دبا کر) اب میں تم سے کیا کہوں جمیل ؟

جمیل :- کہو کہ جمیل تم خوب صورت ہو ـــــــ تمہاری گفتگو ایسی ہے جیسے شراب کے یہ متحرک بلبلے ـــــــ تمہاری جوانی ایسی ہے جیسے ساز کے تنے ہوتے تار ـــــــ تم عورتوں کا ـــــــ تم حسین عورتوں کا ـــــــ کہو کیا کہوں گی ـــــــ ہاں کہو کہ تم حسین عورتوں کا خواب جمیل ہو ـــــــ کہو کچھ ایسا ہی کہو اور کہے چلی جاؤ ـــــــ اگر عورتیں اپنی تعریف سے خوش ہو سکتی

ہیں تو کیا ایک مرد نہیں ہو سکتا۔ ہاں یہ بتاؤ نیلم، آج تمہاری شراب سسکیاں کیوں بھر رہی ہے ——— میں نے دو گھونٹ پیتے ہیں اور مجھے ایسا محسوس ہوا ہے کہ میرے حلق سے دو آہیں نیچے اُتر گئی ہیں ——— یہ شراب کسی دل جلے کا تحفہ تو نہیں ؟

(کھڑکی ہوا کے دباؤ سے کھُل جاتی ہے اور بارش کا شور سنائی دیتا ہے)

جمیل :- کھڑکی بند کر دو نیلم۔ باہر رات کا اندھیرا ایسا معلوم ہوتا ہے، گویا ہمیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے ——— اُف یہ کالی رات کتنی بھیانک ہے

نیلم :- اتنی بھیانک نہیں جتنی تمہاری گفتگو ہے۔

جمیل : تو مجھ سے ڈرنا چاہیئے تمہیں۔

نیلم :- ہنستی ہے، ڈرنا چاہیئے ——— تمہاری ان باتوں سے جو بالکل کھوکھلی ہیں۔ (ہنستی ہے) ان چنگاریوں سے جن میں خود بھی جلنے کی قوت نہیں۔ ہاں تو کھڑکی کیا، سچ مچ بند کر دوں۔ کیا تمہیں واقعی ڈر لگتا ہے۔

(کھڑکی بند کر دیتی ہے)

جمیل :- مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان تمام مردوں کی روحیں، جو تمہاری محبت کا زہر بن کر اس دنیا سے اٹھ گئے ہیں آج رات اس کالی بارش میں نہا رہی ہیں ——— نیلم ذرا خیال کرو اگر سچ مچ یہ روحیں تمہارا راستہ روک کر کھڑی ہو جائیں تو ——— تو ——"

نیلم :- اگر تمہاری رُوح بھی اس قطار میں ہوئی تو شاید مجھے ایک لمحہ کے لئے ٹھہرنا پڑے۔

جمیل :- کیوں ؟

نیلم :- اس کیوں کا جواب اُس وقت دوں گی۔ جب تمہاری روح کالی بارش میں نہائے گی۔ اور میرا راستہ روک کر کھڑی ہو جائے گی۔

جمیل : اب دلیر ہو گئی ہو!

نیلم :- تم اسے دلیری کہتے ہو۔ مگر یہ عورت کی سب سے بڑی بزدلی ہے۔

جمیل :- کیا ؟

نیلم :- یہی ——— یہی دلیری!

جمیل :- تمہاری باتیں اس وقت شراب کے گھونٹوں سے زیادہ مزے دے رہی ہیں

نیلم :- تو شراب چھوڑ دو، یہی پیو!

جمیل :- بخدا آج تم نے میری طبیعت خوش کر دی۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ جب میرے ہوش و حواس بجا نہ رہے تو چند دنوں کے لئے تم سے محبت ضرور کروں گا ——— جانتی ہو محبت کسے کہتے ہیں-؟

نیلم :- ہوش و حواس بجا نہ رہنے کی صورت میں کسی عورت سے چند دنوں کیلئے کھیلنا

جمیل :- تمہاری یہ باتیں مجھے کسی روز مجبور کر دیں گی کہ میں ——— کہ میں

نیلم :- کہو ——— کہو۔

جمیل :- کہ میں تمہیں ایک کتاب بنا کر اپنی الماری میں رکھ لوں۔ تم جیسی عورتوں کو فرصت کے وقت ضرور پڑھنا چاہیئے۔

نیلم :- پہلے قاعدہ تو پڑھ لیا ہوتا۔

جمیل :- ہوشیار طالب علموں کے لئے ابتدائی معلومات اتنی ضروری نہیں ہوتیں،

نیلم :- ہائے تمہاری ہوشیاری —— تمہیں اس ہوشیاری پر کتنا ناز ہے۔ لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری ہوشیاری کسی عورت کے سامنے گھٹنے ٹیک دے۔

جمیل :- میری ہوش مندی شاعروں کی ہوش مندی نہیں —— ہاں یہ تو بتاؤ تم نے اس بیچارے شاعر سے اتنا بُرا سلوک کیا۔؟

نیلم :- اس لئے کہ مجھ سے تمہارا سلوک اچھا نہیں۔

جمیل :- یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آئی۔

نیلم :- اور نہ کبھی آئے گی —— اپنے گھروں میں آسانی کے ساتھ سوٹ کیسوں کا تالا کھولنے والے مرد جب کسی عورت کے دل کا تالا کھولنا چاہیں تو یہی مشکل پیش آیا کرتی ہے۔ اور وہ لوگ جو تم ایسے مشکل پسند ہوتے ہیں۔ آسانیاں اُن کے لئے دشواریاں ہوتی ہیں۔

جمیل :- کون سی آسان بات سمجھنا میرے لئے دشوار ہے۔

نیلم :- کہ تمہارے بُرے سلوک نے مجھے تمہارے شاعر دوست سے بُرا سلوک کرنے پر مجبور کر دیا۔

جمیل :- کتنی آزادانہ مجبوری ہے۔

نیلم :- تمہیں سیدھی سادھی بات میں الجھاؤ پیدا کر کے شاید لطف آتا ہے لیکن یاد رکھو کہ کسی روز تم خود ان بھول بھلیوں میں ایسے پھنسو گے کہ نکلنے کا نام نہ لو گے —— حقائق کا ہر وقت منہ چڑانا بھی اچھا نہیں۔ تم جانتے ہو تم محسوس کرتے ہو اس لئے کہ محسوس کرتے ہو اس لئے کہ محسوس کرنا جاننے سے بہت بہتر ہے کہ تمہارے دوست شاعر کی محبت کو میں نے صرف اُسے

اس لیے ٹھکرا دیا کہ تمہاری ٹھوکروں سے مجھے پیار ہو گیا تھا۔

جمیل:۔ میں زیادہ شراب تو نہیں پی گیا۔؟

نیلم:۔ نہیں تم نے صرف دو گلاس پیئے ہیں۔ مدہوش میں ہو رہی ہوں۔

جمیل:۔ تو پھر کوئی حرج نہیں —— کہو کیا کہہ رہی تھیں۔ تم نے میرے شاعر دوست کی محبت کو صرف اس لیے ٹھکرا دیا کہ میری ٹھوکروں سے تمہیں پیار ہو گیا تھا —— ہاں پھر کیا ہوا۔؟

نیلم:۔ جو ہونا تھا۔

جمیل:۔ یعنی۔

نیلم:۔ شاعروں کے سینکڑوں شعر ہر روز پھانکتی رہی مگر میرے دل میں محبت کی شعریت پیدا نہ ہوئی اور تمہاری خشک باتوں نے —— دکھڑکی شور کے ساتھ کھلتی ہے۔ ہوا کی تیز سیٹیاں کمرے میں پھیل جاتی ہیں۔ عباس کھڑکی کے راستے اندر داخل ہوتا ہے۔ نیلم چیختی ہے، —— عباس

عباس:۔ (زور سے کھڑکی بند کر دیتا ہے اور فرش پر اپنے وزنی بوٹوں سے چلتا نیلم کے پاس آجاتا ہے) ہاں شاعر عباس —— مگر یہ چیخ کیسی —— کیا پرانے دوستوں کا استقبال ایسی چیخوں سے کیا جاتا ہے۔؟ اور جمیل تم کیوں ڈر گئے —— کیا میں تمہارا عزیز دوست عباس نہیں ہوں۔ جس کے سینکڑوں شعر روز پھانکنے پر بھی نیلم کے دل کا ہاضمہ درست نہیں ہوا —— خبردار جو تم اپنی جگہ سے ہلے —— میرا پستول شعر نہیں کہتا۔ ایسا نہ ہو کہ اس سے بد کلامی ہو جائے —— ہاں کہو نیلم

تم کیا کہہ رہی تھیں ——— جمیل کی خشک باتوں نے کیا کیا۔؟

نیلم :۔ (بھینچے ہوئے لہجہ میں) ——— عباس تم زندہ ہو!

عباس : مجھے خود تو یہی محسوس ہوتا ہے۔

جمیل :۔ ریل گاڑی کے حادثہ میں تمہارے مرجانے کی افواہ ———

عباس :۔ غلط تھی لیکن آج شب کے حادثے میں تمہارے مرجانے کی افواہ غلط ہوگی۔

جمیل :۔ تو مجھے ابھی ابھی وصیّت کر دینا چاہیئے۔ اور اپنی ساری جائداد تمہارے حق میں محفوظ کر دینا چاہیئے۔

عباس : تمہاری جائداد ——— کیا ہے تمہاری جائداد؟

جمیل :۔ میری خشک باتیں جو تمہارے شعروں کے ساتھ مل کر نیلم کا دل موہ سکیں۔

عباس : (ایک دم غصّے میں آکر) ——— جو میں نہ موہ سکا۔ یہی چاہتے ہو نہ تم ——— دبی زبان میں آج تم نے جس بات کی طرف اشارہ کیا ہے، اگر مجھے پہلے معلوم ہوتی تو میرے دل کا بوجھ اس قدر زیادہ نہ ہوتا۔

——— وہ بوجھ جو اب تمہیں اپنے کاندھوں پر اٹھانا پڑے گا ——— میں بیوقوف ہوں ——— جیسا کہ تم نیلم سے کہہ رہے تھے۔ شاعر بے وقوف ہی ہوا کرتے ہیں۔ مگر وہ تم جیسے غدّار نہیں ہوتے۔ بھیڑ کی کھال میں تم جیسے چیتے نہیں ہوتے ——— تم ——— تم نے اپنی طرف سے شاید ایک دھپ کھیل کھیلتے رہے۔ مگر جانتے ہو تم نے مجھے بجید

دُکھ پہنچایا ہے۔ تم نے میرے حساس رُوح کو پاؤں تلے روند دیا ہے۔

تم نے شاعر کو تکلیف نہیں دی ایک انسان کو دُکھ دیا ہے۔ جو محبّت میں گرفتار تھا ــــــ جانتے ہو محبّت کرنے والے انسانوں کی رُوح بہت حساس ہوتی ہے۔

جمیل :- میں نے کبھی محبت نہیں کی۔

عباس :- لیکن اب تمہیں کرنا ہو گی۔

جمیل :- کس سے۔

عباس :- نیلم سے ــــــ اس عورت سے جس سے میں محبّت کرتا ہوں اس مغنّیہ سے جس کے حلق سے نکلے ہوتے سُروں نے اتنے برس میری رُوح آشیانہ بناتی رہی اور جس کے تنکے تم نے ہوائی بگولا بن کر اُڑا دیئے

سُنتے ہو! اس عورت سے۔ جس کی نسوانیت میری نرم و نازک میری شاعری نے بناتی ہے۔ تم اپنی کھُردری باتوں میں محبت کرو گے،

جمیل :- اور تم؟

عباس :- تمہیں اس بات کا ثبوت دینا ہو گا۔ اور اس سے میری محبت کا ثبوت یہ ہے کہ مجھے آج نصف شب کے بعد شاعر عباس، نیلم پر اپنی جان قربان کر دے گا ــــــ اس دُنیا میں چلا جائے گا۔ جہاں شعریت ہی شعریت ہے۔

جمیل :- دوسرے لفظوں میں مجھے اس دُنیا میں جانا پڑے گا۔ جہاں شعریت ہی شعریت ہے۔

عباس :۔ تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو۔

نیلم :۔ عباس ——— خدا کے لئے عباس ایسے بے رحم نہ بنو۔

عباس :۔ اس سے تمہاری محبت کا ثبوت لینا کوئی بے رحمی نہیں ——— میں بھی تو اس بات کا ثبوت دوں گا کہ مجھے تم سے محبت ہے۔

نیلم :۔ کیسے ؟

عباس :۔ اس گلاس میں جس میں جمیل شراب پیتا رہا ہے۔ میں زہر گھول رہا ہوں (گلاس کی آواز) پہلا گھونٹ جمیل پیئے گا۔ جب زہر اُس کو ہلاک کر دیگا تو دوسرا گھونٹ میں پیوں گا۔

نیلم :۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے عباس ——— تمہارا دماغ بہک گیا ہے۔

جمیل :۔ اور اگر میں انکار کر دوں ؟

عباس :۔ تو میرا پستول کبھی انکار کریگا۔

جمیل :۔ پستول کی گولی سے مرنا شاندار نہیں ——— " میں زہر پیوں گا۔ مگر مجھے اس بات کا یقین ہونا چاہیئے کہ میری موت کے بعد تمہاری موت بھی ہو گی ——— کیا نیلم مجھے اس بات کا یقین دلا سکتی ہے۔

نیلم :۔ میں ——— میں ——— لیکن عباس شاعر ہے۔

جمیل :۔ تو ایسا ہو سکتا ہے کہ پہلے عباس زہر پیئے اور اُس دُنیا کا دروازہ کھٹکھٹائے جہاں شعریت ہی شعریت ہے۔

میں اس کے پیچھے آنے کا وعدہ کرتا ہوں ——— اس تھوڑے وقفے میں مجھے نیلم کی محبت میں گرفتار ہونے کا موقعہ بھی مل جائے گا۔

نیلم :- ایسا کیوں نہ ہو۔ کہ سارا زہر میں ہی اپنے حلق سے نیچے اتار لوں۔
اور پھر ایک دوسرے کے دوست بن جاؤ —— ایک دوسرے سے
محبت کرنا شروع کر دو۔

عباس :- (بلند آواز میں) نہیں —— ہرگز نہیں۔
موت کا یہ جال میری مرضی کے مطابق پانی میں ڈالا جائے گا۔
جمیل، پہلے تم اس جال میں آؤ گے۔ پھر میں —— اور نیلم زندہ رہیگی
—— اس کو زندہ رہنا پڑے گا —— جب زہر تمہارے اندر
سرایت کر جائے گا۔ اور موت کا مضبوط ہاتھ تمہیں رسی کے مانند بٹ دیگا
تو نیلم کے دل پر نشتر پڑیں گے۔ اس نیلم کے دل پر جس نے شاعر عباس
کے دل کو فضول سمجھ کر توڑ دیا —— تم مرو گے اور میں جیوں گا۔ میں جیوں
اور تم مرو گے۔ (دیوانہ وار ہنستا ہے) —— ہاں تمہیں مرنا ہو گا۔ میں
خود مروں گا۔ مگر زندہ ہو کر، اور تم مرو گے ادھ موتے ہو کر (ہنستا ہے)
برف کے ٹکڑوں سے اپنی تابانی اُدھار لینے والی نیلم کے لئے آج کڑی
آزمائش کا دن ہے —— اس کی آنکھوں کے سامنے آج اس کے
دو چاہنے والے موت کی گہرائیوں میں اتریں گے۔

جمیل :- مذاق ختم ہو چکا —— رات بہت گزر چکی ہے۔ عباس میں سمجھتا
ہوں کہ اب تماشے کو بند کر دینا چاہئے۔ نیلم برف کی سلوں سے اپنی تابانی
ادھار لیتی ہے۔ تم ان سے تھوڑی سی سردی مانگ لو۔ اور خدا کے لئے
اس آگ کو بجھاؤ —— میں آگ تاپنے کا عادی نہیں ہوں۔

عباس :- زور سے قہقہہ لگاتا ہے۔ صرف باتیں ہی بنانے کے عادی ہو۔ تم آگ لگا سکتے ہو مگر آگ لگا کر اس کا تماشا دیکھنے کی تاب تم میں نہیں۔ نیلم تمہاری ٹھوس چٹان چٹخنا شروع ہو گئی —— بس اب کچھ دم میں ریزہ ریزہ ہوا چاہتی ہے —— (ہنستا ہے) —— تمہیں عورتوں سے کھیلنا پسند ہے۔ مگر زہر کا ایک گھونٹ تم سے نہیں پیا جاتا۔ میرے دوست! عورتیں زہر سے زیادہ زہریلی ہوتی ہیں۔

جمیل :- ہوں گی، مگر اُن کے لئے جو اُن سے دلچسپی لیتے ہیں —— "

نیلم :- عباس —— جمیل ٹھیک کہتا ہے —— "اسے مجھ سے صرف اس قدر دلچسپی تھی کہ میں اُس کی باتوں سے دلچسپی لوں۔

عباس :- کیا دلچسپ بات ہے —— اور زہر کے یہ گھونٹ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں —— کتنے پیو گے؟ میرے لئے تو ایک ہی کافی ہوگا۔

جمیل :- نہیں پیوں گا۔

عباس :- تمہیں پینا ہوگا —— (گلاس اٹھاتا ہے) اسی شراب میں زہر ہے۔ نیلم لپک کر ہاتھ سے گلاس گرا دیتی ہے۔ عباس اس کی کلائی پکڑ لیتا ہے (نیلم کی چوڑیاں کھنکھناتی ہیں۔) زہر کی پڑیا واپس دیدو نیلم (نیلم) عباس کی زبردست گرفت کے باعث کراہتی ہے اور کہتی ہے "میری کلائی ٹوٹ جائے گی" —— میرا دل ٹوٹ چکا ہے —— لاؤ —— یہ زہر میرے حوالے کر دو (نیلم کی ہلکی سی چیخ) —— بس اب ایک طرف ہو جاؤ اور ہمارا تماشا دیکھو —— خبردار جمیل —— اپنی جگہ پر

کھڑے رہو۔ (گلاس اٹھاتا ہے اور اس میں زہر کی پڑیا گھول دیتا ہے

لو۔ اس کا ایک گھونٹ پی جاؤ ـــــ گلاس ہاتھ میں لو ـــــ ورنہ۔

جمیل :۔ (ڈرتے ہوتے لہجہ میں) ـــــ نیلم ـــــ کیا سچ مچ مجھے یہ زہر پینا پڑے گا۔

نیلم :۔ حالات کا تقاضا یہی ہے۔

جمیل :۔ حالات کا تقاضا ـــــ حالات کا تقاضا ـــــ مجھے حالات سے کیا واسطہ ہے ـــــ مجھے کسی سے کوئی واسطہ نہیں ہے نیلم یہ کیا ہو رہا ہے ـــــ خدا کے لئے مجھے موت سے بچاؤ

عباس :۔ ہنستا ہے۔

نیلم :۔ پی جاؤ۔ میرا منہ کیا دیکھتے ہو ـــــ شہد سمجھ کے پی جاؤ۔

جمیل :۔ شہد ـــــ شہد ـــــ ''

عباس :۔ (بلند آواز میں) پی جاؤ ـــــ ورنہ ـــــ ''

نیلم :۔ پی جاؤ، تمہیں کچھ نہ ہوگا۔

جمیل :۔ کیسے کیسے۔

عباس :۔ پی جاؤ۔

نیلم :۔ پی جاؤ۔ پی جاؤ۔

عباس :۔ بس ایک گھونٹ ـــــ باقی میری طرف بڑھا دو۔

نیلم :۔ پی جاؤ، ڈرو نہیں۔

جمیل :۔ پی جاؤں ؟

عباس :- ہاں، ہاں پی جاؤ۔

نیلم :- پی جاؤ۔

جمیل :- تم بھی پیو گے۔

عباس :- وقت ضائع نہ کرو۔

نیلم :- ڈرتے کیوں ہو،

جمیل :- گلاس میں سے زہر پینتا ہے۔ حلق میں غرغراہٹ پیدا ہوتی ہے پھر کھانستا ہے ــــ"

نیلم :- بس اتنی سی بات تھی۔

عباس :- بس اتنی سی تھی ــــ لاؤ گلاس مجھے دو ــــ شاباش ــــ ارے تمہارا رنگ اتنی جلدی زرد کیوں ہو گیا ــــ ابھی تو زہر تمہارے اندر ٹھیک طور سے اترا بھی نہیں۔

نیلم :- گھبراؤ نہیں جمیل ــــ حوصلہ رکھو،

عباس :- حوصلہ؟ ــــ زہر پی کر یہ کس قسم کا حوصلہ کر سکتا ہے۔ لو دیکھو، مٹھیاں بھینچنا شروع ہو گئیں۔

جمیل :- عباس۔

عباس :- عباس کو کیوں پکارتے ہو، ــــ اس کا نام نہ لو ورنہ تمہاری جان اٹک جائے گی۔

نیلم :- پریشان کیوں ہوتے ہو جمیل ــــ تم نہیں مرو گے۔

جمیل :- نیلم ــــ میں ــــ"

عباس :- (زور زور سے ہنستا ہے) ہا ہا ہا ـــــ بس پانچ منٹ میں تمہاری لاش اس فرش پر ہوگی اور مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں گی - تمہارے اس منحوس چہرے پر جو ابھی سے نیلا پڑ گیا ہے -

جمیل :- نیلا ـــــ تم قاتل ہو ـــــ تم میرے قاتل ہو ـــــ میں شور مچانا شروع کر دوں گا ـــــ "

میں شور مچانا شروع کر دوں گا -

عباس :- کچھ فائدہ نہ ہوگا ـــــ چیخنے اور چلانے سے) جو کام تم کرنا چاہتے ہو ارادہ میں خود کرنے والا ہوں - اس گلاس کا باقی زہر ابھی میرے اندر چلا جائیگا ـــــ مگر تمہیں پہلے مرنا ہوگا ـــــ تم میری جان کنی کا تماشہ نہیں دیکھو گے - اس کا مزا صرف میں لوں گا - (ہنستا ہے) نیلم - ذرا اس بہادر کی حالت تو دیکھو - جس کی ٹھوکروں سے تمہیں پیار ہو گیا تھا (ہنستا ہے) ہا ہا ہا ـــــ تم کانپ رہے ہو جمیل ـــــ تمہارا رُواں رُواں کانپ رہا ہے ـــــ زہر نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا ـــــ بس اب تم چند گھڑیوں کے مہمان ہو -

جمیل :- (دیوانہ وار) ـــــ میں نہیں مرنا چاہتا -

میں نہیں مرنا چاہتا - کوئی مجھے بچائے - کوئی مجھے بچائے -

عباس :- شریف آدمیوں کی طرح جان دو جمیل !

یوں چیخو، چلاؤ نہیں - موت بہت حساس ہوتی ہے -

جمیل :- موت ـــــ موت ـــــ "

نیلم :- ڈرو نہیں، تم زندہ رہو گے۔'

عباس :- (ہنستا ہے) تم زندہ رہو گے اس لئے کہ تم اس صورت کے لئے اپنی جان دے رہے ہو (ہنستا ہے) ____ تمہارا رنگ اب بالکل نیلا پڑ گیا ہے، تمہارے ہونٹ خزاں دیدہ پتوں کے مانند کانپ رہے ہیں۔ تمہاری آنکھیں بلبلوں کی طرح ابل رہی ہیں (ہنستا ہے) بس اب تم چند گھڑیوں کے مہمان ہو ____ کچھ کہنا ہو تو کہہ لو نیلم سے (ہنستا ہے) میں کتنا خوش ہوں۔ (ہنستا ہے) ____ قہقہوں کے درمیان جمیل دیوانہ وار چلاتا ہے۔!

پانی پانی۔!!

نیلم کہتی ہے "تمہیں کیا ہے جمیل ____ تم تو سچ مچ مر رہے ہو۔

عباس ہنستا ہے۔ آخر میں دھڑام سے جمیل زمین پر گر پڑتا ہے۔

عباس۔ مر گیا ____ لو اب میں چلا ____ (اسی گلاس میں سے زہر پیتا ہے اور ہونٹ چاٹتا ہے ____ لوگ کہتے ہیں زہر کڑوا ہوتا ہے مگر یہ تو میٹھا تھا) ____ '

نیلم :- جمیل! ____ جمیل! ____ جمیل! ____ ' عباس' جمیل تو سچ مچ مر گیا۔

عباس :- تو کیا جھوٹ کی موت مرتا۔ نیلم اب اس کا ذکر نہ کرو۔ جو مر کھپ چکا ہے۔ میرے ساتھ باتیں کرو جو ابھی مرا نہیں ہے (ہنستا ہے) موت ____ موت اور زندگی میں فرق ہی کیا ہے ____ زندگی ایک نیند ہے جس میں آنکھیں کھلی رہتی ہیں۔ اور موت ایسی نیند ہے جس میں آنکھیں بند رہتی ہیں۔'

نیلم (آہ بھر کر) جمیل مر گیا۔

عباس:۔ تو اب میری باری ہے۔ ایک مرد جس سے تمہیں محبت تھی۔ موت کی آغوش میں جا چکا ہے ——— دوسرا جس کو تم سے محبت ہے، جانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔

نیلم:۔ تم غلط کہتے ہو ——— مجھے جمیل سے محبت نہیں تھی۔

عباس:۔ پھر کس سے تھی؟

نیلم:۔ اس کی خشک باتوں سے ——— تم لوگ اتنی معمولی سی بات کیوں نہیں سمجھتے ——— بادلوں میں گھرے لوگ کیا آسمان کی خواہش نہیں کرتے، برف کے تودوں میں دبی ہوئی چیزیں کیا سورج کی تپش کے لئے نہیں تڑپتیں۔ زمین پر رہنے والے کیا تاروں کی طرف للچائی نظروں سے نہیں دیکھتے ——— کیا فرشتوں نے آسمان چھوڑ کر زمین پر آنے کی غلطی نہیں کی ——— شعروں کے نرم و نازک بستر سے نکل کر حقیقت کے پتھروں سے چلنے پھرنے کی خواہش کیا دل میں پیدا نہیں ہو سکتی ——— اور پھر نیلم تو ایک عورت ہے۔

عباس:۔ عورتوں اور چڑیوں کا فلسفہ میری سمجھ سے ہمیشہ اونچا رہا ہے۔

نیلم:۔ اس لئے کہ تم شاعر زیادہ اور آدمی کم ہو ——— عباس ہر شئے کو شعریت کی نظروں سے دیکھو ——— مگر عورت کو ہمیشہ اپنی نظروں سے دیکھو۔

عباس:۔ (ہنستا ہے) یہ دونوں آنکھیں اب موت ہمیشہ کے لئے میچ دے گی۔

(حیرت سے) مگر اس زہر نے مجھ پر اثر کیوں نہیں کیا ـــــ میں

میں موت کو اپنے قریب محسوس کیوں نہیں کرتا۔ میرا حلق بھی تو خشک نہیں

ہوا۔ میرا رنگ بھی ویسے کا ویسا ہے۔

نیلم:۔ اس لئے کہ تم نے زہر نہیں پیا۔

عباس: (حیرت سے) زہر نہیں پیا ـــــ جمیل کیسے مر گیا؟

نیلم:۔ مر گیا ـــــ اُس کی ہوشیاری اور چالاکی اس کی مدد نہ کر سکی۔

ـــــ حالانکہ میں نے دونوں کو بچانے کی کوشش کی تھی ـــ

زہر کی پڑیا کی بجائے میں نے شکر کی پڑیا بڑی پھرتی سے تمہارے

ہاتھ میں دے دی تھی۔

عباس:۔ پہیلیاں بوجھنے کے فن سے میں بالکل کورا ہوں نیلم!

نیلم:۔ اسی لئے تم نہیں مرے تھے۔ اگر جمیل نے زہر پیا ہوتا۔ تو

وہ شاید نہ مرتا۔ مگر شکر نے اس پر زہر کا کام کیا ـــــ اب

چھوڑو ان باتوں کو (کھڑکی ہوا کے دباؤ سے کھل جاتی ہے۔ بارش

کا شور سنائی دیتا ہے۔)

نیلم:۔ کھڑکی بند کرو عباس ـــــ باہر رات کا اندھیرا ایسا محسوس ہوتا

ہے گویا ہمیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جمیل کی

روح اس کالی بارش میں نہا رہی ہے، اُف یہ کالی رات کتنی بھیانک ہے

عباس:۔ اتنی بھیانک نہیں جتنا تمہارا سفید چہرہ ہے ـــــ"

(کھڑکی بند کر دیتا ہے)

وہ خط
جو پوسٹ نہ کیے گئے

حوّا کی ایک بیٹی کے چند خطوط جو اُس نے فرصت کے وقت محلے کے چند لوگوں کو لکھے۔ مگر اُن کی وجوہ کی بنا پر پوسٹ نہ کیے گئے جو ان خطوط میں نمایاں نظر آتی ہیں

(نام اور مقام فرضی ہیں)

پہلا خط مسز کرپلانی کے نام

خاتونِ مکرّم

آداب عرض معاف فرمائیے گا۔ میں یہ سطور بغیر تعارف کے لکھ رہی ہوں۔ مگر چند ضروری باتیں مجھے آپ سے کہنا ہیں۔ آپ کو میں ایک عرصے سے جانتی ہوں۔ ہر روز ساڑھے آٹھ بجے جب میں بستر سے اُٹھ کر بالکنی میں آتی ہوں تو آپ کو بازار میں سَیر سے واپس آتے دیکھا کرتی ہوں مجھے تعجب ہے کہ مسٹر کرپلانی جنہیں ساڑھے آٹھ بجے گھر سے دفتر پہنچنے کے لیے نکل جانا ہوتا ہے۔ صرف بدھی نوکرانی کی موجودگی اور آپ کی غیر حاضری میں ناشتہ کیسے کرتے

ہیں۔ کپڑے کیوں کر تبدیل کرتے ہیں۔ اور پھر آپ کا بچہ بھی تو ہے اُس کی دیکھ بھال کون کرتا ہے۔؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ سیر آپ کی صحت کے لئے مفید ہے۔ اس سیر کا اثر آپ کے شوہر پر کیا پڑے گا۔ کیا آپ نے اس بات پر کچھ غور کیا ہے؟ میں نے پرسوں مسٹر کرپلانی کو دیکھا۔ ان کی حالت قابلِ رحم تھی۔ آپ نے سر پر ہیٹ الٹا رکھا تھا۔ اور اگر میری نگاہوں نے دھوکہ نہیں دیا تو اُن کے بوٹ کا ایک تسمہ کھلا ہوا تھا۔ جو بار بار اُن کے پاؤں میں اُلجھ رہا تھا۔ کل بھی آپ کی حالت ایسی ہی تھی، اُن کی پتلون —— شکنوں سے بھرپور تھی اور ٹائی کی گرہ بھی درست نہیں تھی۔

اگر آپ کی صبح کی سیر اسی طرح جاری رہی تو مجھے اندیشہ ہے ایک روز مسٹر کرپلانی اس افراتفری میں دفتر کا رُخ کریں گے کہ راہ چلتی عورتوں کو اپنی آنکھیں بند کرنی پڑیں گی۔

اور ہاں، دیکھئے، کل آپ نے جو ساڑھی پہن رکھی تھی، وہ آپ کی نہیں ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مسز ایڈوانی نے یہ ساڑھی پچھلی دیوالی پر خریدی تھی۔ دوسروں کے کپڑے پہننا بہت معیوب ہے۔ آپ کے پاس کم از کم بیس ساڑھیاں موجود ہیں۔ مسز ایڈوانی کی ساڑھی مستعار لے کر آپ نے کیوں نہیں پہنی۔ یہ میں ابھی تک نہیں سمجھ سکی۔

ایک بات اور، وہ یہ کہ آپکے استینوں کا بلاؤز اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ آپ کے کاندھوں پر ضرورت سے زیادہ گوشت ہے۔ جس کی نمائش

آنکھوں پر بہت گراں گزرتی ہے۔ آپ کے جسم پر یہ جیب آستینوں والے بلاؤز میں چھپ جاتا ہے۔ اس لئے آپ کو ہمیشہ اسی تراش کا بلاؤز پہننا چاہیئے۔

اُونچی ایڑی کا شوز آپ کیوں پہنتی ہیں؟ ——— آپ کا قد ماشاءاللہ کافی اُونچا ہے۔ پرسوں آپ نے غیر معمولی ایڑی کا سینڈل پہن رکھا تھا معاف فرمایئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ آپ کے پیروں کے ساتھ اسٹول بندھے ہوئے ہیں۔ اُونچی ایڑی کا جوتا پہن کر آپ آسانی سے چل بھی نہیں سکتیں، خواہ مخواہ کیوں اپنے آپ کو تکلیف دیتی ہیں۔

آپ کی ......

دُوسرا خط مسز ایڈوانی کے نام

محترم بہن!

تسلیمات، میں نے پچھلے دنوں آپ کو باندرہ میلے پر چند سہیلیوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ آپ نے پیلے رنگ کی جارجٹ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ لوبر ڈر کے بغیر بلاؤز کالی ساٹن کا تھا کھلے گلے کا آستینوں کے بغیر گلے پر زرد رنگ کی ساٹن کا پائپنگ تھا اور سامنے سینے پر اسی رنگ کا پھول۔ پاؤں میں آپ کے سنہری سینڈل تھی، چھاتا سیاہ رنگ کا تھا جس کی موٹھ زرد رنگ کے سیلولائیڈ کی تھی ——— کالے بالوں میں پیلا ربن تھا۔ سیاہی اور زردی کا یہ میل مجھے بہت پسند آیا تھا۔ آپ کے ذوق کی میں بے حد معترف ہوں۔ رنگوں کے صحیح احترام کا آپ خوب سلیقہ رکھتی

ہیں۔ مگر کل آپ جو لبس پر سے اُتریں تو مجھے یہ دیکھ کر سخت صدمہ ہوا کہ آپ نے کالی ساڑھی کے ساتھ بھُوسے رنگ کا بلاؤز پہن رکھا ہے۔ آپ کے بالوں میں نیلا ربن گندھا ہے۔ اور سفید کینوس کا پہن رکھا ہے

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ ایسی اعلیٰ ذوق رکھنے والی خاتون نے کیوں کر ایسے بھونڈے لباس میں باہر نکلنا گوارا کیا۔ اور پھر غضب یہ ہے۔ کہ آپ بس میں کہیں دُور گئی تھیں۔ آئندہ اگر میں نے آپ کو ایسے بے تکے لباس میں دیکھا تو مجھے اتنا صدمہ ہوگا کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔

ایک بات اور میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ کی نوکرانی اتنا سنگھار کیوں کرتی ہے۔؟ اُس کی عمر میرے اندازے کے مطابق اٹھارہ برس ہے۔ بظاہر وُہ کنواری ہے۔ اس عمر میں اور خاص کر کنوارپنے میں اُس کا یوُں بن سنور کر سودا سلف لینے باہر بازار سے نکلنا اتنا خطرناک نہیں اجتنا کہ اُس کا آپ کے گھر میں اپنے سنگھار پر توجہ دینا ہے۔ آپ عموماً گھر سے باہر نکلتی ہیں اور مسٹر ایڈوانی چونکہ دفتر نہیں جاتے اس لیئے وہ اکثر گھر ہی میں رہتے ہیں۔

آپ کی غفلت حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتی۔

میرا خیال ہے آپ کی دائیں آنکھ بائیں آنکھ سے کچھ چھوٹی ہے اگر آپ چشمہ پہنا کریں تو عیب بالکل دور ہو جائے گا۔ کیونکہ شیشوں میں سے یہ معمولی فرق نظر نہ آئے گا۔

ہاں، یہ آپ سہیلیوں کو اپنی ساڑھیاں پہننے کے لئے کیوں دے دیتی

ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ بدعت معاشرتی نقطۂ نظر سے بُری ہے اس کے علاوہ خواہ سہیلیاں کتنی ہی محتاط ہوں مستعار کپڑے کو نہایت بے دردی سے استعمال کرتی ہیں۔ اگر آپ کو یقین نہ ہو تو اُس سفید ساڑھی کو غور سے دیکھئے جو آپ نے مسز کرپلانی کو پہننے کے لئے دی تھی اس کا تِلّے کا کام کتنی جگہ سے اکھڑ گیا ہے۔

بازار میں چلتے وقت آپ بار بار ساڑھی کا پلّو نہ سنبھالا کریں۔ مجھے اس سے بڑی الجھن پیدا ہوتی ہے۔

آپ کی.......

تیسرا خط مسٹر ایوّب خان انسپکٹر پولیس کے نام

مکرمی محترمی

سلام مسنون! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ دن میں دو بار اپنی داڑھی منڈوانا چھوڑ دیں ——— میں سمجھتی ہوں کہ نارمل آدمی کی داڑھی کے بال نارمل حالت میں اتنی جلدی کبھی نہیں اُگتے پولیس اسٹیشن جاتے ہوئے اور وہاں سے شام کو آتے ہوئے آپ کا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ سیلون میں داخل ہو جائیں میرا خیال ہے کہ MANIA آپ کو ہو گیا ہے اگر آپ کا دماغی توازن درست ہے کہ تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ دن میں دو بار صبح و شام اپنی داڑھی پر اُسترا پھرائیں کیا سیلون کا نائی آپ کی اس عجیب و غریب عادت پر زیرِ لب کبھی نہیں مسکرایا؟

اور پھر یہ آپ اپنے سر کے بال کس طور سے کٹواتے ہیں ——— واللہ بہت پرانے معلوم ہوتے ہیں گردن سے لے کر کھوپری کے بالائی حصّے تک آپ بالوں کا صفایا کرا دیتے رہیں اور کانوں کے اوپر تک باریک مشین پھروا کر، آخر آپ کیا فیشن پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت آپ کی گردن بہت بھدّی ہے۔ اور آپ کے سر کے نچلے حصّے پر پھوڑوں کے نشان ہیں۔ جو صرف بال ہی چھپا سکتے ہیں اور کیا آپ نے کبھی غور فرمایا ہے کہ بار بار مونڈنے سے آپ کی گردن موٹی ہو جائے گی۔ آپ کے کان بہت بڑے ہیں جس قسم کی حجامت کا آپ کو شوق ہے اس سے یہ اور بھی زیادہ بڑے دکھائی دیتے ہیں۔ میری رائے ہے کہ آپ قلمیں رکھیں اور کانوں کے قریب سے بال نہ کٹوائیں۔ گردن پر اگر آپ تھوڑے سے بال اُگنے دیں، تو کوئی حرج نہیں۔ اس سے آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو گی۔

ہاتھ میں چھڑی لے کر جب آپ بازار میں چلتے ہیں تو دماغ میں اس خیال کو جگہ نہ دیا کریں کہ ہر اسکول کی جانے والی لڑکی آپ کو دیکھ رہی ہے۔ کسی شائستہ مزاج لڑکی کی آنکھیں آپ کی طرف نہیں اُٹھ سکتیں۔ اس لئے آپ اپنے کندھوں پر ایسا بھونڈا سر اُٹھائے پھرتے ہیں۔ جس کو آپ کے ایجاد کردہ فیشن نے اور بھی زیادہ بدنما بنا رکھا ہے۔

بار بار آپ اپنے کوٹ سے کیا جھاڑا کرتے ہیں؟ کیا گرد و غبار کے ذرّے صرف آپ ہی کے کوٹ پر آ بیٹھتے ہیں ——— یا پھر آپ حد سے زیادہ نفاست پسند ہیں۔؟

کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ چالیس برس کے ہونے پر بھی آپ کنوارے ہیں؟

اگر یہ سچ ہے تو اس سے آپ کو عبرت حاصل کرنا چاہئے۔ میرا مشورہ لیجئے۔ اور دن میں دو بار سیلون میں جاکر ڈاڑھی منڈوانا چھوڑ دیجئے۔ خدا آپ کی حالت پر رحم کرے۔

آپ کی مخلص ....

چوتھا خط مس ڈوی بلوا کے نام!

ڈیئر مس، ڈوی بلوا،

تمہاری حالت پر مجھے بہت افسوس ہوتا ہے تم روز بروز موٹی ہو رہی ہو۔ اگر تمہارا موٹاپا اسی رفتار سے بڑھتا گیا۔ تو مجھے اندیشہ ہے کہ تم کسی مرد کے قابل نہ رہو گی۔ اسکول جانے کے لئے جب تم ہرجم "پہن کر گھر سے نکلتی ہو تو میرے دل میں عجیب و غریب خیال پیدا ہونے ہیں! میں سوچتی ہوں کہ کرسمس پر تم ڈانس کس طرح کر سکو گی۔ ایک دو قدموں ہی میں تمہارا پسینہ چھوٹ جائے گا۔ اور تمہارا ساتھی کیوں کر تمہاری بانہوں کو حسب منشا حرکت میں لا سکے گا۔ تمہاری بغلوں کے نیچے گوشت اس قدر جمع ہو رہا ہے۔ کہ تم ڈانس کرنے کے بالکل قابل نہیں رہی ہو۔ خدا کے لئے اپنا علاج کرو۔ اور اس موٹاپے کو جلد از جلد ختم کرنے کی کوشش کرو۔

ایک نصیحت میری اور سن لو۔ شام کو تم ہر روز ٹیرس پر اکیلی جاتی ہو۔ اور سامنے والے مکان پر ڈی کوسٹا کے بڑے لڑکے کو اشارے کرتی رہتی ہو۔ اول تو یہ شریف لڑکیوں کا کام نہیں۔ دوسرے یہ اشارے چربی بھرے گوشت کے مانند بھدے اور بے لذت ہوتے ہیں تم جیسی موٹی لڑکیوں کو ایسی اشارہ بازی

نہیں کرنی چاہیئے۔ اس لئے کہ اشارہ ایک لطیف یعنی باریک اور پتلی چیز کا نام ہے تمہارے اشارے، اشارے نہیں ہوتے۔ اُن کے لئے مجھے کوئی اور نام تلاش کرنا ہوگا۔

جس لونڈے کے ساتھ تم رُومان لڑانا چاہتی ہو اُس کے متعلق بھی سُن لو، وہ ایک آوارہ مزاج لڑکا ہے۔ ڈھائی مہینے سے کالی کھانسی میں مبتلا ہے۔ ماں باپ نے ناقابلِ اصلاح سمجھ کر اُس کو اپنے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ اس کے پاس صرف تین پتلونیں ہیں۔ جن کو بدل بدل کر پہنتا ہے۔ ہر روز اپنی قمیص اور پتلون پر دوبارہ استری کرتا ہے۔ تاکہ باہر کے لوگوں کی نظر میں اُس کی وضعداری قائم رہے۔ مجھے ایسے آدمیوں سے نفرت ہے۔

تم اپنی پنڈلیوں کے بال اُسترے سے نہ مونڈا کرو، بال اڑانے کے سب پاؤڈر اور سب کریمیں بھی فضول ہیں۔ بال ہمیشہ کے لئے کبھی غائب نہیں ہو سکتے۔ اس لئے تم اپنی پنڈلیوں پر ظلم نہ کرو۔ بال رہنے دو۔ لمبی جرابیں پہنا کرو۔

تمہارا دوست آج دوپہر کو اپنا پھٹا ہوا جوتا خود مرمت کر رہا تھا۔

تمہاری خیر خواہ . . . .

پانچواں خط کوشلیا دیوی کے نام!

شریمتی کوشلیا دیوی۔ نمسکار!

اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے گھر میں ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ آرام دہ سے آرام دہ لباس پہنے اور تکلفات سے آزاد رہے۔

مگر دیوی جی آپ ململ کی باریک دھوتی پہن کر اس آزادی سے ناجائز فائدہ اُٹھا رہی ہیں اور پھر یہ دھوتی آپ کچھ اس بے تکلفی سے پہنتی ہیں کہ جب آپ اتفاق سے نظر آ جائیں تو سوچنا پڑتا ہے کہ آپ کو کس زاویے سے دیکھا جائے۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ روشنی کے سامنے کھڑے ہونے سے آپ کی دھوتی کا وجود ہونے نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے آپ کی عمر اس وقت چوالیس برس کے قریب ہے۔ عمر کی اس زیادتی نے آپ کے جسم کو بالکل ڈھیلا کر دیا ہے یہی وجہ ہے کہ باریک دھوتی میں سے آپ کی بھدی ٹانگوں کی نمائش آنکھوں پر "گو ہانجنی" بن کر رہ جاتی ہے۔

آپ کے فلیٹ کا دروازہ عام طور پر کھلا رہتا ہے اور میں نے اکثر آپ کو باورچی خانہ کے پاس یہی باریک دھوتی پہنے دیکھا ہے۔ اگر آپ کو اس کا استعمال ترک نہیں کرنا ہے، تو براہِ کرم اپنے فلیٹ کا دروازہ بند رکھا کریں۔

آپ کی . . . .

چوتھا خط مسٹر سعید حسین جرنلسٹ کے نام۔!

جنابِ من تسلیم۔!

آپ ہر روز صبح بالکونی میں پتلون پہنتے ہیں۔ آپ کا یہ فعل کمیونزم کی بدترین مثال ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ خط آپ پڑھ کر ضرور شرمسار ہوں گے اور آئندہ سے پتلون شریف آدمیوں کی طرح اپنے کمرے میں پہنا کریں گے۔

مخلص ـــــــ"

مکرر۔ آپ کے بال بہت بڑھ گئے ہیں بیلون آپ کے مکان کے نیچے ہے ہمت کر کے آج ہی کٹوا دیں۔

آپ کی ہمدرد ....

ساتواں خط مسز قاسمی کے نام!

خاتون مکرم

السلام علیکم:۔!

میں بہت عرصہ سے آپ کو خط لکھنے کا ارادہ کر رہی ہوں۔ مگر چند در چند وجوہ کے باعث ایسا نہ کر سکی۔ میں نے سنا ہے کہ دو گھروں میں نفاق پیدا کرنے کے لئے آپ کو بہت سے گر زبانی یاد ہیں۔ مسز ایڈوانی اور مسز کرپلانی کے درمیان ایک دفعہ آپ ہی کی کوششوں سے رنجش پیدا ہوئی تھی۔ اور پچھلے دنوں سیٹھ گوپال داس کی پتنی کے بارے میں آپ نے جو افواہیں مشہور کی تھیں، اُن سے سیٹھ گوپال داس اور رام داس کے خاندان میں اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ مجھے آپ کی صلاحیتوں کا اعتراف ہے۔ مگر میں سوچتی ہوں کہ ابھی تک آپ کے اور مسز قانون گو کے درمیان کشیدگی پیدا کیوں نہیں ہوتی۔ اب تک آپ نے جس عورت کو اپنی سہیلی بنایا ہے۔ اس سے تیسرے چوتھے مہینے آپ کی تُو تُو، مَیں مَیں ضرور ہوتی ہے۔ لیکن مسز قانون گو سے

آپ کی دوستی کو چھ مہینے ہو گئے ہیں جو کئی برسوں کے برابر ہیں۔ میں اب زیادہ دیر تک انتظار نہیں کر سکتی اس مہینے میں مسز قانون گو سے آپ کی چخ مخ ضرور ہو جانی چاہیئے۔ آپ کو اپنی روایات برقرار رکھنی چاہیئیں۔

ہاں یہ ضرور بتائیے کہ آپ کہاں پیدا ہوئی تھیں۔ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ آپ پنجاب کی رہنے والی ہیں۔ مگر آپ کا چہرہ نیپالیوں اور تبتیوں سے کیوں ملتا جلتا ہے۔ آپ کی ناک بالکل نیپالیوں کی طرح چپٹی ہے۔ اور گالوں کی ہڈیاں بھی انہی کی طرح اُبھری ہوئی ہیں۔ البتہ آپ کا قد اُن کی طرح پست نہیں۔

آپ نے عید پر جو ساڑھی پہنی تھی مجھے پسند نہ آئی۔ آپ کا ذوق نہایت فضول ہے۔ اگر آپ بھڑکیلے اور شوخ رنگوں کے بجائے ہلکے رنگ کے کپڑے انتخاب کیا کریں تو بہت اچھا ہے۔ لمبے قد کی عورتوں کو کھڑی لکیروں کی قمیض نہیں پہننی چاہیئے۔ اس سے وہ اور لمبی ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح آپ کو لیف سلیوز کا بلاؤز نہیں پہننا چاہیئے کیونکہ لمبے قد کی عورتوں کے لئے یہ موزوں نہیں ہوتا اور پھر آپ تو ویسے ہی دبلی پتلی ہیں آپ کے کاندھے پر بلاؤز کے اُٹھے ہوئے "لیف" بہت بُرے معلوم ہوتے ہیں۔

آپ کی خیر اندیش......

آٹھواں خط مس راجکماری کے نام

مس راجکماری۔

مجھے تم سے نفرت ہے۔ تم عورت نہیں سوٹ کیس ہو۔

تم سے نفرت کرنے والی ——

نواں خط مسٹر صالح بھائی کنٹریکیٹر کے نام!

جناب صالح صاحب۔ تسلیم۔!

مجھے آپ سے شکایت نہیں لیکن پھر بھی میں آپ کو پسند نہیں کرتی۔ نہ معلوم کیا وجہ ہے کہ آپ کو دیکھ کر میرے دل میں غیظ و غضب پیدا ہو جاتا ہے آپ بہت شریف آدمی ہیں۔ آپ کی شکل و صورت بھی کوئی بُری نہیں لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر آپ کو میں ناپسندیدگی کی نگاہ سے کیوں دیکھتی ہوں۔

آپ کے چہرے پر یتیمی برستی ہے۔ آپ کی چال بھی نہایت واہیات ہے۔

آپ کی ہمدرد......

دسواں خط مس رضیہ صلاح الدین کے نام۔!

ڈیر مس رضیہ۔ سلام مسنون!

تم ابھی ابھی پنجاب کے کسی گاؤں سے آئی ہو۔ پہلے ساڑھی پہننے کی عادت اختیار کرو پھر اس لباس میں باہر نکلو۔ تمہیں یہ لباس پہننے کا بالکل سلیقہ نہیں ہے۔ خدا کے لئے اپنے آپ کو تماشا نہ بناؤ۔

تمہاری خیر خواہ.........

مصری کی ڈلی

پچھلے دنوں میری رُوح اور میرا جسم دونوں علیل تھے۔ رُوح اس لئے کہ میں نے دفعتاً اپنے ماحول کی خوفناک ویرانی کو محسوس کیا تھا۔ اور جسم اس لئے کہ میرے تمام پٹھے سردی لگ جانے کے باعث چوبی تختے کے مانند اکڑ گئے تھے۔ دس دن تک میں اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹا رہا ـــ پلنگ ـــ اس چیز کو پلنگ ہی سمجھ لیجئے۔ جو لکڑی کے چار بڑے پاؤں، پندرہ بیس چوبی ڈنڈوں اور ڈیڑھ دو سو من وزنی مستطیل آہنی چادر پر مشتمل ہے لوہے کی یہ بھاری بھرکم چادر، نواڑ اور سُوتلی کا کام دیتی ہے، اس پلنگ کا یہ فائدہ ہے کہ کھٹمل دُور رہتے ہیں۔ اور یُوں بھی کافی مضبوط ہے یعنی صدیوں تک قائم رہ سکتا ہے۔

یہ پلنگ میرے پڑوسی سلیم صاحب کا عنایت کردہ ہے۔ میں زمین پر سوتا تھا چنانچہ انہوں نے جو پلنگ انہیں کے کمرے کے ساتھ ملا تھا مجھے

دے دیتا تاکہ میں سخت فرش پر سونے کے بجائے لوہے کی چادر پر آرام کروں۔ سلیم صاحب اور اُن کی بیوی کو میرا بہت خیال ہے اور میں اُن کا بہت ممنون ہوں۔ اگر میں معمولی سے معمولی چارپائی بھی بازار سے لیتا تو کم از کم چار پانچ روپے خرچ ہو جاتے۔

خیر، چھوڑیئے اس قصّے کو، میں یہ بات کر رہا تھا کہ پچھلے دنوں میری رُوح اور میرا جسم دونوں علیل تھے۔ دس دن اور دس راتیں میں نے ایسے خلا میں بسر کیں جس کی تفصیل بیان ہی نہیں کر سکتا۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں ہونے اور نہ ہونے کے بیچ میں کہیں لٹکا ہوں۔ لوہے کے پلنگ پر لیٹے لیٹے یوں بھی میرا جسم بھی شل ہو گیا تھا۔ دماغ ویسے بھی منجمد تھا۔ جیسے یہ کبھی تھا ہی نہیں میں کیا عرض کروں، میری کیا حالت تھی۔

دس دن اُس ہیبتناک خلا میں رہنے کے بعد میرے جسم کی علالت دُور ہو گئی۔

دس بجے کا عمل تھا۔ دھوپ سامنے کارخانے کی بلند چمنی سے پہلو بچاتی کمرے کے فرش پر لیٹ رہی تھی۔ میں لوہے کے پلنگ پر سے اٹھا تھکے ہوئے جسم میں انگڑائی سے حرکت پیدا کرنے کی کوشش کے بعد جب میں نے کمرے کی طرف نظر دوڑائی تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کمرہ وہ نہیں تھا جو پہلے ہوا کرتا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ دائیں ہاتھ کونے میں ڈریسنگ ٹیبل تھی اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسا میز ہمارے کمرے میں ہوا کرتا تھا۔ مگر اس کا پالش اتنا چمکیلا نہیں تھا۔ اور بناوٹ کے اعتبار سے بھی اُس میں اتنی خوبیاں میں نے

نہیں دیکھی تھیں۔ کمرے کے وسط میں جو بڑا میز پڑا رہتا تھا وہ بھی مجھے نامانوس معلوم ہوا۔ اس کا بالائی ہشت پہلو تختہ چمک رہا تھا۔ دیوار پر پانچ چھ تصویریں آویزاں تھیں۔ جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔

ان میں سے ایک تصویر میری نگاہ میں جم گئی۔ میں بڑھا اور اس کے قریب سے دیکھا۔ جدید فوٹوگرافی کا نمونہ تھا۔ ہلکے بھوسے رنگ کے کاغذ پر ایک جواں سال لڑکی کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ بال کٹے ہوتے تھے اور کانوں پر سے ادھر کو اڑ رہے تھے۔ سینہ سامنے سے ناف کے ننھے سے دباؤ تک ننگا۔ اس نرم و نازک عریاں کو اس کی گوری باہیں جو اس کے چہرے تک اٹھی ہوئی تھیں چھپانے کی دلچسپ کوشش کر رہی تھیں۔ پتلی پتلی، لمبے لمبے ناخنوں والی انگلیوں میں سے چہرے کی حیا چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔ کہنیوں نے ننھے سے پیٹ کے اختتامی خط پر آپس میں جڑ کر ایک دلکش تکون بنا دی تھی۔ جس میں سے ناف کا گدا گدا گڑھا جھانک رہا تھا۔ اگر اس چھوٹے سے گڑھے میں ڈنڈی گاڑ دی جاتی تو اس کا پیٹ سیب کا بالائی حصہ بن جاتا۔

میں دیر تک اس نیم عریاں و نیم مستور شباب کو دیکھتا رہا۔ مجھے حیرت تھی کہ یہ تصویر کہاں سے آ گئی۔ اسی حیرت میں غرق۔ میں غسل خانے کی طرف بڑھا۔ کمرے کے چوتھے کونے میں نل کے نیچے فرش پر سل لگی ہوئی ہے۔ اس کے ایک طرف چھوٹی سی منڈیر بنا دی گئی ہے۔ یہ جگہ جہاں جست کی بالٹی، صابن دانی، دانتوں کے دو برش۔ داڑھی مونڈنے کے دو استرے، صابن لگانے کی دو کوچیاں ——— منجن کی بوتل اور پانچ چھ استعمال شدہ زنگ آلودہ

بلیڈ پڑے رہتے ہیں۔ ہمارا غسل خانہ ہے۔ نذیر صاحب جن کا یہ کمرہ ہے علی الصبح بیدار ہونے کے عادی ہیں۔ چنانچہ داڑھی مونڈ کر وہ فوراً ہی غسلخانے سے فارغ ہو جاتے ہیں میں سویا رہتا ہوں اور وہ مزے سے ننگے نہاتے رہتے ہیں اس غسل خانے کی طرف جاتے ہوئے میں نے ایک بار پھر تمام چیزوں پر نظر دوڑائی۔ اب مجھے وہ کسی قدر مانوس معلوم ہوئیں۔ منڈیر پر میرا اُسترا اور گھِسا ہوا بُرش اسی طرح پڑا تھا جس طرح میں ہر روز دیکھا کرتا تھا۔ بالٹی بھی پلاسٹک کی شُبہ دُھی تھی جو ہر روز نگاہوں کے سامنے آتی تھی۔ اُس میں ڈونگا بھی وہی تھا۔ جس میں جا بجا گڑھوں میں میل جما رہتا تھا۔

منڈیر پر بیٹھ کر جب میں نے بُرش سے دانت گھِسنے شروع کئے۔ تو میں نے سوچا کہ کمرہ وہی ہے۔ جس میں ایک سو بیس راتیں میں گزار چکا ہوں۔ راتیں میں نے غور کیا ــــــــ معاملہ صاف ہو گیا۔ کمرے اور اُس کی اشیا کے نامانوس ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ میں نے اس میں صرف ایک سو بیس راتیں ہی گزاری تھیں۔ صبح سات یا آٹھ بجے جلدی جلدی کپڑے بدل کر جو میں ایک دفعہ باہر نکل جاتا تو پھر رات کو گیارہ بجے کے قریب ہی لوٹنا ہوتا تھا۔ اس صورت میں یہ کیونکر ممکن تھا۔ کہ مجھے کمرے کی ساخت اور اُس پر پڑی ہوئی چیزوں کو دیکھنے کا موقعہ ملتا اور پھر نہ کمرہ میرا ہے اور نہ اس کی کوئی چیز میری ملکیت ہے۔ اور یہ بھی تو سچی بات ہے کہ بڑے شہر انسانیت کے مرقد و مدفن ہوتے ہیں۔

میں جس ماحول میں چار مہینے سے زندگی بسر کر رہا ہوں اس قدر یکساں

اور ایک آہنگ ہے کہ طبیعت ہار ہار کر اُکتا گئی ہے۔ جی چاہتا کہ شہر چھوڑ کر کسی ویرانے میں چلا جاؤں۔ صبح جلدی جلدی نہانا۔ پھر عجلت میں کپڑے پہن کر دفتر میں کاغذ کالے کرتے رہنا۔ ہاں وہاں سے شام کو فارغ ہو کر ایک اور دفتر میں چھ سات گھنٹے اُسی اُکتا دینے والے کام میں مصروف رہنا اور رات کے گیارہ بارہ بجے اندھیرے ہی میں کپڑے اُتار کر سلیم کے دیئے ہوئے پلنگ پر سونے کی کوشش کرنا ——— کیا یہ زندگی ہے۔؟

زندگی کیا ہے؟ ——— یہ بھی میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ اُونی جراب ہے جس کے دھاگے کا ایک سرا ہمارے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے۔ ہم اس جراب کو ادھیڑتے رہتے ہیں۔ جب ادھیڑتے ادھیڑتے دھاگے کا دوسرا سرا ہمارے ہاتھ میں آ جائے گا تو یہ طلسم جسے زندگی کہا جاتا ہے ٹوٹ جائے گا۔

جب زندگی کے لمحات کٹتے محسوس ہوں اور حافظے کی تختی پر کچھ نقش چھوڑ جائیں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ آدمی زندہ ہے اور اگر مہینوں گزر جائیں اور یہ محسوس تک نہ ہو کہ مہینے گزر گئے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی حسیات مُردہ ہو گئی ہیں زندگی کی کتاب میں اگر اُوپر تلے خالی اوراق ہی شامل ہوتے چلے جائیں تو کتنا دُکھ ہوتا ہے، دوسروں کو بھی اس کا احساس ہوتا ہے یا کہ نہیں اس کی بابت میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن میں تو اس معاملے میں بہت حسّاس ہوں زندگی کی یہ خالی کاپی جو ہمارے ہاتھ میں تھمائی گئی ہے آخر اسی لئے تو ہے۔ کہ اُس کے ہر ورق کو ہم استعمال کریں۔ اس پر کچھ لکھیں۔ لیکن افسوس اُس

بات کا ہے کہ مجھے کوئی ایسی بات ہی نہیں ملتی جس کے متعلق میں کچھ لکھوں۔ لے دے کر میری اس کاپی میں صرف دو تین ورق ایسے ہیں جن پر میں نقش و نگار بنے دیکھتا ہوں۔ یہ ورق مجھے کتنے عزیز ہیں۔ اگر آپ ان کو نوچ کر باہر نکال دیں تو میری زندگی ایک بیابان بن جائے گی۔ آپ یقین کیجئے، میری زندگی واقعی چٹیل میدان کی طرح ہے جس میں ان بیتے ہوئے دنوں کی یہ سہانی یاد ایک خوبصورت قبر کی طرح لیٹی ہوئی ہے۔ چونکہ میں نہیں چاہتا کہ اچھے دنوں کی یہ سہانی رات مٹ جائے۔ اس لئے میں اس قبر پہ ہر وقت مٹی کا لیپ کرتا ہوں۔

میرے سامنے دیوار پر ایک پرانا کیلنڈر لٹک رہا ہے جس کے میلے کاغذ پہ چیڑ کے لانبے لانبے درختوں کی تصویر چھپی ہے میں ایک عرصہ سے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہوں اس کے پیچھے دور بہت دور مجھے اپنی زندگی کے کھوتے ہوئے ٹکڑے کی جھلک نظر آ رہی ہے۔

میں ایک پہاڑی کے دامن میں پیڑوں کی چھاؤں میں بیٹھا ہوں۔ بگو بڑے بھولے پن سے گھٹنے ٹیک کر اپنا سر میرے قریب لاتی ہے اور کہتی ہے آپ مانتے ہی نہیں —— سچ میں بوڑھی ہو گئی ہوں اب بھی یقین نہ آئے گا۔ لیجئے میرے سر میں بال سفید دیکھ لیجئے۔

چودہ برس کی دیہاتی فضا میں پلی ہوئی جوان لڑکی مجھ سے کہہ رہی تھی کہ میں بوڑھی ہو گئی ہوں معلوم نہیں کہ وہ کیوں اس بات پہ زور دینا چاہتی تھی اس سے پہلے بھی وہ کئی مرتبہ مجھ سے یہ بات کہہ چکی تھی۔ میرا خیال ہے کہ جوان آدمی کو شباب کے دائرے سے نکل کر بڑھاپے کے دائرے میں داخل

ہونے کی بڑی خواہش ہوتی ہے یہ میں اس لئے کہتا ہوں کہ میرے دل میں بھی اس قسم کی خواہش کئی بار پیدا ہو چکی ہے۔ میں نے متعدد بار سوچا ہے۔ کہ میری کنپٹیوں پر اگر سفید بال نمودار ہو جائیں تو چہرے کی متانت اور سنجیدگی میں اضافہ ہو جائے گا۔ کنپٹیوں پر اگر سفید بال ہو جائیں تو چاندی کے مہین تاروں کی طرح چمکتے ہیں۔ اور دوسرے سیاہ بالوں کے درمیان بھلے دکھائی دیتے ہیں۔ ممکن ہے کہ بیگو کو بھی چاؤ ہو کہ اُس کے بال سفید ہو جائیں اور وہ اپنی کم عمری کے باوجود بڑھی دکھائی دے۔

میں نے اس کے خشک مگر نرم بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنا شروع کی اور کہا "تم بوڑھی نہیں ہو سکتیں۔"

اُس نے سر اُٹھا کر مجھ سے پوچھا "کیوں؟" ———— میں کیوں بوڑھی نہیں ہو سکتی۔"

اس لئے کہ تم میں آس پاس کے درختوں، پہاڑوں اور اُن میں بہنے ہوئے نالوں کی ساری جوانی جذب ہو گئی ہے۔

وہ قریب سے قریب سرک آئی اور کہنے لگی۔ "جانے آپ کیا کیا اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہیں۔ بھئی میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آیا۔" درختوں اور پہاڑوں کی بھی جوانی ہوتی ہے؟

تمہاری سمجھ میں آئے نہ آئے پر میں نے تو جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا۔"

"بہت اچھا کیا آپ نے ———— پر آپ میرے بالوں میں اس طرح کرتے رہیں۔" بیگو نے اپنے ہاتھ سے سر کو کھجلاتے ہوئے کہا۔ مجھے بڑا مزہ

آتا ہے۔"

"بہت اچھا جناب" کہہ کر میں نے انگلیوں سے اُس کے بالوں میں کنگھی کرنا شروع کر دی اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کو مزہ آ ہی رہا تھا، مجھے خود ہی مزہ آنے لگا۔ میں یہ کرنے لگا کہ اس کے بال میرے اُلجھے ہوئے خیال ہیں، جن کو میں اپنے ذہن کی انگلیوں سے ٹٹول رہا ہوں۔"

دیر تک اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے لیٹی رہی۔ پھر اُس نے اپنی خمار آلود نگاہیں میری طرف اٹھائیں اور نیند میں بھیگی ہوئی آواز میں کہا "میں اگر سو گئی تو؟"

"میں جاگتا رہوں گا۔"

نیم خوابیدہ مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر پیدا ہوئی اور وہ زمین پر ہی میرے سامنے لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد نیند نے اُس کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

بیگو سو رہی تھی مگر اُس کی جوانی جاگ رہی تھی۔ جس طرح سمندر کی پُرسکون سطح کے نیچے گرم لہریں دوڑتی رہتی ہیں۔ بائیں بازو کو سر کے نیچے رکھے اور ٹانگوں کو اکٹھا کیے وہ سو رہی تھی۔ اُس کا ایک بازو میری جانب سرکا ہوا تھا میں اُس کی پتلی انگلیوں کی مخروطی تراش دیکھ رہا تھا کہ اُن میں خفیف سی کپکپاہٹ پیدا ہوئی۔ جیسے مٹر کی پھلیاں ارتعاش پذیر ہو جائیں۔ یہ ارتعاش اُس کی انگلیوں سے شروع ہو کر اُس کے سارے جسم پر پھیل گئی۔ جس طرح تالاب میں پھینکی ہوئی کنکری اُس کی آبی سطح پر چھوٹا سا بھنور

پیدا کرتی ہے۔ اور یہ بصورتِ دائرے بناتا ہوا پھیلتا جاتا ہے اُسی طرح وہ کپکپاہٹ اُس کی اُنگلیوں سے شروع ہو کر اُس کے سارے جسم پر پھیل گئی۔ نہ جانے اُس کی جوانی کیسے ارتعاش پیدا کرنے والے خواب دیکھ رہی تھی۔

اُس کے نچلے ہونٹ کے کونوں میں خفیف سی تھرتھراہٹ کبھی کبھی معلوم ہوتی تھی۔ اُس کے سینے کے اُبھار میں دل کی دھڑکنیں زندگی پیدا کر رہی تھیں۔ گریبان کے نچلے دو بٹن کھلے تھے۔ اس طرح جسم سے تھوڑی سی نقاب اُٹھ گئی تھی اور دو نہایت ہی پیاری قوسیں باہر جھانک رہی تھیں سینے کی ننھی سی وادی میں دونوں طرف کے اُبھار بڑی خوبصورتی سے آپس میں گھُل مل گئے تھے۔

میری نگاہ اُس کے سینے پر کُرتے کی ایک طرف بنی ہوئی جیب پر ڈوب گئی۔ اس میں خدا معلوم کیا کچھ بگو نے ٹھونس رکھا تھا کہ وہ ایک گیند سی بن گئی تھی۔

میرے دل میں دفعتہً یہ معلوم کرنے کا اشتیاق پیدا ہوا کہ اس میں کیا کیا چیزیں ہیں آہستہ سے اُس کی جیب کی تلاشی لینے کا ارادہ جب میں نے کیا تو وہ جاگ پڑی۔ سیدھی لیٹ کر اُس نے دھیرے دھیرے اپنی آنکھیں کھولیں لمبی لمبی پلکیں جو آپس میں ملی ہوئی تھیں تھرتھرائیں۔ اُس نے نیم باز آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ پھر اُس کے ہونٹوں پر ہلکے سے تبسم نے انگڑائی لی۔ اور کہا آپ بڑے وہ ہیں؟

"کیوں میں نے کیا کیا ہے؟"

وہ اُٹھ بیٹھی۔" ابھی آپ نے کچھ کیا ہی نہیں۔ میں سچ مچ سو گئی اور آپ

نے جگانے تک کی تکلیف نہ کی۔ میں اگر ایسے ہی شام تک سوئی رہتی تو؟ اُس نے آنکھوں کی پتلیاں نچائیں اور دفعتہً کچھ یاد کر کے کہا۔ ہائے میرے اللہ میں اپنی جان ہیر کو بھول ہی گئی"!

سامنے پہاڑی پر اُگی ہوئی سبز جھاڑیوں کی طرف جب اُس نے دیکھا۔ تو اطمینان کا سانس لے کر کہنے لگی۔ کتنی اچھی ہے میری ہیر"!

اُس کو اپنی بھینس کی فکر تھی۔ جو ہمارے سامنے پہاڑی پر گھاس چر رہی تھی۔

میں نے اُس سے پوچھا" تمہاری ہیر تو موجود ہے پر رانجھا کہاں ہے ؟

"رانجھا"! اس کے لب مسکراہٹ کے ساتھ کھلے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس نے مجھے کچھ بتانے کی کوشش کی۔ اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔" رانجھا" رانجھا ——— رانجھا"۔ اُس نے یہ لفظ کئی مرتبہ دہرایا۔" میری ہیر کا رانجھا ——— مجھے کیا معلوم نگوڑا کہاں ہے ؟"

میں نے کہا۔" تمہاری ہیر کا کوئی نہ کوئی رانجھا تو ضرور ہو گا۔ مجھ سے چھپانا چاہتی ہو تو یہ الگ بات ہے۔"

"اس میں چھپانے کی بات ہی کیا ہے"! بیگو نے آنکھیں مٹکا کر کہا۔" اور اگر کوئی ہے تو ہیر کو معلوم ہو گا۔ چاہے اُس سے پوچھ لیجئے۔ پر کان میں کہیئے گا۔ اور آہستہ سے کہئے گا۔ بتاؤ تمہارا رانجھا کہاں ہے۔؟"

"میں نے پوچھ لیا"!

"کیا جواب ملا۔؟

"بولی بگو سے پوچھ لو۔ وہی سب کچھ جانتی ہے۔"

"جھوٹ —— جھوٹ۔ اس کا اول جھوٹ۔ اس کا آخر جھوٹ۔ بگو بچوں کی طرح اچھل اچھل کر کہنے لگی۔" میری ہیر تو بڑی شرمیلی ہے ایسے سوالوں کا وہ کبھی جواب دے ہی نہیں سکتی۔ آپ جھوٹ بولتے ہیں، اس نے تو آپ کو غصے میں کہا تھا، چلو ہٹو، کنواریوں سے ایسی باتیں کرتے تمہیں شرم تو نہیں آتی۔"

یہی کہا تھا اور اس کا جواب اس کو یوں ملا تھا۔ یہ تمہارا اتنا بڑا بچھڑا کہاں سے آگیا ہے۔ کیا آسمان سے ٹپک پڑا تھا؟"

بگو یہ بچھڑے والی بات سن کر لاجواب ہو گئی۔ مگر وہ چونکہ لاجواب ہونا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے اس نے بیکار چلانا شروع کر دیا۔" جی ہاں آسمان ہی سے ٹپکا تھا۔ اور سب چیزیں آسمان ہی سے تو آتی ہیں —— نہیں میں بھولی —— اس بچھڑے کو تو میری ہیر نے گود لیا ہے۔ یہ اس کا بچہ نہیں، کسی اور کا ہے —— اب بتلایئے آپ کے پاس کیا جواب ہے؟"

میں نے ہار مان لی۔ اس لئے کہ میری نگاہیں پھر اس کی ابھری ہوئی جیب پر پڑیں۔ جس میں خدا معلوم کیا کچھ ٹھونسا ہوا تھا —— میں ہار گیا —— آپ کی ہیر کنواری ہے۔

دنیا کی سب بھینسیں اور گائیں کنواریاں ہیں۔ میں کنوارا ہوں، آپ کنواری ہیں۔ لیکن یہ بتلایئے کہ آپ کی اس کنواری جیب کو کیا ہو گیا ہے۔؟"

اس نے اپنی پھولی ہوئی جیب دیکھی تو دانتوں میں انگلی دبا کر میری طرف

ملامت بھری نظروں سے دیکھ کر کہا " آپ کو شرم نہیں آتی —— کیا ہوا ہے میری جیب کو، میری چیزیں پڑی ہیں اس میں!

" چیزیں —— اس سے تمہارا مطلب ؟"

" آپ تو بال کی کھال نکالتے ہیں۔ چیزیں پڑی ہیں میرے کام کی " اور کیا میں نے پتھر ڈال رکھے ہیں۔

" تو جیب میں تمہارے کام کی چیزیں پڑی ہیں۔ میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ کام کی چیزیں کیا ہیں ؟"

" آپ ہرگز نہیں پوچھ سکتے۔ اگر آپ پوچھیں بھی تو میں نہیں بتاؤں گی۔ اس واسطے کہ آپ نے مجھے اپنے چمڑے کے تھیلے کی چیزیں کب دکھائی ہیں۔ میں اگر آپ سے کہوں بھی تو آپ کبھی نہ دکھائیں گے۔"

" میں ایک ایک چیز کر کے دکھانے کے لئے تیار ہوں۔"

—— یہ رہا تھیلا —— میں نے اپنا چرمی تھیلا اس کے سامنے رکھ دیا۔" خود کھول کر دیکھ لو۔ مگر یاد رہے کہ مجھے اپنی جیب کی سب چیزیں تمہیں دکھانی پڑیں گی۔"

" پہلے میں اس تھیلے کی تلاشی تو لے لوں۔" یہ کہہ کر اس نے میرا تھیلا کھولا۔ اور اس کی سب چیزیں ایک ایک کر کے باہر نکالنا شروع کر دیں۔ انگریزی کا ایک ناول۔ کاغذوں کا پیڈ، دو پنسلیں، ایک ربڑ، دس بارہ لفافے اور آٹھ آنے والے سٹیمپ۔ خالی لفافہ اور لکھے ہوئے کاغذوں کا ایک پلندہ —— یہ میری کیا چیزیں تھیں۔"

جب وہ ایک ایک چیز اچھی طرح دیکھ چکی تو میں نے اُس سے کہا "اب اپنی جیب کا منہ ادھر کر دیجئے"

اُس نے میری بات کا جواب نہ دیا۔ تھیلے کی تمام چیزیں رکھنے کے بعد اس نے تحکمانہ لہجہ میں کہا "اب اپنی جیب دکھایئے۔

میں نے اپنی جیب کا منہ کھول دیا۔ اُس نے ہاتھ ڈال کر اُس میں جو کچھ بھی تھا، باہر نکال لیا۔ ایک بٹوا، اور چابیوں کا گچھا تھا جس میں چھوٹا سا چاقو بھی شامل تھا۔ یہ چاقو گچھے میں سے نکال کر اُس نے ایک طرف زمین پر رکھ دیا۔ اور باقی چیزیں مجھے واپس دیدیں، یہ چاقو میں نے لے لیا ہے، کھیرے کاٹنے کے کام آئے گا۔

لے لو، پر مجھے ٹالنے کی کوشش نہ کرو ـــــ" میں جب تک تمہاری جیب کی ایک ایک چیز نہ دیکھ لوں۔ چھوڑوں گا نہیں"

"اگر میں نہ دکھاؤں تو؟"

"لڑائی ہو جائے گی"

"ہو جائے ـــــ میں ڈر تھوڑی جاؤں گی" یہ کہہ کر فوراً ہی اپنے دوپٹے کا تنبو بنا کر اس میں چھپ گئی اور جیب میں سے کچھ نکالنے لگی۔ اس پر میں نے رعب دار آواز میں کہا "دیکھو یہ بات ٹھیک نہیں تم کچھ چھپا رہی ہو"

آپ مان لیجئے۔ میں سب کچھ دکھا دوں گی ـــــ اللہ کی قسم سب چیزیں ایک ایک کر کے دکھا دوں گی ـــــ یہ تو میں اپنے من سمجھوتے کے لئے کچھ کر رہی ہوں"

میں نے پھر رعب دار آواز میں کہا "کیا کر رہی ہو۔ میں تمہاری سب چالاکیاں سمجھتا ہوں۔ سیدھے من سے تمام چیزیں دکھا دو، ورنہ میں زبردستی سب کچھ دیکھ لوں گا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ دوپٹے سے باہر نکل آئی اور آگے بڑھ کر کہنے لگی،

"دیکھ لیجئے!"

میں اُس کی جیب میں ہاتھ ڈالنے ہی والا تھا کہ اُس کے تنے ہوئے سینے کو دیکھ کر رُک گیا —— تم خود ہی ایک ایک چیز نکال کر مجھے دکھاتی جاؤ —— تو اتنا لحاظ میں تمہارا کئے دیتا ہوں۔ یوں تمہاری ایمانداری بھی معلوم ہو جائے گی۔

"نہیں آپ خود نکالتے جایئے۔ بعد میں آپ کہیں گے کہ میں نے سب چیزیں نہیں دکھائیں!"

"میں دیکھ جو رہا ہوں۔ تم نکالتی جاؤ!"

"جیسے آپ کی مرضی" یہ کہہ کر اُس نے آہستہ سے اپنی جیب میں دو اُنگلیاں ڈالیں اور سُرخ رنگ کے ریشمیں کپڑے کا ایک ٹکڑا باہر نکالا۔ اس پر میں نے پوچھا۔ کپڑے کا یہ بیکار سا ٹکڑا تم ساتھ ساتھ کیوں لئے پھرتی ہو؟

"جی آپ کو کیا معلوم۔ یہ بہت بڑھیا کپڑا ہے، میں اس کا رُومال بناؤں گی جب بن جائے گا تو پھر آپ دیکھئے گا۔ جی ہاں!" یہ کہہ کر اُس نے کپڑے کا ٹکڑا اپنی جھولی میں رکھ لیا۔ پھر جیب سے کچھ نکالا اور بند مٹھی میرے بہت قریب لا کر کھول دی۔ سیلولائیڈ کے تین مستعمل کلپ، ایک چابی اور سیپ کے

دو بٹن اُس کی ہتھیلی پر مجھے نظر آتے۔!

میں نے اُس سے کہا۔ یہ اپنی جھولی میں رکھ لو اور باقی چیزیں جلدی جلدی نکالو۔"

اس نے جیب میں جلدی جلدی ہاتھ ڈال کر باری باری یہ چیزیں باہر نکالیں۔ سفید دھاگے کی گولی اس میں پھنسی ہوئی زنگ آلود سوئی۔ لکڑی کی میلی کچیلی کنگھی، چھوٹا سا آئینہ اور ایک پیسہ :

میں نے اُس سے پوچھا " کوئی اور چیز باقی تو نہیں رہی ؟"

"جی نہیں"۔ اُس نے اپنے سر کو جنبش دی۔ سب چیزیں آپ کے سامنے رکھدی ہیں۔ اب کوئی باقی نہیں رہی۔

"غلط" میں نے اپنا لہجہ بدل کر کہا" تم جھوٹ بولتی ہو۔ جھوٹ بھی ایسا بولتی ہو جو بالکل کچا ہو۔ ابھی ایک چیز باقی ہے۔" جونہی یہ لفظ میرے مُنہ سے نکلے بغیر ارادی طور پر اُس کی نگاہیں یک لخت اپنے دوپٹے کی طرف مُڑیں۔ میں نے تاڑ لیا کہ اس نے کچھ چھپا رکھا ہے۔" بگو سیدھے من سے مجھے یہ چیز دو جو تم نے چھپائی ہے۔ ورنہ یاد رکھو۔ وہ تنگ کروں گا کہ عمر بھر یاد رکھو گی۔ گدگدی ایسی چیز ہے کہ ——"

گدگدی کے تصور ہی نے اُس کے جسم کو اکٹھا کر دیا۔ وہ سُکڑ سی گئی اس پر میں نے ہوا میں اپنے ہاتھوں کی اُنگلیاں نچائیں۔ یہ اُنگلیاں ایسی گدگدی کر سکتی ہیں کہ جناب کو پہروں بھی ہوش نہ آئے گا۔"

وہ کچھ اس طرح سمٹی جیسے کسی نے بلندی سے ریشمی کپڑے کا تھان

کھول کر نیچے پھینک دیا ہے! ہئیں، نہیں...... خدا کے لئے کہیں ایسا بھی نہ کر دیجئے گا ——— میں مر جاؤں گی!"

جب میں سچ مچ اپنے ہاتھ اُس کے کندھوں تک لے گیا تو وہ بے تحاشہ چیختی، ہنستی اور سمٹتی، سمٹاتی اُٹھی اور بھاگ گئی ——— دوپٹے میں سے کوئی چیز گری اور جو میں نے دوڑ کر اُٹھالی ———. مصری کی ایک ڈلی تھی جو وہ مجھ سے چھپا رہی تھی ——— جانے کیوں؟

ماتمی جلسہ

رات رات میں یہ خبر شہر کے اُس کونے تک پھیل گئی کہ اتاترک کمال مر گیا ریڈیو کی تھرتھرائی زبان سے یہ سنسنی پھیلانے والی خبر ایرانی ہوٹلوں میں سٹے بازوں نے سُنی جو چائے کی پیالیاں سامنے رکھے آنے والے نمبر کے بارے میں قیاس دوڑا رہے تھے اور وہ سب کچھ بھول کر کمال اتاترک کی بڑائی میں گم ہو گئے۔

”ہوٹل میں سفید پتھر والے میز کے پاس بیٹھے ہوئے ایک سٹوری نے اپنے ساتھی سے یہ خبر سُن کر لرزاں آواز میں کہا۔“ مصطفےٰ کمال مر گیا۔!“

اُس کے ہاتھ سے چائے کی پیالی گرتے گرتے بچی۔“ کیا کہا۔ مصطفےٰ کمال مر گیا۔

اس سے دونوں میں اتاترک کمال کے متعلق بات چیت شروع ہو گئی ایک دوسرے سے کہا۔ افسوس کی بات ہے۔ اب ہندوستان کا کیا ہو گا۔

ہیں نے سُنا تھا یہ مصطفےٰ کمال یہاں حملہ کرنے والا ہے ـــــــ ہم آزاد ہو جاتے مسلمان قوم آگے بڑھ جاتی ـــــــ افسوس تقدیر کے ساتھ کسی کی پیش نہیں چلتی!

دوسرے نے جب یہ بات سُنی تو اُس کے رونگٹے بدن پر چیونٹیوں کے مانند سرکنے لگے۔ اس پر ایک عجیب و غریب کیفیت طاری ہو گئی۔ اُس کے دل میں جو پہلا خیال آیا وُہ یہ تھا "مجھے کل جمعہ سے نماز شروع کر دینی چاہیئے۔" اس خیال کو بعد میں اُس نے مصطفےٰ کمال پاشا کی شاندار مسلمانی اور بڑائی میں تحلیل کر دیا۔

بازار کی ایک تنگ گلی میں دو تین کوکین فروش گھاٹ پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ایک نے پان کی پیک بڑی صفائی سے بجلی کے کھمبے پر پھینکی، اور کہا۔ میں مانتا ہوں، مصطفےٰ کمال بہت بڑا آدمی تھا۔ لیکن محمد علی بھی کسی سے کم نہیں تھا۔ یہاں بمبئی میں تین چار ہوٹلوں کا نام اسی پر رکھا گیا ہے۔

دوسرے نے جو اپنی ننگی پنڈلیوں پر سے ایک کھردرے چاقو سے میل اتارنے کی کوشش کر رہا تھا، اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا۔ "محمد علی کی موت پر بہت شاندار ہڑتال ہوئی تھی ـــــــ"

"ہاں بھئی تو کل ہڑتال ہو رہی ہے کیا؟" تیسرے نے ایک کی پسلیوں میں کہنی سے ٹھوکا دیا۔ اُس نے جواب دیا، "کیوں نہ ہو گی ـــــــ ارے اتنا بڑا مسلمان مر جائے اور ہڑتال نہ ہو۔" یہ بات ایک راہ گیر نے سُن لی۔ اُس نے دوسرے چوک میں اپنے دوستوں سے کہی، اور ایک گھنٹے میں اُن سب لوگوں

کو جو دن کو سونے اور رات کو بازاروں میں جاگتے رہنے کے عادی ہیں معلوم ہو گیا کہ صبح ہڑتال ہو رہی ہے۔

الو قصائی رات کو دو بجے اپنی کھولی میں آیا۔ اس نے آتے ہی طاق پر سے بہت سی چیزیں اِدھر اُدھر پلٹ کرنے کے بعد ایک پڑیا نکالی اور ایک دیگچی میں پانی بھر کر اس کو اس میں ڈال کر گھولنا شروع کر دیا۔

اس کی بیوی جو دن بھر کی تھکی ماندی ایک کونے میں ٹاٹ پر سو رہی تھی برتن کی کھڑکھڑ سن کر جاگ پڑی۔ اس نے لیٹے لیٹے کہا "آگئے ہو؟"

"ہاں آگیا ہوں" یہ کہہ الو نے اپنی قمیص اتار کر دیگچی میں ڈال دی اور اسے پانی کے اندر مسلنا شروع کر دیا۔

اس کی بیوی نے پوچھا "تم یہ کیا کر رہے ہو؟" "مصطفےٰ کمال مر گیا ہے۔ کل ہڑتال ہو رہی ہے۔" اس کی بیوی یہ سن کر گھبراہٹ کے مارے اٹھ کھڑی ہوئی "کیا مارا ماری ہو گی۔؟ میں تو ان ہر روز کے فسادوں سے تنگ آگئی ہوں" وہ سر پکڑ کر رہ گئی "میں نے تجھ سے ہزار مرتبہ کہا ہے کہ تو ہندوؤں کے اس محلے سے اپنا مکان بدل ڈال، پر نہ جانے تو کب سنے گا۔"

الو جواب میں ہنسنے لگا۔ "اری پگلی ——— یہ ہندو مسلمانوں کا فساد نہیں ہے۔ مصطفےٰ کمال مر گیا ہے ——— وہی جو بہت بڑا آدمی تھا۔ کل اس کے سوگ میں ہڑتال ہو گی۔"

"جانے میری بلا یہ بڑا کون آدمی ہے ——— پر یہ تو کیا کر رہا ہے؟" بیوی نے پوچھا "سوتا کیوں نہیں ہے!" ——— "قمیص کو کالا رنگ دے رہا

ہوں ——— صبح ہمیں ہڑتال کرانے جانا ہے!" قمیص، یہ کہہ کر اس نے قمیص نچوڑ کر دو کیلیوں کے ساتھ لٹکا دی جو دیوار میں گڑی ہوئی تھیں۔

دوسرے روز صبح کو سیاہ پوش مسلمانوں کی ٹولیاں کالے جھنڈے لئے بازاروں میں چکر لگا رہی تھیں۔ یہ سیاہ پوش مسلمان دوکانداروں کی دوکانیں بند کرا رہے تھے اور یہ نعرے لگا رہے تھے " انقلاب زندہ باد" "انقلاب زندہ باد۔"

ایک ہندو نے جو اپنی دوکان کھولنے کے لئے جا رہا تھا۔ یہ نعرے سنے اور نعرے لگانے والوں کو دیکھا تو وہ چپ چاپ ٹرام میں بیٹھ کر وہاں سے کھسک گیا۔ دوسرے ہندو اور پارسی دوکانداروں نے جب مسلمانوں کے ایک گروہ کو چیختے چلاتے اور نعرے مارتے دیکھا تو انہوں نے جھٹ پٹ دوکانیں بند کر لیں۔

دس پندرہ سیاہ پوش گپیں ہانکتے ایک بازار سے گذر رہے تھے۔ ایک نے اپنے ساتھی سے کہا " دوست ہڑتال تو خوب ہوتی ہے۔ پر ویسی نہیں ہوتی جیسی محمد علی کی ٹیم پر ہوتی تھی۔ ٹرامیں تو اسی طرح چل رہی ہیں۔"

اس ٹولی میں جو سب سے جوشیلا تھا، اور جس کے ہاتھ میں سیاہ جھنڈا تھا تنک کر بولا " آج بھی نہیں چلیں گی۔" یہ کہہ کر وہ اس ٹرام کی طرف بڑھا جو لکڑی کے ایک شیڈ کے نیچے مسافروں کو اتار رہی تھی۔ ٹولی کے باقی آدمیوں نے اس کا ساتھ دیا اور ایک لمحہ کے اندر سب کے سب ٹرام کی سرخ گاڑی کے ارد گرد تھے۔ بعد ازاں سب مسافر زبردستی اتار دیئے گئے۔

شام کو ایک وسیع میدان میں ماتمی جلسہ ہوا۔ شہر کے سب ہنگامہ پسند جمع تھے۔ خوانچہ فروش اور پان بیڑی والے چل پھر کر اپنا سودا بیچ رہے تھے۔ جلسہ گاہ کے عارضی دوکانوں کے پاس ایک میلہ لگا ہوا تھا۔ چاٹ کے چنوں اور اُبلے ہوئے آلوؤں کی خوب بکری ہو رہی تھی۔

جلسہ گاہ کے اندر اور باہر بہت بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ اس ہجوم میں کئی آدمی ایسے بھی پھر رہے تھے۔ جو یہ معلوم کرنے کی کوشش میں تھے کہ اتنے آدمی کیوں جمع ہو رہے ہیں۔ ایک صاحب گلے میں دور بین لٹکائے ادھر ادھر چکر کاٹ رہے تھے۔ دُور سے اتنی بھیڑ دیکھ کر، اور یہ سمجھ کر کہ پہلوانوں کا دنگل ہو رہا ہے۔ وہ ابھی ابھی اپنے گھر سے نئی دُوربین لے کر دوڑے دوڑے آ رہے تھے اور اس کا امتحان لینے کے لئے آ رہے تھے

یہاں کے آہنی جنگلے کے پاس دو آدمی کھڑے آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔ اور ایک نے اپنے ساتھی سے کہا۔ "بھئی یہ مصطفےٰ کمال تو واقعی کوئی بہت بڑا آدمی تھا ——— میں جو صابن بنانے والا ہوں، اس کا نام 'کمال صابن' رکھوں گا ——— کیوں کیسا رہے گا۔؟"

دُوسرے نے جواب دیا۔ "وہ بھی بُرا نہیں تھا۔ جو تم نے پہلے سوچا تھا ۔جناح سوپ ——— یہ جناح مسلم لیگ کا بہت بڑا لیڈر ہے۔!"

"نہیں نہیں، کمال سوپ اچھا رہے گا ——— بھائی مصطفےٰ کمال اس سے بڑا آدمی ہے۔ یہ کہہ اُس نے اپنے ساتھی کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ آؤ چلیں جلسہ شروع ہونے والا ہے۔ وہ دونوں جلسہ گاہ کی طرف چل دیئے جلسہ

شروع ہوا۔

آغاز میں نظمیں گائی گئیں۔ جن میں مصطفٰے کمال کی بڑائی کا ذکر تھا۔ پھر ایک صاحب تقریر کرنے کے لئے اُٹھے۔ آپ نے کمال اتاترک کی عظمت بڑے بلند بانگ لفظوں میں بیان کرنا شروع کیں۔ حاضرین جلسہ اس تقریر کو خاموشی سے سُنتے رہے۔ جب کبھی مقرر کے یہ الفاظ گونجتے "مصطفٰے کمال نے درّۂ دانیال سے انگریزوں کو لات مار کر باہر نکال دیا" یا کمال نے یونانی بھیڑوں کو اسلامی خنجر سے ذبح کر ڈالا" تو اسلام زندہ باد کے نعروں سے کانپ کانپ اٹھتا۔"

یہ نعرے مقرر کی قوّت گویائی کو اور تیز کر دیتے اور وہ زیادہ جوش سے اتاترک کمال کی عظیم الشان شخصیت پر روشنی ڈالنا شروع کر دیتا۔

مقرر کا ایک ایک لفظ حاضرین جلسہ کے دلوں میں ایک جوش وخروش پیدا کر رہا تھا۔

جب تک تاریخ میں گیلی پولی کا واقعہ موجود ہے۔ برطانیہ کی گردن ٹرکی کے سامنے قلم رہے گی۔ صرف ٹرکی ہی ایک ایسا ملک ہے جس نے برطانوی حکومت کا کامیاب مقابلہ کیا۔ اور صرف مصطفٰے کمال ہی ایک ایسا مسلمان ہے جس نے غازی صلاح الدین ایوّبی کی سپاہیانہ عظمت کی یاد تازہ کی۔ اُس نے یہ لوگ شمشیر یورپی ممالک سے اپنی طاقت کا لوہا منوایا۔ ٹرکی کو یورپ کا مرد بیمار کہا جاتا تھا۔ مگر کمال نے اسے صحت اور قوت بخش مرد آہن بنا دیا۔

"جب یہ الفاظ جلسہ گاہ میں بلند ہوتے تو "انقلاب زندہ باد، انقلاب زندہ باد کے نعرے پانچ منٹ تک متواتر بلند ہوتے رہے"

اس سے مقرر کا جوش اور بڑھ گیا۔ اس نے اپنی آواز کو اور بلند کر کے کہنا شروع کیا "کمال کی عظمت مختصر الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔ اس نے اپنے ملک کے لئے وہ خدمات سرانجام دی ہیں جن کو بیان کرنے کے لئے کافی وقت چاہئے ——— اس نے ترکی میں جہالت کا دیوالہ نکال دیا۔ تعلیم عام کر دی تھی۔ نئی روشنی کی شعاعوں کو پھیلایا۔ یہ سب کچھ اس نے تلوار کے زور سے کیا۔ اس نے دین کو جب علم سے علیحدہ کیا تو بہت سے قدامت پسندوں نے اس کی مخالفت کی مگر وہ سرِ بازار پھانسی پر لٹکا دیئے گئے۔ اس نے جب یہ فرمان جاری کیا کہ کوئی ترک رومی ٹوپی نہ پہنے تو بہت سے جاہل لوگوں نے اس کے خلاف آواز اٹھانا چاہی۔ مگر یہ آواز ان کے گلے ہی میں دبا دی گئی ——— اس نے جب یہ حکم دیا کہ اذان ترکی زبان میں ہو تو بہت سے ملاؤں نے عدول حکمی کی مگر وہ قتل کر دیئے گئے۔

"یہ کفر بکتا ہے" ——— جلسہ گاہ میں ایک شخص کی آواز بلند ہوئی اور فوراً ہی سب لوگ مضطرب ہو گئے۔

"یہ کافر ہے ——— جھوٹ بولتا ہے" کے نعروں میں مقرر کی آواز گم ہو گئی پیشتر اس کے کہ وہ اپنا مافی الضمیر بیان کرتا۔ اس کے ماتھے پر ایک پتھر لگا اور وہ چکرا کر اسٹیج پر گر پڑا۔ جلسہ میں بھگدڑ مچ گئی۔

اسٹیج پر مقرر کا ایک دوست اس کے ماتھے پر سے خون

پوچھ رہا تھا ــــــــــ اور جلسہ گاہ ان نعروں سے گونج رہی تھی ــــ
"مصطفیٰ کمال زندہ باد" ــــــــ مصطفیٰ کمال زندہ باد" ــــــــــــ
مصطفیٰ کمال زندہ باد ــــــــــــ"

قبض

نئے لکھے ہوئے مکالمے کا کاغذ میرے ہاتھ میں تھا۔ ایکٹر اور ڈائریکٹر کیمرے کے پاس سامنے کھڑے تھے۔ شوٹنگ میں ابھی کچھ دیر تھی اس لئے کہ اسٹوڈیو کے ساتھ والا صابن کا کارخانہ چل رہا تھا۔ ہر روز اس کارخانے کے شور کی بدولت ہمارے سیٹھ صاحب کا کافی نقصان ہوتا تھا۔ کیونکہ شوٹنگ کے دوران میں ایکاایکی جب اس کارخانے کی کوئی مشین چلنا شروع ہو جاتی تو کئی کئی ہزار فٹ فلم کا ٹکڑا بیکار ہو جاتا اور ہمیں نئے سرے سے کئی سینوں کی دوبارہ شوٹنگ کرنا پڑتی۔

ڈائریکٹر صاحب ہیرو اور ہیروئن کے درمیان کیمرے کے پاس کھڑے سگریٹ پی رہے تھے۔ اور میں نے سُستانے کی خاطر کرسی پر ٹانگیں سمیٹ کر بیٹھا تھا۔ وہ یوں کہ میری دونوں کرسی کی نشست پر تھیں اور میرا بوجھ نشست کے بجائے اُن پر تھا میری اس عادت پر بہت لوگوں کا اعتراض ہے مگر یہ واقعہ

ہے کہ مجھے اصلی آرام صرف اسی طریقے پر بیٹھنے سے ملتا ہے۔

نینا جس کی دو آنکھیں بھینگی تھیں۔ ڈائریکٹر صاحب کے پاس آیا۔ اور کہنے لگا۔ صاحب۔ بولتا ہے کہ تھوڑا کام باقی رہ گیا ہے۔ پھر شور بند ہو جائے گا۔

یہ روز مرہ کی بات تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی آدھ گھنٹے تک کارخانے میں صابن کٹتے اور ٹھپے لگتے رہیں گے۔ چنانچہ ڈائریکٹر صاحب ہیرو اور ہیروئن سمیت اسٹوڈیو سے باہر چلے گئے۔ میں وہیں کرسی پر بیٹھا رہا۔

سقفی لیمپ کی ناکافی روشنی میں سیٹ پر جو چیزیں تھیں اُن کا درمیانی فاصلہ اصلی فاصلے سے کچھ زیادہ دکھائی دے رہا تھا۔ اور گیردے رنگ کے کھری بلائی دُڈ کے تختے جو دیواروں کی صورت میں کھڑے تھے پست قد دکھائی دیتے تھے۔ میں اس تبدیلی پر غور کر رہا تھا کہ پاس ہی سے آواز آئی: "السلام وعلیکم"! میں نے جواب دیا: "وعلیکم السلام"۔ اور مڑ کر دیکھا تو مجھے ایک نئی صورت نظر آئی میری آنکھوں میں "تم کون ہو؟" کا سوال تیرنے لگا۔ آدمی ہوشیار تھا۔ فوراً کہنے لگا۔ جناب میں آج ہی آپ کی کمپنی میں داخل ہوا ہوں ——— میرا نام عبدالرحمٰن ہے۔ خاص دہلی شہر کا رہنے والا ہوں ——— آپ کا وطن بھی تو شاید دہلی ہی ہے۔!

میں نے کہا جی نہیں ——— میں پنجاب کا باشندہ ہوں!

عبدالرحمٰن نے جیب سے عینک نکالی "معاف فرمایئے گا! چونکہ ڈائریکٹر صاحب۔ نے عینک۔ اُتار دینے کا حکم دیا تھا اس لئے ———"

اس دوران میں اُس نے عینک بڑی صفائی سے کانوں میں اٹکائی۔ اور

میری طرف پسندیدہ نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ واللہ میں تو یہی سمجھا تھا۔ کہ آپ دہلی کے ہیں۔ یعنی آپ کی زبان میں قطعاً پنجابیت نہیں —— ماشاءاللہ کیا مکالمہ لکھا ہے —— قلم توڑ دیا ہے واللہ —— یہ اسٹوری بھی تو آپ ہی نے لکھی ہے۔؟

عبدالرحمٰن نے جب یہ باتیں کہیں تو اُس کا قد بھی میری نظروں میں تھری پلائی وُڈ کے تختوں کی طرح پست ہو گیا۔ رُوکھے پن سے کہا "جی نہیں"!

وُہ اور زیادہ لجلجا ہو گیا "عجب زمانہ ہے صاحب جو آئینوں کے مالک ہیں اُن کو کوئی پوچھتا ہی نہیں —— یہ بمبئی شہر بھی تو میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔ عجب اوٹ پٹانگ زبان بولتے ہیں یہاں کے لوگ! پندرہ دن مجھے یہاں آتے ہوئے ہو گئے ہیں۔ مگر کیا عرض کروں سخت پریشان ہو گیا ہوں۔ آج آپ سے مُلاقات ہو گئی —— اس کے بعد اس نے اپنے ہاتھ مل کر اُس روغن کی مروڑیاں بنانا شروع کر دیں۔ جو چہرے پر لگاتے وقت اُس کے ہاتھوں پر رہ گیا تھا۔

میں نے جواب میں صرف "جی ہاں" کر دیا اور خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے کاغذ کھولا اور رواداری میں لکھے ہوئے مکالموں پر نظرِ ثانی شروع کر دی۔ چند غلطیاں جن کو درست کرنے کے لئے میں نے اپنا قلم نکالا۔ عبدالرحمٰن ابھی تک میرے پاس کھڑا تھا۔ مجھے اُس کے کھڑے ہونے کے انداز سے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ چنانچہ میں نے پوچھا "فرمائیے؟"

اُس نے بڑی لجاجت کے ساتھ کہا۔ "میں ایک بات عرض کروں گا۔"

"بڑے شوق سے"

"آپ اس طرح ٹانگیں اوپر کر کے نہ بیٹھا کریں"۔

"کیوں"؟

اُس نے جھک کر کہا۔ بات یہ ہے کہ اس طرح بیٹھنے سے قبض ہو جایا کرتا ہے۔

"قبض؟" میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ قبض کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ کہہ کر میرے جی میں آئی کہ اُس سے کہوں، میاں ہوش کی دوا کرو ——— گھاس تو نہیں کھا گئے۔

مجھے اس طرح بیٹھے بیس برس ہو گئے۔ آج کیا تمہارے کہنے سے مجھے قبض ہو جائے گا"۔ مگر یہ سوچ کر چپ ہو گیا، کہ بات بڑھ جائے گی۔ اور مجھے بیکار کی مغزوری کرنا پڑے گی۔

" وُہ مسکرایا۔ عینک کے شیشوں کے پیچھے اُس کی آنکھوں کے آس پاس کا گوشت سکڑ گیا"۔ آپ نے مذاق سمجھا ہے۔ حالانکہ صحیح بات یہی ہے کہ ٹانگیں جوڑ کر پیٹ کے ساتھ لگا کر بیٹھنے سے معدے کی حالت خراب ہو جاتی ہے میں نے تو اپنی ناچیز رائے پیش کی ہے۔ مانے نہ مانے یہ آپ کو اختیار ہے"

میں عجب مشکل میں پھنس گیا۔ اس کو اب میں کیا جواب دیتا ——— قبض یعنی قبض ہو جائے گا۔ بیس برس کے دوران میں مجھے قبض نہ ہوا۔ لیکن آج اس مسخرے کے کہنے سے مجھے قبض ہو جائے گا۔ قبض کھانے پینے سے ہوتا ہے نہ کہ کرسی یا کوچ پر بیٹھنے سے۔ جس طرح میں کرسی پر بیٹھتا ہوں، اس

سے تو آدمی کو راحت ہوتی ہے۔ دوسروں کو نہ سہی، لیکن مجھے تو اس سے آرام ملتا ہے اور یہ سچی بات یہ ہے کہ مجھے ٹانگیں جوڑ کر سینے کے ساتھ لگا دینے سے ایک خاص قسم کی فرحت حاصل ہوتی ہے۔ اسٹوڈیو میں عام طور پر شوٹنگ کے دوران میں کھڑے رہنا پڑتا ہے۔ جس سے آدمی تھک جاتا ہے۔ دوسرے نامعلوم کس طریقے سے اپنی تھکن دور کرتا ہوں۔ کسی کے کہنے پر میں اپنی یہ عادت کبھی چھوڑ نہیں سکتا۔ خواہ قبض کے بجائے مجھے سرسام ہو جائے۔ یہ ضد نہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ کرسی پر اس طرح بیٹھنے کا انداز میری عادت نہیں بلکہ میرے جسم کا ایک جائز مطالبہ ہے۔

جیسا کہ اس سے پہلے میں عرض کر چکا ہوں۔ کہ اکثر لوگوں کو میرے اس طرح بیٹھنے کے انداز پر اعتراض ہو رہا ہے۔ اس اعتراض کی وجہ میں نے ان لوگوں سے نہ کبھی پوچھی ہے اور نہ کبھی انہوں نے بتائی ہے۔ اعتراض کی وجہ خواہ کچھ بھی ہو۔ میں اس معاملے میں دلیل سننے کے لئے بھی تیار نہیں، کوئی آدمی بھی مجھے قائل نہیں کر سکتا۔

جب عبدالرحمٰن نے مجھ پر نکتہ چینی کی تو میں جھنا گیا۔ اور اس کا یوں شکریہ ادا کیا۔ جیسے کوئی یہ کہے "لعنت ہو تم پر"

اس شکریہ کی رسید کے طور پر اس نے اپنے موٹے ہونٹوں پر پیلی سی مسکراہٹ پیدا کی اور خاموش ہو گیا۔ اتنے میں ڈائریکٹر ہیرو اور ہیروئن آگئے۔ اور شوٹنگ شروع ہو گئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ چلو اسی بہانے عبدالرحمٰن کے قبض سے نجات حاصل ہوئی۔

اُس کی پہلی ملاقات پر ذیل کی باتیں میرے دماغ میں آئیں۔

(۱) یہ ایکٹر جو کمپنی میں نیا بھرتی ہوا ہے بہت بڑا چغل خور ہے۔

(۲) یہ ایکٹر جو کمپنی میں نیا بھرتی ہوا ہے سخت بدتمیز ہے۔

(۳) یہ ایکٹر جو کمپنی نے نیا بھرتی کیا ہے، پرلے درجے کا مغز چاٹ ہے۔!

(۴) یہ ایکٹر جو کمپنی میں نیا داخل ہوا ہے۔ مجھے اس پر بے حد نفرت پیدا ہوگئی ہے۔

اگر مجھے کسی شخص سے نفرت پیدا ہو جائے تو اس کا مطلب یہ اس کی زندگی کچھ عرصہ کے لئے زیادہ متحرک ہو جائے گی۔ میں نفرت کرنے کے معاملے میں کافی مہارت رکھتا ہوں۔ آپ پوچھیں گے کہ نفرت کرنے میں مہارت کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن میں آپ سے کہوں گا کہ ہر کام کرنے کے لئے اس خاص سلیقے کی ضرورت ہے۔ اور نفرت میں چونکہ شدّت زیادہ ہے اس لئے اس کے عامل کا ماہر ہونا اشد ضروری ہے۔ محبت ایک عام چیز ہے۔ حضرت آدم سے لے کر ماسٹر نثار تک سب، محبت کرتے آئے ہیں۔ مگر نفرت بہت کم لوگوں نے کی ہے۔ اور جنہوں نے کی ہے اُن میں سے اکثر کو اس کا سلیقہ نہیں آیا۔ نفرت محبت کے مقابلے میں بہت زیادہ لطیف اور شفاف ہے۔ محبت میں مٹھاس ہے اگر زیادہ دیر تک قائم رہے تو دل کا ذائقہ خراب ہو جاتا ہے مگر نفرت میں ایک ایسی ترشی ہے۔ جو دل کا قوام درست رکھتی ہے۔!

میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ نفرت اس طریقے سے کرنا چاہیئے۔ کہ اُس میں محبت کا مزہ ملے۔ شیطان سے نفرت کرنے کا جو سبق ہمیں مذہب نے سکھایا ہے۔ مجھے اس سے سو فی صدی اتفاق ہے۔ یہ ایک ایسی نفرت ہے جو شیطان کی شان کے خلاف نہیں اگر دنیا میں شیطان نام کی کوئی ہستی موجود ہے تو وہ یقیناً اُس نفرت سے جو کہ اُس کے چاروں طرف پھیلی ہوتی ہے۔ خوش ہوتی ہوگی اور سچ پوچھئے تو یہ عالمگیر نفرت ہی شیطان کی زندگی کا ثبوت ہے۔ اگر ہمیں اُس سے نہایت ہی بھونڈے طریقے پر نفرت کرنا سکھایا جاتا تو دنیا ایک بہت بڑی ہستی کے تصوّر سے خالی ہوتی۔

میں نے عبدالرحمٰن سے نفرت کرنا شروع کردی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ میری اور اُس کی دونوں کی زندگی میں حرکت پیدا ہوگئی۔ اسٹوڈیو میں اور اسٹوڈیو کے باہر جہاں کہیں اُس سے میری ملاقات ہوتی ہیں اُس کی خیریت دریافت کرتا، اور دیر تک باتیں کرتا رہتا۔

عبدالرحمٰن کا قد متوسط ہے اور بدن گٹھا ہوا۔ جب وہ نیکر پہن کر آتا۔ تو اُس کی بے بال پنڈلیوں کا گوشت فٹ بال کے نئے کورے چمڑے کی طرح چمکتا ہے۔ ناک موٹی جس کی کوٹھڑی اُبھری ہوئی ہے۔ چہرے کے خطوط منگولی ہیں۔ ماتھا چوڑا جس پر گہرے زخم کا نشان ہے۔ اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیطان ڈرکے نے اپنے ڈیسک کی لکڑی میں چاقو سے چھوٹا سا گڑھا بنا دیا ہے۔ پیٹ سخت اور اُبھرا ہوا حافظِ قرآن

ہے۔ چنانچہ بات بات میں آیتوں کے حوالے دیتا ہے۔ دوسرے ایکٹرا اُس کی اس عادت کو پسند نہیں کرتے اس لئے کہ انہیں احترام کے باعث چُپ ہو جانا پڑتا ہے۔

ڈائرکٹر صاحب کو جب میری زبانی معلوم ہوا کہ عبدالرحمٰن صاف زبان بولتا ہے اور غلطی نہیں کرتا تو انہوں نے اُسے ضرورت سے زیادہ استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ایک ہی فلم میں اُسے دس مختلف آدمیوں کے بھیس میں لایا گیا۔ سفید پوشاک پہنا کر اُسے ہوٹل میں بیرا بنا کر کھڑا کر دیا گیا۔ سر پہ لمبے لمبے بال لگا کر اور چمٹا ہاتھ میں دے کر ایک جگہ اُس کا سادھو بنا دیا گیا۔ چپڑاسی کی ضرورت محسوس ہوتی تو اُس کے چہرے پر گوند سے لمبی داڑھی چپکا دی گئی۔ ریلوے پلیٹ فارم پر بڑی بڑی مونچھیں لگا کر اُس کو ٹکٹ چیکر بنا دیا گیا۔ —— یہ سب میری بدولت ہوا۔ اس لئے کہ مجھے اس سے نفرت پیدا ہو گئی تھی۔

عبدالرحمٰن خوش تھا کہ وہ چند ہی دنوں میں اتنا مقبول ہو گیا۔ اور میں خوش تھا۔ کہ دوسرے ایکٹرا اُس سے حسد کرنے لگے ہیں۔ میں نے موقعہ دیکھ کر سیٹھ سے سفارش کی۔ چنانچہ تیسرے مہینے اس کی تنخواہ میں دس روپے کا اضافہ بھی ہو گیا۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمپنی کے بہت سے ایکٹراؤں کی آنکھوں میں وہ خار بن کے کھٹکنے لگا۔

لطف یہ ہے کہ عبدالرحمٰن کو اس بات کے متعلق خبر نہ تھی کہ میری وجہ سے اُس کی تنخو... میں اضافہ ہوا ہے اور میری سفارشوں کے باعث

کمپنی کے دوسرے ڈائریکٹر اُس سے کام لینے لگے ہیں۔

فلم کمپنی میں کام کرنے کے علاوہ وہاں کے ایک مقامی ہفتہ وار اخبار کو ایڈٹ کرتا ہوں۔ ایک روز میں نے اپنے اخبار عبدالرحمٰن کے ہاتھ میں دیکھا جب وہ میرے قریب آیا تو مسکرا کر اس نے پرچے کی ورق گردانی شروع کر دی۔ "منشی صاحب ——— یہ رسالہ آپ ہی ———"

میں نے فوراً جواب دیا۔ "جی ہاں۔"

"ماشاءاللہ، کتنا خوبصورت پرچہ نکالتے ہیں آپ، کل رات اتفاق سے یہ میرے ہاتھ آگیا ——— بہت دلچسپ ہے۔ اب میں ہر ہفتے خریدا کروں گا۔"

یہ اُس نے اس انداز میں کہا جیسے مجھ پر احسان کر رہا ہے۔ میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا، چنانچہ بات ختم ہو گئی۔

کچھ دنوں کے بعد جب کہ میں اسٹوڈیو کے باہر نیم کے پیڑ تلے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھا اپنے اخبار کے لئے ایک کالم لکھ رہا تھا۔ عبدالرحمٰن آیا اور بڑے ادب کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا اور پوچھا "فرمایئے"

"آپ فارغ ہو جائیں تو میں ———"

"میں فارغ ہوں ——— فرمایئے آپ کو کیا کہنا ہے۔"

اس کے جواب میں اُس نے ایک رنگین لفافہ کھولا اور اپنی تصویر میری طرف بڑھا دی۔ تصویر ہاتھ میں لیتے ہی جب میری نظر اُس پر پڑی تو مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ یہ ہنسی چونکہ بے اختیار آئی تھی۔ اس لئے میں اسے

روک نہ سکا۔ بعد میں مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ عبدالرحمٰن کو یہ ناگوار معلوم ہوگی۔ تو میں نے کہا: "عبدالرحمٰن صاحب، اتفاق دیکھئے۔ میں صبح سے پریشان تھا کہ ٹائیٹل پیج کے بعد کا صفحہ کیسے پُر ہوگا۔ دو تصویروں کے بلاک مل گئے تھے۔ مگر ایک کی کمی تھی ـــــــ اس وقت میں یہی سوچ رہا تھا کہ آپ نے اپنا فوٹو میری طرف بڑھا دیا ـــــــ بہت اچھا فوٹو ہے۔" بلاک بھی اس کا خوب بنے گا۔"

عبدالرحمٰن نے اپنے موٹے ہونٹ اندر کی طرف سکیڑ لیے "آپ کی بڑی عنایت ہے ـــــــ تو ـــــــ کیا یہ تصویر چھپ جائے گی؟"

میں نے تصویر کو ایک نظر دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ "کیوں نہیں اس ہفتے ہی کے پرچے تو میں یہ کہہ رہا تھا۔"

اس پر عبدالرحمٰن نے دوبارہ شکریہ ادا کیا۔ "پرچے میں تصویر کے ساتھ ایک چھوٹا سا نوٹ بھی نکل جاتے تو میں اور بھی ممنون ہوں گا ـــــــ جیسا آپ مناسب خیال فرمادیں ـــــــ تو ـــــــ معاف کیجیے، میں آپ کے کام میں مخل ہو رہا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے ہاتھ آہستہ آہستہ ملتا ہوا چلا گیا۔

میں نے اب تصویر کو غور سے دیکھا۔ آڑی مانگ نکلی ہوتی تھی۔ ایک ہاتھ میں بھاری بھرکم ڈائرکٹری تھی۔ جس پر چھپے ہوئے حروف تھے۔ جو بتا رہے تھے۔ کہ سن سولہ کی یہ کتاب فوٹو گرافر نے اپنے گاہکوں کو تعلیم یافتہ دکھانے کے لیے ایک یا دو آنے میں خریدی ہوگی۔ دوسرے ہاتھ میں جو اُوپر کو اُٹھا

ہوا تھا۔ ایک بہت بڑا پائپ تھا۔ اس پائپ کی ٹونٹی عبدالرحمٰن نے اس انداز سے اپنے منہ کی طرف بڑھائی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ چائے کا پیالہ پکڑے ہے۔ لبوں پر چائے کا گھونٹ پیتے وقت جو ایک خفیف سا ارتعاش پیدا ہوا کرتا ہے وہ تصویر میں اس کے ہونٹوں پر جما ہوا دکھائی دیتا تھا۔ آنکھیں کیمرے کی طرف دیکھنے کے باعث کھل گئی تھیں۔ ناک کے نتھنے تھوڑے پھول گئے تھے۔ سینے میں ابھار پیدا کرنے کی کوشش رائیگاں نہیں گئی تھی۔ کیونکہ وہ اچھا خاصا کارٹون بن گیا تھا۔ یاد رہے کہ عبدالرحمٰن انگریزی پڑھنا لکھنا بالکل نہیں جانتا اور تمباکو سے پرہیز کرتا ہے۔

میں نے اپنی گرہ سے دام خرچ کر کے اُس کے فوٹو کا بلاک بنوایا اور وعدے کے مطابق تعریفی نوٹ کے ساتھ پرچے میں چھپوایا۔

دوسرے روز دس بجے کے قریب میں کمپنی کے غلیظ ریسٹوران میں بیٹھا کڑوی چائے پی رہا تھا کہ عبدالرحمٰن تازہ پرچہ جس میں اس کی تصویر چھپی تھی۔ ہاتھ میں لئے داخل ہوا، اور آداب عرض کر کے میرے پاس کھڑا ہو گیا۔ اُس کے ہونٹ اندر کی طرف سمٹ رہے تھے۔ آنکھوں کے آس پاس کا گوشت سکڑ رہا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ممنون ہو رہا ہے۔ بغل میں پرچہ دبا کر اُس نے ہاتھ بھی ملنے شروع کر دیئے۔ شکریئے کے کئی فقرے اُس نے دل ہی دل میں بناتے ہوں گے۔ مگر ناموزوں سمجھ کر انہیں منسوخ کر دیا ہو گا جب میں نے اُسے اس ادھیڑ بن میں دیکھا تو ماتم پرسی کے انداز میں اُس سے کہا "تصویر چھپ گئی آپ کی ——— نوٹ بھی پڑھ لیا

آپ نے ؟"

" جی ہاں ——————— آپ ——————— کی بڑی نوازش ہے

ایک دم میرے سینے میں درد کی ٹیس اُٹھی، میرا رنگ پیلا پڑ گیا۔ یہ درد بہت پُرانا ہے، جس کے دورے اکثر مجھے پڑتے رہتے ہیں۔ میں اس کے دفیعے کے لئے سینکڑوں علاج کر چکا ہوں۔ مگر لا حاصل چائے پیتے پیتے یہ درد ایک دم اُٹھا اور سارے سینے میں پھیل گیا۔ عبدالرحمٰن نے میری طرف غور سے دیکھا اور گھبراتے ہوتے لہجہ میں کہا "آپ کے دشمنوں کی طبیعت ناساز ہے"

میں اُس وقت ایسے موڈ میں تھا کہ دشمنوں کو بھی اس موذی مرض کا شکار ہوتے دیکھ سکتا چنانچہ میں نے بڑے روکھے پن سے کہا۔ کچھ نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔

" جی نہیں، آپ کی طبیعت ناساز ہے ——— وہ سخت گھبرا گیا

" میں آپ کی خدمت کر سکتا ہوں"

" میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ مطلق فکر نہ کریں، سینے میں معمولی سا درد ہے، ابھی ٹھیک ہو جائے گا"

" سینے میں درد ہے" ——— یہ کہہ کر وہ تھوڑی دیر کے لئے سوچ میں پڑ گیا۔ سینے میں درد ہے تو ——— اس کا مطلب ہے کہ آپ کو قبض ہے اور قبض ———"

قریب تھا کہ میں بھنا کر اُس کو دو تین گالیاں سُنا دوں۔ مگر میں نے ضبط سے

کام لیا:۔ آپ ——— حد کرتے ہیں۔ آپ ——— سینے کے درد سے قبض کو کیا تعلق؟"

"جی نہیں" ——— قبض ہو تو ایک سو ایک بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔ اور سینے کا درد تو یقیناً قبض ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ آپ کی آنکھوں کی زردی صاف ظاہر کرتی ہے کہ آپ کا پرانا قبض ہے۔ اور جناب، قبض کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ کو ایک دو روز تک اجابت نہ ہو۔ جی نہیں۔ آپ جس کو بافراغت سمجھتے ہیں۔ ممکن ہے وہ قبض ہو ——— سینہ اور پیٹ تو پھر بالکل پاس پاس ہیں۔ قبض سے تو سر میں درد شروع ہو جاتا ہے ——— میرا خیال ہے کہ آپ

دراصل آپ کی کمزوری کا باعث بھی یہی قبض ہے۔

عبدالرحمٰن چند لمحات کے لئے بالکل خاموش ہو گیا۔ لیکن فوراً ہی اُس نے اپنے لہجہ میں زیادہ چکناہٹ پیدا کر کے کہا:۔ "آپ نے کئی ڈاکٹروں کا علاج کیا ہوگا ——— ایک معمولی سا علاج میرا بھی دیکھئے ——— خدا کے حکم سے یہ مرض بالکل دُور ہو جائے گا۔"

میں نے پوچھا:۔ "کون سا مرض؟"

عبدالرحمٰن نے زور زور سے ہاتھ ملے:۔ "یہی ——— یہی قبض!!"

لاحول ولا۔ اس بیوقوف سے کس نے کہہ دیا کہ مجھے قبض ہے۔ صرف میرے سینے میں درد ہے جو کہ بہت پرانا اور سب ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ اس کا باعث اعصاب کی کمزوری ہے مگر یہ نیم حکیم خطرہ جان برابر کہے جا رہا ہے کہ مجھے قبض ہے۔ قبض ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں غصے میں آ کر اس

کے سر پر چائے کا پیالہ دے ماروں۔ عجیب نامعقول آدمی ہے، اپنی طبابت کا پٹارہ کھول بیٹھا ہے اور سُنتا ہی نہیں۔!

غصّے کے باعث میں خاموش ہوگیا۔ اس خاموشی کا عبدالرحمٰن نے فائدہ اُٹھایا اور قبض کا علاج بتانا شروع کر دیا۔ خدا معلوم اُس نے کیا کچھ کہا:

بات یہ ہے کہ پیٹ میں آپ کے سُدّے پڑ گئے ہیں۔ آپ کو ہر روز اجابت تو ہو جاتی ہے، مگر یہ سُدّے باہر نہیں نکلتے۔ معدے کا فعل چونکہ درست نہیں رہا۔ اس لئے انتڑیوں میں خشکی پیدا ہو گئی ہے۔ رطوبت، یعنی لیس دار مادہ جو فضلے کے نیچے پھسلنے میں مدد دیتا ہے آپ کے اندر بہت کم ہو گیا ہے اس لئے میرا خیال ہے کہ رفع حاجت کے وقت آپ کو ضرورت سے زیادہ زور لگانا پڑتا ہوگا۔ قبض کھولنے کے لئے عام طور پر جو انگریزی مسہل دوائیں بازار میں بکتی ہیں بجائے فائدے کے نقصان پہنچاتی ہیں اس لئے کہ اُن سے عادت پڑ جاتی ہے اور جب عادت پڑ جائے تو آپ خیال فرمائیے کہ ہر روز پاخانہ لانے کے لئے آپ کو دو تین آنے خرچ کرنے پڑیں گے ——— یونانی دوائیں اوّل تو ہم لوگوں کے مزاج کے مطابق ہوتی ہیں ——— دوسرے ———"

میں نے تنگ آکر اُس سے کہا "آپ چائے پئیں گے۔؟" اور اُس کا جواب سُنے بغیر ہوٹل والے کو آرڈر دیا "گلاب ان کے لئے ایک ڈبل چائے لاؤ۔"

چائے فوراً ہی آگئی۔ عبدالرحمٰن کرسی گھسیٹ کر بیٹھا تو میں اُٹھ کھڑا ہوا۔" معاف کیجئے گا۔ مجھے ڈائریکٹر صاحب کے سین کے متعلق بات چیت کرنا

ہے، پھر گفت گو ہوگی۔"

یہ سب کچھ اس قدر جلدی میں ہوا کہ قبض کی باقی داستان عبدالرحمٰن کی زبان پر منجمد ہوگئی اور ریسٹوران سے باہر نکل گیا۔ درد شروع ہونے کے باعث میری طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ ان کی باتوں نے اس تکدر میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیوں کر اس بات پہ مصر ہے کہ مجھے قبض ہے۔ میری صحت دیکھ کر وہ کہہ سکتا تھا۔ کہ مدقوق ہوں۔ جیسا کہ عام لوگ میرے متعلق کہنے آتے ہیں کہ مجھے سل ہے، میری انتڑیوں میں ورم ہے۔ میرے معدے میں رسولی ہے میرے دانت خراب ہیں۔ مجھے گٹھیا ہے۔ مگر بار بار اس کا اس بات پر زور دینا کیا معنی رکھتا تھا۔ کہ مجھے قبض ہو رہا ہے، یعنی اگر واقعی مجھے قبض تھا تو اس کا احساس مجھے ——— پہلے ہونا چاہیئے تھا۔ نہ کہ حافظ عبدالرحمٰن کو۔ —— کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ خواہ مخواہ مجھے قبض کا بیمار کیوں بنا رہا تھا۔

ہوٹل سے نکل کر میں ڈائریکٹر صاحب کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ کرسی پر ہیرو، ہیروئن اور تین چار ایکٹرسوں کے ساتھ گپیں ہانک رہے تھے۔ آؤٹ ڈور شوٹنگ چونکہ بادلوں کے باعث ملتوی کر دی گئی تھی اس لئے سب کو چھٹی تھی۔

جب مجھے ہیرو کے پاس بیٹھے تین چار منٹ گذر گئے تو معلوم ہوا کہ حافظ عبدالرحمٰن کی باتیں ہو رہی ہیں۔ میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ ایک ایکٹر نے اس کے خلاف کافی زہر اگلا۔ دوسرے نے اس کی مختلف عادات کا مضحکہ اڑایا۔ تیسرے نے اس کے مکالمے ادا کرنے کی نقل اتاری۔ ہیرو کو حافظ عبدالرحمٰن

کے خلاف یہ شکایت تھی کہ وہ اس کی بول چال میں زبان کی غلطیاں نکالتا رہتا ہے
دلّن نے ڈائریکٹر صاحب سے کہا، بڑا واہیات آدمی ہے صاحب ——!
کل ایک آدمی سے کہہ رہا کہ میرا ایکٹنگ بالکل فضول ہے۔ آپ اس کو ایک
بار ذرا ڈانٹ کر دکھا دیجئے۔"

ڈائریکٹر صاحب اُن سے مسکرا کر کہنے لگے "تم سب کو اس کے خلاف شکایت۔
مگر اُسے میرے خلاف ایک زبردست شکایت ہے۔

تین چار آدمیوں نے اکٹھے پوچھا" وہ کیا؟"

ڈائریکٹر صاحب نے پہلی مسکراہٹ کو طویل بنا کر کہا" وہ کہتا ہے کہ مجھے دائمی
قبض ہے، جس کے علاج کی طرف میں نے کبھی غور نہیں کیا۔ میں اُس کو کئی بار
یقین دلا چکا ہوں کہ مجھے قبض ولبض نہیں ہے۔ لیکن وہ مانتا ہی نہیں، ابھی تک
اس بات پر اڑا ہوا ہے کہ مجھے قبض ہے۔ کئی علاج بھی مجھے بتا چکا ہے۔ میں
سمجھتا ہوں کہ وہ مجھے اس طرح ممنون کرنا چاہتا ہے"

میں نے پوچھا" وہ کیسے؟"

یہ کہنے سے کہ مجھے قبض ہے اور اس کا علاج بتانے سے۔

—— وہ مجھے ممنون کرنا چاہتا ہے ورنہ پھر اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟
بات دراصل یہ ہے کہ اُسے صرف اسی مرض کا علاج معلوم ہے یعنی اس کے پاس
چند ایسی دوائیں موجود ہیں۔ جن سے قبض دور ہو سکتا ہے۔ چونکہ مجھے وہ
خاص طور پر ممنون کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے ہر وقت اس تاک میں رہتا ہے
کہ جونہی مجھے قبض ہو —— وہ فوراً علاج شروع کر کے مجھے ٹھیک کر

دے۔ آدمی دلچسپ ہے۔"

ساری بات میری سمجھ میں آگئی اور میں نے زور زور سے ہنسنا شروع کردیا: "ڈائریکٹر صاحب —— آپ کے علاوہ حافظ صاحب کی نظرِ عنایت خاکسار پر بھی ہے —— میں نے کل اُن کا فوٹو اپنے پرچے میں چھپوایا ہے۔ اس احسان کا بدلہ اتارنے کے لئے ابھی ابھی ہوٹل میں انہوں نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی کہ مجھے زبردست قبض ہو رہا ہے —— خدا کا شکر ہے کہ مجھے اُن کے اس حملے سے بچاؤ ہوگیا۔ اس لئے کہ مجھے قبض نہیں ہے۔"

اس گفت گو کے چوتھے روز مجھے قبض ہوگیا۔ یہ قبض ابھی تک جاری ہے یعنی اس کو پورے دو مہینے ہوگئے ہیں۔ میں کتنی پیٹنٹ دوائیں استعمال کرچکا ہوں مگر ابھی تک اس سے نجات حاصل نہیں ہوتی اب میں سوچتا ہوں کہ حافظ عبدالرحمٰن کو اپنی خواہش پوری کرنے کا ایک موقعہ دے ہی دوں کیا حرج ہے؟ مجھے اس سے محبت تو ہے ہی نہیں۔"

ایکٹرس کی آنکھ

"بالوں کی گٹھڑی" کی شوٹنگ تمام شب ہوتی رہی تھی، رات کے تھکے ماندے ایکٹر لکڑی کے کمرے میں جو کمپنی کے ولن نے اپنے میک اپ کے لیے خاص طور پر تیار کرایا تھا۔ اور جس میں فرصت کے وقت سب ایکٹر اور ایکٹرسیں سیٹھ کی مالی حالت پر تبصرہ کرتے رہتے تھے۔ صوفوں اور کرسیوں پر اونگھ رہے تھے۔ اس چوبی کمرے کے ایک کونے میں میلی سی تپائی کے اوپر دس پندرہ چائے کی خالی پیالیاں اوندھی سیدھی پڑی تھیں۔ جو شاید رات کو نیند کا غلبہ دور کرنے کے لیے ان ایکٹروں نے پی تھیں۔ کمرے کے باہر ان کی بھنبھناہٹ سن کر کسی نووارد کو یہی معلوم ہوتا تھا کہ اندر بجلی کا پنکھا چل رہا ہے۔

دراز قد ولن جو شکل و صورت سے لاہور کا کوچوان معلوم ہوتا تھا ریشمی سوٹ میں ملبوس صوفے پر دراز تھا۔ آنکھیں کھلی تھیں اور وہ بھی نیم وا تھا۔ مگر وہ کراہ رہا تھا۔ اسی طرح اس کے پاس ہی آرام کرسی پر ایک مونچھوں

والا ادھیڑ عمر کا ایکٹر اونگھ رہا تھا۔ کھڑکی کے پاس ڈنڈے سے ٹیک لگائے ایک اور ایکٹر سونے کی کوشش میں مصروف تھا کمپنی کے مکالمہ نویس یعنی منشی صاحب ہونٹوں میں بیڑی دباتے اور ٹانگیں میک اپ ٹیبل پر رکھے شاید وہ گیت بنانے میں مصروف تھے جو انہیں چار بجے سیٹھ صاحب کو دکھانا تھا۔

"اوئی ——— اوئی ——— ہائے ——— ہلئے"

دفعتاً یہ آواز باہر سے اس چوبی کمرے میں کھڑکیوں کے راستے اندر داخل ہوئی۔ ولن صاحب جھٹ سے اٹھ بیٹھے اور اپنی آنکھیں ملنے لگے۔ مونچھوں والے ایکٹر لمبے لمبے کانوں سے ایک ارتعاش کے ساتھ اس نسوانی آواز کو پہچاننے کے لئے تیار ہوئے۔ منشی صاحب نے میک اپ ٹیبل پر سے اپنی ٹانگیں اٹھالیں اور ولن صاحب طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔

"اوئی، اوئی، اوئی ——— ہائے"

اس ولن، منشی اور دوسرے ایکٹر جو نیم غنودگی کی حالت میں تھے چونک پڑے۔ سب نے کاٹھ کے اس بکس نما کمرے میں سے اپنی گردنیں باہر نکالیں۔

"ارے کیا ہے بھئی"

"خیر تو ہے!"

"کیا ہوا؟"

"اماں، یہ تو ——— دیوی ہیں!"

"کیا بات ہے، دیوی؟"

جتنے منہ اتنی باتیں ——— کھڑکی میں سے نکلی ہوئی گردن بڑے اضطراب کے ساتھ متحرک ہوتی اور ہر ایک کے منہ سے گھبراہٹ میں، ہمدردی اور ملے جلے استفسار کے جذبات کا اظہار ہوتا۔

"ہائے، ہائے، ہائے ——— اوئی اوئی ———!"

دیوی الکمپنی کی ہردلعزیز ہیروئن کے چھوٹے سے منہ سے چیخیں نکلیں اور باہوں کو انتہائی کرب و اضطراب کے تحت ڈھیلا چھوڑ کر اس نے اپنے چپل پہنے پاؤں زور سے اسٹوڈیو کی پتھریلی زمین پر مارتے ہوئے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔

ٹھمکا ٹھمکا بوسا قد، گول گول گدریا ہوا ڈیل کھلتی ہوئی، گندمی رنگ، خوب خوب کالی بھوئیں۔ کھلی پیشانی پر گہرا کسوم کا ٹیکہ ——— بال کالے بھنورے سے سیدھی مانگ نکال کر پیچھے جوڑے کی صورت میں لپیٹ دے کر کنگھی کئے ہوئے تھے۔ ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے شہد کی مکھیاں چھتے پر بیٹھی ہوئی ہیں۔

کنارے دار سفید موتی ساڑھی میں لپٹی ہوئی، چولی گجراتی تراش کی تھی بغیر آستینوں کے جن میں سے جوبن پھٹا پڑتا تھا۔ ساڑھی بمبئی کی طرز سے بندھی تھی۔ چاروں طرف میٹھا میٹھا جھول دیا ہوا تھا ——— گول گول

کلائیاں جن میں کھلی ہوتی جاپانی ریشمین چوڑیاں کھنکھنا رہی تھیں۔ ان ریشمین چوڑیوں میں کھلی ہوئی اِدھر اُدھر ولایتی سونے کی پتلی پتلی کنگنیاں جھم جھم کر رہی تھیں کان موزوں اور لویں بڑی خوبصورتی کے ساتھ جھکی ہوئیں۔ جن میں ہیرے کے آویزے شبنم کی دو تھرّاتی ہوئی بوندیں معلوم ہو رہی تھیں۔

چیختی چلّاتی اور زمین کو چپل پہنے پیروں سے کوٹتی، دیوی نے اپنی آنکھ کو ننھے سے سفید رُومال کے ساتھ ملنا شروع کر دیا۔

"ہائے میری آنکھ!"

ہائے میری آنکھ ——— ہائے!

کاٹھ کے بکس سے باہر نکلی ہوئی کچھ گردنیں اندر کو ہو گئیں اور جو باہر تھیں، پھر سے ہلنے لگیں۔

"آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے!"

"یہاں کنکر بھی بے شمار ہیں ——— ہوا میں اُڑتے پھرتے ہیں۔

"یہاں جھاڑو بھی تو چھ مہینے کے بعد دی جاتی ہے!"

"اندر آجاؤ دیوی!"

"ہاں، ہاں، آؤ ——— آنکھ کو اس طرح نہ ملو!"

"ارے بابا ——— بولا نہ تکلیف ہو جائے گی تم آجاؤ اندر!"

آنکھ مَلتی مَلتی، دیوی کمرے کے دروازے کی جانب بڑھی۔ ولّن نے ایک کرتیائی پر سے بڑی صفائی کے ساتھ ایک رُومال میں چائے کی پیالیاں سمیٹ کر میک اپ ٹیبل کے آئینے کے پیچھے چھپا دیں، اور اپنی پُرانی۔

پتلون سے ٹیبل کو جھاڑ پونچھ کر صاف کر دیا۔ باقی ایکٹروں نے کرسیاں اپنی اپنی جگہ پر جمادیں اور بڑے سلیقے سے بیٹھ گئے۔ منشی صاحب نے پرانی ادھ جلی بیڑی پھینک کر جیب سے ایک سگریٹ نکال کر سلگانا شروع کر دیا۔

دیوی اندر آئی۔ بموفے پر سے منشی اور وٹن اٹھ کھڑے ہوئے۔ منشی صاحب نے بڑھ کر کہا "آؤ دیوی بیٹھو!"

دروازے کے ساتھ بڑی بڑی سیاہ مونچھوں والے بزرگ بیٹھے تھے ان کی مونچھیں کے لٹکے اور بڑھے ہوئے بال تھرتھرائے۔ اور انہوں نے اپنی نشست پیش کرتے ہوئے بھرائی لہجہ میں کہا "ادھر بیٹھو۔"

دیوی ان کی تھرتھرائی ہوئی مونچھوں کی طرف دھیان دیئے بغیر آنکھ ملتی اور ہائے ہائے کرتی آگے بڑھ گئی۔ ایک نوجوان نے ہیرو سے جو معلوم ہو رہے تھے اور پھنسی پھنسی قمیص پہنے ہوئے تھے۔ جھٹ سے ایک جھکی نما کرسی سرکا کر آگے بڑھا دی۔ اور دیوی نے اس پر بیٹھ کر اپنی ناک کے بانسے کو رومال سے رگڑنا شروع کر دیا۔

"سب کے چہرے پر دیوی کی تکلیف کے احساس نے ایک عجیب و غریب رنگ پیدا کر دیا۔ منشی صاحب کی قوتِ احساس چونکہ دوسرے مردوں سے زیادہ تھی اس لئے چشمہ ہٹا کر انہوں نے اپنی آنکھ ملنا شروع کر دی تھی۔"

جس نوجوان نے کرسی پیش کی تھی اس نے جھک کر دیوی کی آنکھ کا ملاحظہ کیا اور بڑے مفکرانہ انداز میں کہا "آنکھ کی سرخی بتا رہی ہے کہ تکلیف

ضرور ہے۔"

اُن کا لہجہ پھٹا ہُوا تھا۔ آواز اتنی بلند تھی کہ کمرہ گونج اُٹھا۔ یہ کہنا تھا کہ دیوی نے زور زور سے چلّانا شروع کر دیا۔ اور سفید ساڑھی میں اُس کی ٹانگیں اضطراب کا بے پناہ مظاہرہ کرنے لگیں۔

" وتن صاحب آگے بڑھے اور بڑی ہمدردی کے ساتھ اپنی سخت کمر جھکا کر دیوی سے پوچھا۔ جلن محسوس ہوتی ہے یا چُبھن؟"

ایک اور صاحب جو اپنے سولا ہیٹ سمیت کمرے میں ابھی ابھی تشریف لائے تھے۔ آگے بڑھ کر پوچھنے لگے ہونٹوں کے نیچے۔ "گڑ ی محسوس نہیں ہوتی۔"

دیوی کی آنکھ سُرخ ہو رہی تھی۔ پپوٹے ملنے اور آنسوؤں کی نمی کے باعث بھاری اور گھنی ہو گئی تھیں۔ جس سے اُن کی خوبصورتی میں چار چاند لگ گئے تھے باہیں ڈھیلی کر کے دیوی نے دُکھتی آنکھ کی پتلی نچاتے ہوئے کہا۔

" آں ——— بڑا تکلیف ہوتی ہے ——— ہائے ہُوئی! اور پھر سے آنکھ کو گیلے رومال سے ملنا شروع کر دیا۔"

سیاہ و سفید مونچھوں والے صاحب نے جو کونے میں بیٹھے تھے۔ بلند آواز میں کہا " اس طرح آنکھ نہ رگڑو، خالی پیلی کوئی اور تکلیف ہو جائے گا۔

" ہاں، ہاں ——— ارے، تم پھر وہی کر رہی ہو پھٹی آواز والے نوجوان نے کہا۔

وتن جو فوراً ہی دیوی کی آنکھ کو ٹھیک حالت پر دیکھنا چاہتے تھے۔ بگڑ کر بولے " تم سب باتیں بیکار بنا رہے ہو ——— کسی سے ابھی تک

یہ بھی نہیں ہوا کہ دوڑ کر ڈاکٹر کو بلا لائے ـــــ اپنی آنکھ میں یہ تکلیف ہو تو پتہ چلے۔ یہ کہہ کر انہوں نے مڑ کر کھڑکی سے گردن باہر نکالی۔ اور زور زور سے پکارنا شروع کیا۔ "ارے ـــــ کوئی ہے ـــــ کوئی ہے ـــــ ؟ گلاب ؟ گلاب ! "

جب اُن کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی تو انہوں نے گردن اندر کو کر لی اور بڑبڑانا شروع کر دیا۔ "خدا جانے ہوٹل والے کا یہ چھوکرا کہاں غائب ہو جاتا ہے ـــــ پڑا اونگھ رہا ہوگا۔ اسٹوڈیو میں کسی تختے پر ـــــ مردود نابکار۔" پھر فوراً ہی دور اسٹوڈیو کے اس طرف گلاب کو دیکھ کر چلائے۔ جو انگلیوں میں چائے کی پیالیاں لٹکائے چلا آ رہا تھا۔ "ارے گلاب ـــــ گلاب !"

گلاب بھاگتا ہوا آیا اور کھڑکی کے سامنے پہنچ کر ٹھہر گیا۔ وتن صاحب نے گھبرائے لہجہ میں اس سے کہا۔ "دیکھو! ایک گلاس میں پانی لاؤ جلدی سے ـــــ بھاگو !"

گلاب نے کھڑے کھڑے اندر جھانکا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ گڑبڑ کیا ہے۔ ـــــ اس پر ہیرو صاحب للکارے "ارے دیکھتا کیا ہے ـــــ لانا گلاس میں تھوڑا سا پانی ـــــ بھاگ کے جا، بھاگ کے جا !"

گلاب سامنے ٹین کی چھت والے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ دیدی کی آنکھ میں چبھن اور بھی زیادہ بڑھ گئی۔ اور اس کی بنارسی لنگڑے کی کیری ایسی ننھی

منی روتے بچے کی طرح کانپنے لگی۔ اور وہ اُٹھ کر درد کی شدت سے کراہتی ہوئی صوفے پر بیٹھ گئی۔ دستی بٹوے سے ماچس کی ڈبیا کے برابر ایک آئینہ نکال کر اُس نے اپنی دکھتی آنکھ کو دیکھنا شروع کر دیا۔ اتنے میں منشی صاحب بولے، گلاب سے کہہ دیا ہوتا ——— پانی میں تھوڑی سی برف ڈال لائے۔!

"ہاں، ہاں سرد پانی اچھا رہیگا۔ یہ کہہ کر وتن صاحب کھڑکی میں سے گردن باہر نکال کر چلائے، گلاب ——— اے گلاب ——— پانی میں تھوڑی سی برف چھوڑ کے لانا۔"

اس دوران میں ہیرو صاحب جو کچھ سوچ رہے تھے کہنے لگے۔" میں بولتا ہوں کہ رومال کو سانس کی بھاپ سے گرم کرو، اور اس سے آنکھ کو سینک دو، کیوں دادا؟"

"ایک دم۔ ٹھیک رہے گا۔ سیاہ و سفید مونچھوں والے صاحب نے سر کو اس بات میں بڑے زور سے ہلاتے کہا۔

ہیرو صاحب کھونٹیوں کی طرف بڑھے، اپنے کوٹ میں سے ایک سفید رومال نکال کر دیوی کو سانس کے ذریعے سے اُس کو گرم کرنے کی ترکیب بتائی اور الگ ہو کر کھڑے ہو گئے۔ دیوی نے رومال لے لیا اور اسے مُنہ کے پاس لے جا کر گال پھُلا پھُلا کر سانس کی گرمی پہنچائی۔ آنکھ کو ٹکور دی۔ مگر کچھ افاقہ نہ ہوا۔

"کچھ آرام آیا؟" سولا ہیٹ والے صاحب نے دریافت کیا۔

دیوی نے روتی آواز میں جواب دیا۔ "نہیں نہیں
ابھی نہیں نکلا ———— میں مر گئی!! ————"

اتنے میں گلاب پانی کا گلاس لے آ گیا۔ ہیرو اور ولن دوڑ کر بڑھے اور دونوں نے مل کر دیوی کی آنکھ میں پانی چوایا۔ جب گلاس کا پانی آنکھ کو غسل دینے میں ختم ہو گیا۔ تو دیوی پھر اپنی جگہ پہ بیٹھ گئی۔ اور آنکھ جھپکانے لگی

"کیا افاقہ ہوا!"

"اب تکلیف تو نہیں ہے؟"

"کنکری نکل گئی ہوگی"

"بس تھوڑی دیر میں آرام آ جائے گا"

آنکھ دُھل جانے پہ پانی کی ٹھنڈک نے تھوڑی دیر کے لئے دیوی کی آنکھ میں چُبھن رفع کر دی۔ مگر فوراً ہی پھر سے اس نے درد کے مارے چلّانا شروع کر دیا۔

"کیا بات ہے؟ یہ کہتے ہوئے ایک صاحب باہر سے اندر آئے اور دروازے کے قریب کھڑے ہو کر معاملے کی اہمیت کو سمجھنا شروع کر دیا۔

نو وارد کہنہ سال ہونے کے باوجود چست و چالاک معلوم ہوتے تھے مونچھیں سفید تھیں۔ جو بیڑی کے دھوئیں کے باعث سیاہی مائل زرد رنگت اختیار کر چکی تھیں اُن کے کھڑے ہونے کا انداز بتا چکا تھا۔ کہ وہ فوج میں رہ چکے ہیں۔

سیاہ رنگ کی ٹوپی سر پہ ذرا اس طرف ترچھی پہنے ہوئے تھے۔ پتلون اور کوٹ کا کپڑا معمولی اور خاکستری رنگ کا تھا۔ گھٹنوں اور رانوں کے اوپر پتلون میں

پڑے ہوئے جھول اس بات پر چغلیاں کھا رہے تھے کہ اُن کی ٹانگوں پہ گوشت بہت کم ہے کالر میں بندھی ہوئی میلی نکٹائی کچھ اس طرح نیچے لٹک رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا وہ اُن سے روٹھی ہوئی ہے ۔ پتلون کا کپڑا گھٹنوں پر کھچ کر آگے بڑھا ہوا تھا۔ جو یہ بتا رہا تھا کہ اس بے جان چیز سے بہت بڑا کام لیتے رہے ہیں۔ گال بڑھاپے کے باعث پچکے ہوئے آنکھیں ذرا اندر کو دھنسی ہوئیں جو بار بار شانوں کی جنبش کے ساتھ سکیڑ لی جاتی تھیں

آپ نے کاندھوں کو جنبش دی اور قدم بڑھا کر کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے پوچھا۔ "کنکر پڑ گیا ہے ۔ ؟ اور اثبات میں جواب پا کر دیوی کی طرف بڑھے ۔ ہیرا اور روشن کو ایک طرف ہٹنے کا اشارہ کر کے آپ نے کہا پانی سے آرام نہیں آیا ——— خیر ——— رومال ہے کسی کے پاس؟

نصف درجن رومال ان کے ہاتھ میں دے دیئے گئے۔ بڑے انداز میں آپ نے اُن پیش کردہ رومالوں میں سے ایک منتخب کیا اور اس کا کنارہ پکڑ کر دیوی کو آنکھ پر سے ہاتھ اٹھا لینے کا حکم دیا ۔

جب دیوی نے اُن کے حکم کی تعمیل کی تو انہوں نے جیب میں سے مداری کے سے انداز میں ایک چمڑی بٹوا نکالا ۔ اور اُس میں سے اپنا چشمہ نکال کر کمال احتیاط سے ناک پر چڑھا لیا ۔ پھر چشمے کے شیشوں میں سے دیوی کی آنکھ کا دور ہی سے اکڑ کر معائنہ کیا۔ پھر دفعتاً فوٹو گرافر کی سی پھرتی دکھاتے ہوئے آپ نے اپنی ٹانگیں چوڑی کیں ۔ اور جب انہوں نے اپنی پتلی پتلی انگلیوں سے دیوی کے پپوٹوں کو وا کرنا چاہا تو ایسا معلوم ہوا کہ فوٹو لینے

وقت کیمرے کا لینس بند کر رہے ہیں

دو تین مرتبہ ڈرامائی انداز سے اپنے کھڑے ہونے کا رُخ بدل کر انہوں نے دیوی کی آنکھ کا معائنہ کیا اور پھر پپوٹے کھول کر بڑی آہستگی سے رومال کا کنارہ اُن کے اندر داخل کر دیا —— حاضرین خاموشی سے اس عمل کو دیکھتے رہے۔

پانچ منٹ تک کمرے میں قبر کی سی خاموشی طاری رہی۔ آنکھ صاف کرنے کے بعد اُسی ڈرامائی انداز میں فوٹوگرافر صاحب نے —— چونکہ وہ بزرگ فوٹوگرافر ہی تھے، چشمہ اتار کر چمڑے کے بٹوے میں رکھ کر دیوی سے کہا۔ اب کنکر نکل گیا ہے۔ تھوڑی دیر میں آرام آجائے گا۔

دیوی نے آنکھ کے پپوٹوں میں انگلیوں سے چھوا اور ننھا سا آئینہ نکال کر اپنا اطمینان کرنے لگی۔

"کنکر نکل گئی نا؟"

"اب تو درد محسوس نہیں ہوتا۔"

"سالا اب نکل گیا ہوگا —— بہت دکھ دیا ہے اُس نے!"

"دیوی —— اب طبیعت کیسی ہے؟"

یہ شور سن کر فوٹوگرافر صاحب نے کاندھوں کو زور سے جنبش دی اور کہا "تم سارا دن کوشش کرتے رہتے مگر کچھ نہ ہوتا —— ہم فوج میں پچیس برس پہاڑ نہیں جھونکتا رہا —— یہ سب کام جانتا ہے۔ —— کنکر نکل گیا ہے۔ اب صرف جلن باقی ہے، وہ بھی دور ہو جائے گی

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دیوی جو آئینے میں روتی صورت بنلئے اپنا اطمینان کر رہی تھی، ایکا ایکی مسکرائی اور پھر کھلکھلا کر ہنس دی ——— چوبی کمرے میں ترنم تارے بکھر گئے۔

"اب آرام ہے ـــ ـــ اب آرام ہے" یہ کہہ کر دیوی سیٹھ کی جانب روانہ ہو گئی جو ہوٹل کے پاس اکیلا کھڑا تھا اور سب لوگ دیکھتے رہ گئے۔

ہیرو صاحب صوفے پر بیٹھنے لگے تو منشی صاحب کی ران نیچے دب گئی۔" آپ بھنا گئے۔" اب کیا پھر سونے کا ارادہ ہے۔ چلو بیٹھو۔" مجھے کل والے سین کے ڈائیلاگ سناؤ۔"

ہیرو کے دماغ میں اس وقت کوئی ادھ ہی سین تھا۔

نامکمّل تحریر

"میں جب کبھی ذیل کا واقعہ یاد کرتا ہوں، میرے ہونٹوں میں سوئیاں سی چُبھنے لگیں۔"

ساری رات بارش ہوتی رہی تھی۔ جس کے باعث موسم خنک ہو گیا تھا۔ جب میں صبح سویرے غسل خانے کے ہوٹل سے باہر نکلا تو دھلی ہوئی پہاڑیوں اور نہائے ہوئے ہرے بھرے پیڑوں کی تازگی دیکھ کر طبیعت پر وہی کیفیت پیدا ہوئی جو خوبصورت کنواریوں کے جھرمٹ میں بیٹھنے سے پیدا ہوتی ہے۔

بارش بند تھی۔ البتہ ننھی ننھی پھوار پڑ رہی تھی۔ پہاڑوں کے اونچے اونچے درختوں پر آوارہ بدلیاں اونگھ رہی تھیں۔ گویا رات بھر برسنے کے بعد تھک کر چور ہو گئی ہیں۔

میں چشمے کی طرف روانہ ہوا۔ کاندھے پر تولیہ تھا۔ ایک ہاتھ میں صابن دانی تھی، دوسرے میں نیکر، جب سڑک کا موڑ طے کرنے لگا تو آنکھوں کے سامنے دھند

ہی دھند نظر آئی ۔ بادل کا ایک بھولا بھٹکا ٹکڑا تھا جو شاید آسمانی فضا سے الگ ہو کر ادھر آ نکلا تھا ۔ اس بادل نے سڑک کے دوسرے حصے کو آنکھوں سے بالکل اوجھل کر دیا تھا ۔ میں نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا ۔ وہاں بھی سفیدی ہی نظر آئی ، اور ایسا معلوم ہوا کہ اوپر سے کوئی دھنکی ہوئی روئی بکھیر رہا ہے ۔

اتنے میں ہوا کے تیز جھونکوں نے اس سفیدی میں ارتعاش پیدا کیا ۔ اور اس دھند میں سے دور شمال بخارات علیحدہ ہونے لگے اور میری ننگی باہوں سے مس ہوئے برف سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کی سردی کے احساس سے وہی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو ان بخارات نے پیدا کی ۔

اس بادل میں سے گزرتے وقت سانس کے ذریعے سے یہ سپید سپید بخارات نفوذ میرے اندر داخل ہو گئے جس سے پھیپھڑوں کو بڑی راحت محسوس ہوئی ۔ میں نے جی بھر کے اس سے لطف اٹھایا ۔ جب بادل کے اس ٹکڑے کو طے کر کے میں باہر آیا تو آنکھوں کو کچھ سجھائی نہ دیا ۔ میرے چشمے کے شیشے کاغذ کے مانند سفید ہو گئے تھے ۔ پھر ایکا ایکی مجھے سردی محسوس ہونے لگی اور جب میں نے اپنے کپڑوں کی طرف دیکھا تو وہ شبنم آلود تکیے کی طرح گیلے ہو رہے تھے ۔

میں غسل خانے کے معاملے میں بہت سست ہوں ۔ اور سردیوں کے موسم میں تو روزانہ غسل کا میں بالکل قائل نہیں ہوں ، در اصل نہانے دھونے کا فلسفہ میری سمجھ میں ہمیشہ بالاتر رہا ہے ۔ غسل کا مطلب یہ ہے کہ غلاظت دور ہو جائے اور روزانہ نہانے کا مطلب یہ ہوا کہ آدمی رات ـــــ میں غلیظ ہو

گندہ ہو جاتا ہے۔ ہاتھ منہ دھو لیا جائے۔ پیر صاف کر لیے جائیں، سر کے بال دھو لیے جائیں۔ اس لیے یہ سب چیزیں جلدی میلی ہو سکتی ہیں۔ مگر ہر روز بدن کیوں صاف کیا جائے جب کہ یہ بہت دیر کے بعد میلا ہوتا ہے۔ گرمیوں میں تو میں خیر نہانے کا مطلب سمجھ سکتا ہوں مگر سردیوں میں اس کا مصرف مجھے نظر نہیں آتا۔ آخر کیا مصیبت پڑی ہے کہ ہر روز صبح سویرے انسان غسل خانے میں جائے۔ سردی کے مارے پورے دو گھنٹے تک دانت بجتے رہیں، انگلیاں سن ہو جائیں اور ناک برف کی ڈلی بن جائے —— غسل نہ ہوا، اچھی خاصی مصیبت ہوئی۔

غسل کے بارے میں اب بھی میرا یہی خیال ہے۔ لیکن جن پہاڑی گاؤں کا ذکر کر رہا ہوں۔ وہاں کی فضا ہی کچھ اس قسم کی تھی کہ جو چیزیں مجھے اب مہمل نظر آتی ہیں یا اس سے پہلے نظر آیا کرتی تھیں۔ وہاں بے معنی دکھائی دیتی تھیں۔ —— اس غسل ہی کو لیجیے جو اس پہاڑی گاؤں میں جتنا عرصہ میں رہا، ہر روز میرا کام پہلا یہ ہوتا تھا کہ نہاؤں، دیر تک نہاتا رہوں۔

چشمے پر پہنچ کر میں نے کپڑے اتارے، نیکر پہنی اور جب پانی کی اس گرتی ہوئی دھار کے پاس گیا جو پتھروں پر گر کر ننھے ننھے چھینٹے اڑا رہی تھی تو پانی کی ایک سرد بوند میری پیٹھ پر آ پڑی۔ میں تڑپ کر ایک طرف ہٹ گیا۔ جہاں بوند گری تھی اس جگہ گدگدی پرکار کی نوک کی طرح چبھی اور سارے جسم پر پھیل گئی۔ میں سمٹا، کانپا اور سوچنے لگا۔ مجھے واقعی نہانا چاہیے، یا نہیں، قریب تھا کہ میں باغی ہو جاؤں۔ لیکن آس پاس نگاہ دوڑائی تو ہر شے نہاتی ہوئی نظر آئی۔

چنانچہ جو باغیانہ خیال میرے دماغ میں اس شریر بوند نے پیدا کئے تھے۔ ٹھنڈے ہو گئے۔

سر دبانی کی گدگدیاں شروع شروع میں تو مجھے بہت ناگوار گزریں۔ مگر جب میں اچی کر ڈالکہ کے نیچے بیٹھ گیا۔ تو لطف آیا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ دونوں ہاتھوں کے ساتھ زور زور سے پانی کے چھینٹے اڑانے سے سردی کی شدت کم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جب میں نے یہ گر معلوم کر لیا تو پھر اس لطف میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

سر دبانی کی موٹی دھار نے عجیب کیفیت پیدا کر دی ـــــــــ پھر جب پانی کے دباؤ سے بال پیشانی پر سے نیچے لٹک آئے اور انہوں نے آنکھوں اور منہ میں گھسنا شروع کر دیا تو زور زور سے پھونکیں مار کر اُن کو ہٹانے کی ناکام سعی نے مزہ اور بھی دوبالا کر دیا۔ کبھی کبھی ڈوب کر ابھرتے ہوئے آدمی کا احساس بھی مجھے ہوا۔ اور میں نے سوچا کہ جو لوگ ڈوب کر مر جاتے ہیں اُن کو ایسی موت میں بے حد لطف آتا ہوگا۔ چشمے کا پانی آنسوؤں کی طرح شفاف تھا ــــ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میرے اردگرد بلبلوں اور پانی کے چھینٹوں کا مشاعرہ ہو رہا ہے۔

غسل سے فارغ ہو کر میں نے تولئے سے بدن پونچھا اور سردی کا احساس کم کرنے کے لئے دھیمے سروں میں ایک گیت گنگنانا شروع کر دیا۔ کبھی کبھی یہ میری گنگناہٹ ہوا کے جھونکوں سے مرتعش ہو جاتی اور میں یہ سمجھتا کہ میرے بجائے کوئی اور آدمی بہت دور گا رہا ہے ـــ اس پر میں تولئے کو زیادہ

زور کے ساتھ بدن پر ملنے لگا۔

بدن خشک ہو گیا تو میں نے کپڑے پہنے۔ اس اثنا میں بوندا باندی شروع ہو گئی۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ میرے عین اوپر بادل کا ایک ٹکڑا اسفنج نما چھتری کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ میں نے جلدی جلدی پہاڑی پر سے اترنا شروع کیا۔ اور فوراً ہی کود نا پھاندنا سڑک میں اتر آیا۔ متوقع بارش سے بچنے کے لئے میں نے قدم تیز کر دیئے لیکن ابھی سڑک پر بمشکل ایک جریب کا فاصلہ طے کرنے پایا تھا کہ "اے بکری، بکری" کی آواز بلند ہوئی۔ پھر اس کے ساتھ ہی دو پہاڑیوں نے اس آواز کو دبوچ کر دوبارہ ہوا میں اچھال دیا۔ میرے جی میں آئی کہ میں بھی اس آواز کو گیند کی طرح دبوچ لوں اور ہمیشہ کے لئے اپنی جیب میں ڈال لوں۔

میں ٹھہر گیا۔ وہی مانوس دل صدا تھی جو اس سے قبل میں کئی مرتبہ سن چکا تھا۔ بظاہر "اے بکری بکری" تین معمولی لفظ ہیں اور کاغذ پر کوئی ایسا تصور پیش نہیں کرتے۔ جو اتنا حسین ہو مگر واقعہ ہے کہ میرے لئے ان میں وہ سب کچھ تھا جو روح کو مسرور کر سکتا ہے۔ جونہی یہ آواز میری سماعت سے مس ہوئی۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ پہاڑ کی چھاتی میں سے صدیوں کی رکی ہوئی آواز نکلی ہے ——— اور سیدھی آسمان تک پہنچ گئی ہے۔

"اے" بالکل دھیمی آواز میں، اور "بکری بکری" بلند اور فلک رس سرکس میں ایک لمحہ کے لئے یہ نعرۂ شباب پہاڑوں کی سنگین دیواروں میں گونجنا ڈوبنا، ابھرتا، تھرتھراتا اور رباب کے تاروں کی آخری لرزش کی،

طرح کانپتا فضا میں گھُل مل جاتا ۔

کالی کالی بدلیاں چھارہی تھیں ۔ فضا نم آلود تھی ، ہوا کے جھونکوں نے اس نمی میں غنودگی کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی — میں نے اوپر پہاڑی پر ، اُگی ہوئی ہری ہری جھاڑیوں کی طرف دیکھا اور اُن کے عقب میں مجھے دو نمین بکریاں نظر آئیں ۔ میں نے اوپر چڑھنا شروع کر دیا ۔ ایک ، منہ زور بکری وزیرہ کو گھسیٹے لے جا رہی تھی ۔ اور وہ اس کو ڈانٹ بتانے کے لئے ائے بکری ، بکری پکار رہی تھی ۔ اس کا منہ غصہ اور زور لگانے کے باعث پکھلتے ہوتے تانبے کی رنگت اختیار کر گیا تھا ۔ بکری کے گلے میں بندھی ہوئی رسّی کو پوری طاقت سے کھینچنے میں اس کا سینہ غیر معلوم طور پر عریاں ہو گیا تھا ۔ سر پیچھے جھکایا تھا ۔ دونوں ہاتھ آگے بڑھے ہوئے سر پر سے دوپٹہ اتر کر باہوں میں چلا آیا تھا ۔ پیشانی پر سیاہ بالوں کی لٹیں بل کھاتی ہوئی سنپولیاں معلوم ہو رہی تھیں ۔

ایک سبز جھاڑی کے پاس پہنچ کر بکری دفعتہً ٹھہر گئی ۔ اور اس کے نرم نرم پتوں کو اپنی تھوتھنی سے سونگھنا شروع کر دیا ۔ یہ دیکھ کر وزیرہ نے اطمینان کا سانس لیا اور اپنا اترا ہوا دوپٹہ ایک بڑے سے پتھر پر رکھ کر اس نے پاس والے درخت کے تنے سے بکری کے گلے میں بندھی ہوئی رسّی باندھی اور دوسرے پیڑ کی جھکی ہوئی ٹہنی پکڑ کر جھولا جھولنے لگی ۔

میں جھاڑیوں کے پیچھے کھڑا تھا ۔ بازو اوپر اُٹھانے کے باعث اُس کی کھلی آستینیں نیچے ڈھلک آئیں ۔ کپڑے کے چھلکے سے "جب" اترے تو اُسکے

بازو کندھوں تک عریاں ہو گئے۔ بڑی خوبصورت باہیں تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہاتھی کے دو بڑے دانت اوپر کو اٹھے ہوئے ہیں۔ بے داغ، ہموار اور زندگی سے بھرپور۔"

وہ جھولا جھول رہی تھی اور اس کے دونوں بازو کچھ انداز سے اُوپر کی جانب اُٹھے ہوئے تھے کہ مجھے یہ اندیشہ لاحق ہوا۔ کہ وہ آسمان کی طرف پرواز کر جائے گی۔ جھاڑیوں کے عقب سے نکل کر میں اُس کے سامنے آگیا۔ دفعتہً اُس نے میری طرف نگاہیں اٹھائیں، سٹ پٹائی ٹہنی کو اپنے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد کر دیا۔ گری سنبھلی اور حلق میں سے ایک مدھم چیخ نکالتی دوڑ کر دوپٹہ لینے کے لئے پتھر کی طرف بڑھی ———— مگر دوپٹہ میری بغل میں تھا۔

اُس نے دوپٹہ کی تلاش میں یہ جانتے بوجھتے کہ وہ میری بغل میں اِدھر اُدھر دیکھا اور مسکرا دی اور اُس کی آنکھوں میں حیا کے گلابی ڈورے اُبھر آئے، گال اور سُرخ ہو گئے اور وہ سمٹنے کی کوشش کرنے لگی۔ دونوں بازؤں کی مدد سے اُس نے اپنے سینے کی شوخیوں کو چھپا لیا اور انہیں اور زیادہ چھپانے کی کوشش کرتی وہ پتھر پر بیٹھ گئی۔ اور اس پر بھی جب اُسے اطمینان نہ ہوا۔ تو اس نے گھٹنے اوپر کر لئے اور مجھ سے بگڑ کر کہنے لگی۔

یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ میرا دوپٹہ لائیے۔

میں بڑھا اور بغل میں سے دوپٹہ نکال کر اس کے گھٹنے پر رکھ دیا۔ مجھے اس کے بیٹھنے کا انداز بہت پسند آیا۔ چنانچہ میں بھی اسی طرح کے پاس بیٹھ گیا۔ اُس کی طرف غور سے دیکھا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وزیر جو ان آوازوں کا ایک

بہت بڑا انبار ہے ۔ اور میں ——— اور میں خدا معلوم کیا ہوں، اس کو ہاتھ لگاؤں کہ وہ باجے کی طرح بجنا شروع ہو جائے گی۔ ایسے سُر اس میں سے نکلیں گے جو مجھے بہت اوپر لے جائیں گے اور زمین و آسمان کے درمیان کسی ایسی جگہ معلق کر دیں گے، جہاں میں کوئی آواز سن سکوں گا۔

وزیر نے مجھے جنگلی بلی کی طرح گھور کر دیکھا۔ گویا کہنا چاہتی ہے اب جاؤ، یہاں دھرنا دے کر کیوں بیٹھ گئے ہو۔ میں نے اس کے اس خاموش حکم کی کوئی پرواہ نہ کی اور کہا:۔

"چشمے سے واپس آ رہا تھا کہ تمہاری سنی بے اختیار کھنچا چلا آیا۔"

وزیر ——— تمہاری یہ آواز مجھے یقیناً پاگل بنا دے گی ——— جانتی ہو، پاگل آدمی بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔

میری یہ بات سن کر اس کو حیرت ہوئی "یہ کیا پاگل پن ہے ——— میری آواز کسی کو کیوں پاگل بنانے لگی۔"

میں نے کہا: "جیسے کچھ جانتی ہی نہیں ہو ——— دنیا میں یہ راگ راگنیاں کہاں سے آئی ہیں ——— لیکن چھوڑو اس قصے کو یہ بتاؤ میری ایک بات مانو گی؟"

"مان لوں گی پر آپ یہ تو کہیئے کہ بات کیا ہے؟"

"ایک دفعہ میری خاطر اے بکری بکری کا نعرہ بلند کرو۔"

مجھے ہاتھ سے دھکا دے کر اس نے تیز لہجے میں کہا۔ "یہ کیا پاگل پن ہے۔ بنانے کے لئے صرف میں ایک ہی رہ گئی ہوں۔"

وزیر، بخدا میں تمہیں بنا نہیں رہا۔ مجھے تمہاری آواز پسند ہے۔ جھوٹ کیوں کہوں تو ——— بس اب مان بھی جاؤ، بس ایک بار،

"جی نہیں "

"میں تم سے التجا کرتا ہوں "

"میں نے یہ آواز نہ کبھی نکالی ہے اور نہ اب نکالوں گی "

"میں ایک بار پھر درخواست کرتا ہوں "

"یا اللہ ——— یہ کیا مصیبت ہے " وزیر نے اپنا بدن سکیڑ لیا۔ اور اگر میں نہ مانوں تو ——— یعنی یہ بھی کیا ضروری ہے کہ میں اس وقت آپ کے کہنے پر بیکار چلانا شروع کر دوں ——— آپ تو خواہ مخواہ چھیڑ خوانی کر رہے ہیں۔ اور میں نگوڑی جانے کیا سمجھ رہی ہوں ——— بھئی ہوگا، مذاق اچھا نہیں لگتا "

"وزیر ! " میں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا " میری طرف دیکھو میرے چہرے سے تم اس بات کا اطمینان کر سکتی ہو کہ میں ہنسی مذاق نہیں کر رہا "

اس نے میرے چہرے کی طرف مصنوعی غور سے دیکھا اور میری ناک پر انگلی رکھ کر کہا " آپ کی ناک پر یہ ننھا سا تل کتنا بھلا دکھائی دیتا ہے "

اس وقت میرے جی میں آئی کہ اس پتھر پر جس پہ وہ بیٹھی ہے میں اپنی ناک گھسانا شروع کر دوں۔ تاکہ وہ ننھا سا تل ہمیشہ کے لئے مٹ جائے وزیر نے میری طرف دیکھا تو وہ یہ سمجھی کہ میں روٹھنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔

چنانچہ اُس نے فوراً اپنی بکریوں کی طرف دیکھا۔ اور مجھ سے کہا: "بابا اب آپ خفا نہ ہو جائیے ——"

قریب تھا کہ وہ اپنی مخصوص آواز بلند کرے کہ ایکا ایکی جھجک اس پر غالب آگئی۔ بہت زیادہ شرما کر اُس نے اپنی گردن جھکالی اور کہا: "پر میں پوچھتی ہوں کہ اس میں خاص بات ہی کیا ہے۔!"

میں نے بگڑ کر کہا "ذریعہ تم باتیں نہ بناؤ۔"

دوسری طرف منہ کر کے اس نے ایکا ایکی بلند آواز میں "اے بکری" پکارا۔ اس کے بعد شرمیلی ہنسی کا ایک فوارہ سا اس کے منہ سے پھوٹ پڑا۔ ——————— کتنی صاف اور شفاف آواز میں بلندیوں میں پرواز کر گیا تھی۔ دُھلی ہوئی فضا میں اُس کی گونج دیر تک دور نظر سے اوجھل ہو جانے والے پرندوں کے پروں کی طرح چمکتی رہی پھر غائب ہو گئی۔

ذریعہ کی طرف میں نے دیکھا کہ اب وہ خاموش تھی۔ اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر صاف تھا۔ آنکھیں نہائی ہوئی چڑیوں کی طرح بیقرار تھیں۔ ہنسنے کے باعث اُن میں آنسو بھر آئے۔ ہونٹ اس انداز سے کھلے ہوئے تھے کہ میرے ہونٹوں میں سرسراہٹ پیدا ہو گئی ——————— خدا معلوم کیا ہوا ——— میں نے ذریعہ کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ اس کا سر میری گود میں ڈھلک آیا ——— لیکن ایکا ایکی زور سے وہ اپنا بازو میرے جھکے ہوئے سر اور اپنے متحیر چہرے کے درمیان لے آئی، اور دھڑکتے ہوئے لہجے میں کہنے لگی "آہ، ہٹائیے ہٹائیے ان ہونٹوں کو!"

میری گود سے نکل کر وہ بھاگ گئی۔ اور میرے ہونٹوں کی تحریر نامکمل رہ گئی۔

اس واقعہ کو ایک زمانہ گزر چکا ہے۔ مگر جب کبھی میں اس کو یاد کرتا ہوں۔ تو میرے ہونٹوں میں سوئیاں سی چبھنے لگتی ہیں ——————— یہ نامکمل بوسہ ہمیشہ میرے ہونٹوں میں اٹکا رہے گا۔

لالٹین

میرا قیام "بٹوٹ" میں گو مختصر تھا۔ لیکن گوناگوں رُوحانی مسرتوں سے پُر۔ میں نے اس کی صحت افزائی میں جتنے دن گذارے ہیں اُن کے ہر لمحہ کی یاد میرے ذہن کا ایک جزو بن کر رہ گئی ہے۔ جو بھلائے نہ بھولے گی ———— کیا دن تھے ———— بار بار میرے دل کی گہرائیوں سے یہ آواز بلند ہوتی ہے۔ اور کئی کئی گھنٹے اس کے زیرِ اثر بے خود مدہوش رہتا ہوں۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ انسان اپنی گذشتہ زندگی کے کھنڈروں پر تخیل کی دیواریں استوار کرتا ہے۔ ان دنوں میں بھی یہی کر رہا ہوں۔ یعنی بیتے ہوئے ایّام کی یاد کو اپنی مضمحل رگوں میں زندگی بخش انجکشن کے طور پر استعمال کر رہا ہوں۔ جو کل ہوا تھا اُسے آج اگر دیکھا جائے، تو اس کے اور ہمارے درمیان صدیوں کا فاصلہ نظر آئے گا۔ اور جو کل ہونا ہے اس کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے اور نہ جان سکتے ہیں۔ آج سے پورے چار مہینے کی طرف دیکھا جائے

تو جھوٹ میں میری زندگی افسانہ معلوم ہوتی ہے۔ ایسا افسانہ جس کا مسودہ صاف نہ کیا گیا ہو۔ اس کھوئی چیز کو حاصل کرنا دوسرے انسانوں کی طرح میرے بس میں نہیں۔ جب میں استقبال کے آئینہ میں اپنی آنے والی زندگی کا عکس دیکھنا چاہتا ہوں تو مجھے حال ہی کی تصویر نظر آتی ہے اور کبھی کبھی اس تصویر کے پس منظر میں ماضی کے دھندلے نقوش نظر آجاتے ہیں۔ ان میں بعض نقش ایسے تیکھے اور شوخ رنگ ہیں کہ شاید ہی انہیں زمانہ کا ہاتھ مکمل طور پر مٹا سکے۔

زندگی کے اس کھوئے ٹکڑے کو میں اس وقت زمانہ کے ہاتھ میں دیکھ رہا ہوں جو شریر بچے کی طرح مجھے بار بار جھلک دکھا کر اپنی پیٹھ کے پیچھے چھپا لیتا ہے ——— اور میں اس کھیل ہی سے خوش ہوں۔ اسی کو غنیمت سمجھتا ہوں۔

ایسے واقعات کو جن کی یاد میرے ذہن میں اب تک تازہ ہے۔ میں عام طور پر دُہراتا رہتا ہوں۔ تاکہ ان کی تمام شدت برقرار رہے۔ اور اس غرض کے لئے میں کئی طریقے استعمال کرتا رہتا ہوں بعض اوقات یہ بیتے ہوئے واقعات اپنے دوستوں کو سنا کر اپنا مطلب حل کر لیتا ہوں اگر آپ کو میرے ان دوستوں سے ملنے کا اتفاق ہو تو وہ آپ سے یقیناً یہی کہیں گے کہ میں قصہ گوئی اور آپ بیتیاں سنانے کا بالکل سلیقہ نہیں رکھتا۔ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ داستان سنانے کے دوران میں مجھے سامعین کے تیوروں سے ہمیشہ اس بات کا احساس ہوا ہے کہ میرا بیان غیر مربوط ہے۔ اور میں جانتا

ہوں کہ چونکہ میری داستان میں ہمواری کم اور جھٹکے زیادہ ہوتے ہیں۔ اس لئے میں اپنے محسوسات کو اچھی طرح کسی کے دماغ پر منتقل نہیں کر سکتا۔ اور مجھے اندیشہ ہے کہ میں ایسا شائد ہی کر سکوں۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ میں اکثر اوقات اپنی داستان سناتے سناتے جب ایسے مقام پر پہنچا ہوں جس کی یاد میرے ذہن میں نہ تھی اور نہ وہ خیالات کی رو میں خود بخود بہہ کر چلی آئی تھی تو غیر ارادی طور پر اس نئی یاد کی گہرائیوں میں گم ہو جاتا ہوں۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میرے بیان کا تسلسل یک لخت منتشر ہو جاتا ہے اور جب میں ان گہرائیوں سے نکل کر داستان سنانے کے ٹوٹے ہوئے دھاگے کو جوڑنا چاہتا ہوں تو عجلت میں وہ ٹھیک طور سے نہیں جڑتا۔

کبھی کبھی یہ داستانیں رات کو سوتے وقت اپنے ذہن کی زبانی خود سنتا ہوں، لیکن ——— اس میں مجھے تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ میرے ذہن کی زبان بہت تیز ہے اور اس کو قابو میں رکھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے بعض اوقات چھوٹے چھوٹے واقعات اپنی تفصیل کے ساتھ خود بخود بیان ہونا شروع ہو جاتے ہیں، کہ طبیعت اکتا جاتی ہے۔ اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک واقعہ کی یاد کسی دوسرے واقعہ کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔ اور اس کا احساس کسی دوسرے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ اور پھر احساسات و افکار کی بارش زوروں پر شروع ہو جاتی ہے۔ اور اتنا شور مچتا ہے کہ نیند حرام ہو جاتی ہے۔ جس روز صبح کو میری آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے نظر آئیں، آپ سمجھ لیا کریں کہ ساری رات میں اپنے ذہن کی قصہ

گوئی کا شکار بنا رہا ہوں ۔

جب مجھے کسی بیتے ہوئے واقعہ کو اس کی تمام شدتوں سمیت محفوظ کرنا ہوتا ہے تو میں قلم اٹھاتا ہوں اور کسی گوشے میں بیٹھ کر کاغذ پر اپنی زندگی کی اس ٹکڑے کی تصویر کھینچ دیتا ہوں ۔ یہ تصویر بھدّی معلوم ہوتی ہے ۔ یا خوبصورت اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ ہمارے ادبی نقاد میری ان قلمی تصویروں کے متعلق کیا رائے مرتّب کرتے ہیں دراصل مجھے اُن لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں ۔ اگر میری تصویر کشی سقیم اور خام ہے تو ہوا کرے ۔ مجھے اس سے کیا سروکار ہو سکتا ہے ۔ میں یہ کہانیاں صرف اس لئے لکھتا ہوں کہ مجھے کچھ لکھنا ہوتا ہے جس طرح عادی شراب خوردن ۔ ڈھلے شراب کا رُخ کرتا ہے ٹھیک اسی طرح انگلیاں بے اختیار قلم کی طرف بڑھتی ہیں ۔ اور میں لکھنا شروع کر دیتا ہوں ۔ میرا رُوئے سخن یا تو اپنی طرف ہوتا ہے ۔ یا ان چند افراد کی طرف جو میری تحریروں سے دلچسپی لیتے ہیں ۔ میں ادب سے دور اور زندگی سے نزدیک تر ہوں ۔

زندگی ——— زندگی ——— آہ زندگی !!

میں زندگی زندگی پکارتا ہوں، مگر مجھ میں زندگی کہاں

اور شائد یہی وجہ ہے کہ میں اپنی عمر کی پٹاری کھول کر اس کی ساری چیزیں باہر نکالتا ہوں ۔ ور جھاڑ پونچھ کر بڑے قرینے سے ایک قطار میں رکھتا ہوں اور اس آدمی کی طرح جس کے گھر میں بہت تھوڑا سامان ہو اُن

کی نمائش کرتا ہوں۔ بعض اوقات مجھے اپنا یہ فعل بہت بُرا معلوم ہوتا ہے" لیکن میں کیا کروں مجبور ہوں۔ میرے پاس اگر زیادہ نہیں ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اگر مجھ میں سفلہ پن پیدا ہو گیا ہے۔ تو اس کا ذمہ دار میں کیسے ہو سکتا ہوں۔ میرے پاس تھوڑا بہت جو کچھ بھی ہے غنیمت ہے۔ دنیا میں ایسے بھی تو لوگ ہوں گے جن کی زندگی چٹیل میدان کی طرح خشک ہے اور میری زندگی کے ریگستان پر تو ایک بار بارش ہو چکی ہے۔

گو میرا شباب ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکا ہے مگر میں ان دنوں کی یاد پوجی رہا ہوں۔ جب میں جوان تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ سہارا بھی ایک روز جواب دے جائے گا اور اس کے بعد جو کچھ ہوگا میں بتا نہیں سکتا۔ لیکن اپنے موجودہ انتشار کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرا انجام چشم فلک کو نمناک کر دے گا۔ آہ خرابہ فکر انجام

وہ شخص جسے انجام کار اپنے افکار کے نیچے دب جانا ہے۔ یہ سطور لکھ رہا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہ ایسی اور بہت سی سطریں لکھنے کی تمنا اپنے دل میں رکھتا ہے۔

میں ہمیشہ مغموم و ملول رہا ہوں۔ لیکن بہ تسلیم جاننا ہے کہ بسوٹے میں میری آنکھوں کی زردی اور رنجش کے ساتھ ساتھ ایک خوشگوار مسرت کی سرخی اور ٹھنڈک بھی تھی۔ وہ آب و آتش کے اس باہمی ملاپ کو دیکھ کر متعجب ہوتا تھا اور غالباً یہی چیز تھی جس نے اس کی نگاہوں میں میرے وجود کو ایک معمہ بنا دیا تھا۔ کبھی کبھی وہ سمجھنے کی کوشش میں وہ میرے نزدیک

آبھی جاتا تھا۔ مگر دفعتہً کوئی ایسا حادثہ وقوع پذیر ہوتا جس کے باعث اُسے پھر پرے ہٹنا پڑتا تھا اور اس طرح پھر نئی شدت سے مجھے پراسرار اور کبھی پر تفس انسان سمجھنے لگا تھا۔

اکرام صاحب حیران تھے کہ ٹیوٹ جیسی غیر آباد اور غیر دلچسپ دیہات میں پڑے رہنے سے میرا کیا مقصد ہے۔ وہ ایسا کیوں سوچتے تھے۔؟ اس کی وجہ میرے خیال میں صرف یہ ہے اُن کے پاس سوچنے کے لئے اور کچھ نہیں تھا۔ چنانچہ وہ اسی مسئلہ پر غور و فکر کرتے تھے۔

وزیر کا گھر اُن کے سامنے بلند پہاڑی پر تھا اور جب انہوں نے اپنے نوکر کی زبانی یہ معلوم کیا کہ میں اس پہاڑی لڑکی کے ساتھ پہروں باتیں کرتا رہتا ہوں تو انہوں نے یہ سمجھا کہ میری دکھتی ہوئی رگ اُن کے ہاتھ آگئی ہے اور انہوں نے ایک ایسا راز معلوم کر لیا ہے جس کے افشا پر تمام دنیا کے دروازے مجھ پر بند ہو جائیں گے۔ لوگوں سے وہ جب اس مسئلے پر باتیں کرنے لگے کہ میں تعیش پسند ہوں۔ اور ایک بھولی بھالی لڑکی کو پھانس رہا ہوں۔ اور ایک بار جب انہوں نے مجھ سے بات کی تو کہا۔ دیکھو یہ پہاڑی دوشیزہ بڑی خطرناک ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ اُس کے جال میں پھنس جائیں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انہوں نے یا کسی اور کو میرے معاملات سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ وزیر کا کیریکٹر بہت خراب تھا۔ اور میرا کیریکٹر بھی کوئی خاص اچھا نہیں تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ لوگ میری فکر میں مبتلا تھے اور پھر جو اُن کے من میں تھا۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتے تھے۔ وزیر پر

میرا کوئی حق نہ تھا، ورنہ وہ میرے دباؤ میں تھی۔ اکرام صاحب یا کوئی صاحب اگر اس سے دوستانہ پیدا کرنا چاہتے تو مجھے اس میں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ در اصل ہماری تہذیب و معاشرت ہی کچھ اس قسم کی ہے کہ عام طور پہ صاف گوئی کو معیوب خیال کیا جاتا ہے۔ کھل کر بات ہی نہیں کی جاتی اور کسی کے متعلق اگر اظہارِ خیال کیا بھی جاتا ہے۔ تو غلاف چڑھا کر۔

میں نے صاف گوئی سے کام لیا اور پہاڑی لونڈیا سے جسے بڑا خطرناک کہا جاتا تھا۔ اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔ لیکن چونکہ یہ لوگ اپنے دل کی آواز کو دل ہی دل میں دبا دینے کے عادی تھے۔ اس لیئے میری سچی باتیں اُن کو جھوٹی معلوم ہوئیں اور ان کو شک بدستور قائم رہا۔

میں انہیں کیسے یقین دلاتا کہ میں اگر وزیر سے دلچسپی لیتا ہوں تو اس کا باعث یہ ہے کہ میرا ماضی وہاں تاریک ہے مجھے اس سے محبت ہی نہیں تھی۔ اس لیے میں اس سے زیادہ وابستہ تھا۔ وزیر سے میری [illegible] کار سہل تھی۔ جو میرے دل میں اس عورت کے لیے موجود ہے جو آج تک میری زندگی میں نہیں آئی ——— میری زندگی کی انگوٹھی میں وزیر ایک چھوٹا سا نگینہ تھی۔ لیکن یہ نگینہ مجھے عزیز تھا۔ اس لئے کہ اس کی تراش اس کا ناپ بالکل اصلی نگینہ کے مطابق تھا۔ جس کی تلاش میں میں ہمیشہ ناکام رہا ہوں۔

وزیر سے میری وابستگی بے غرض نہیں تھی۔ اس میں غرض مند تھا وہ شخص جو اپنے غم افزا ماحول کو کسی کے وجود سے رونق بخشنا چاہتا

ہو اس سے زیادہ خود غرض کون ہو سکتا ہے ؟ اس لحاظ سے میں وزیر کا ممنون بھی تھا۔ اور خدا گواہ ہے کہ میں جب کبھی اس کو یاد کرتا ہوں تو بے اختیار میرا دل اس کا شکریہ ادا کرتا ہے

شہر میں مجھے صرف ایک کام تھا ——— اپنے ماضی و حال اور مستقبل کے گھُپ اندھیرے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہنا اور بس ——— ——— مگر بٹوٹ میں اس تاریکی کے اندر روشنی کی ایک شعاع تھی۔ وزیر کی لالٹین

بٹیارے کے ہاں رات کو کھانا کھانے کے بعد میں اور شبیر ٹہلتے ٹہلتے اکرام صاحب کے بنگلے کے پاس پہنچ جاتے، یہ بنگلہ ہوٹل سے قریباً تین جریب کے فاصلے پر تھا۔ رات کی خنک اور نیم مرطوب ہوائیں اس چہل قدمی کا بہت لطف آتا تھا۔ سڑک کے دائیں بائیں پہاڑیوں اور ڈھلوانوں پر مکئی کے کھیت رات کے دھندلکے میں خاکستری رنگ کے بڑے بڑے قالین معلوم ہوتے تھے اور جب ہوا کے جھونکے مکئی کے پودوں میں لرزش پیدا کر دیتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ آسمان سے بہت سی پریاں ان قالینوں پر اتر آئی ہیں اور ہوئے ہوئے ناچ رہی ہیں ——— ادھا راستہ طے کرنے پر جب ہم سڑک کے بائیں طرف ایک چھوٹے سے دو منزلہ چوبی مکان کے قریب پہنچے تو شبیر اپنی مخصوص دھن میں یہ شعر گاتا ہے

ہر قدم پہ فتنہ ہے قیامت ہے آسمان تیری چال کیا جانے

یہ شعر گانے کی خاص وجہ یہ تھی کہ اس چوبی مکانے کے رہنے والے اس غلط فہمی میں مبتلا رہتے تھے کہ میرے اور شبیر کے تعلقات اخلاقی نقطۂ نگاہ سے ٹھیک نہیں حالانکہ وہ اخلاقی معانی سے بالکل ناآشنا تھے۔ یہ لوگ مجھ سے اور شبیر سے بہت دلچسپی لیتے تھے۔ اور میری نقل و حرکت پر خاص طور پر نگرانی رکھتے تھے۔ وہ تفریح کی غرض سے بٹوٹ آئے تھے اور انہیں تفریح کا کافی سامان مل گیا تھا۔ شبیر اپنے والا شعر گا کر ان کی تفریح میں اضافہ کیا کرتا تھا۔ اُس کو خاص لطف آتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کو رہائش گاہ کے عین سامنے پہنچ کر اُس کو یہ شعر یاد آجاتا تھا اور وہ فوراً اسے بلند آواز میں گا دیا کرتا تھا رفتہ رفتہ وہ اس کا عادی ہو گیا تھا۔

یہ شعر کسی خاص واقعہ یا اثر سے تعلق نہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ اسے صرف یہی شعر یاد تھا۔ یا ہو سکتا ہے کہ وہ صرف اسی شعر کو گا سکتا ہے۔ ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ بار بار یہی شعر دہراتا۔

شروع شروع میں اندھیری راتوں میں سنسان سڑک پر ہماری چہل قدمی چوبی مکان کے چوبی ساکنوں پر (وہ غیر معمولی طور پر اُجڈ اور گنوار واقع ہوئے تھے) کوئی اثر پذیر پیدا نہ کر سکی۔ مگر کچھ دنوں کے بعد اُن کے بالائی کمرے میں روشنی نظر آنے لگی۔ اور ہماری آمد کے منتظر رہنے لگے اور جب ایک روز ان میں سے ایک نے اندھیرے میں ہمارا رُخ معلوم کرنے کے لئے بیٹری روشن کی۔ میں نے شبیر سے کہا۔ آج ہمارا رومان مکمل ہے۔ مگر میں نے دل میں ان لوگوں کی قابلِ رحم حالت پر بہت افسوس کیا کہ وہ اپنے،

بیکار دو، دو، تین تین گھنٹے تک جاگتے رہتے تھے۔

حسبِ معمول ایک بار شبیر نے اس مکان کے پاس پہنچ کر شعر گایا اور ہم آگے بڑھ گئے۔ بیڑی کی روشنی حسبِ معمول چمکی اور ہم باتیں کرتے ہوئے اکرام صاحب کے بنگلے کے پاس پہنچ گئے۔ اس وقت رات کے دس بجے بج گئے۔ ہُو کا عالم تھا۔ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ آسمان ہم پر مرتبان کے ڈھکنے کی طرح جھکا ہوا تھا۔ اور میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ ہم کسی بند بوتل میں چل پھر رہے ہیں۔ سکوت اپنی آخری حد تک پہنچ کر متکلم ہو گیا تھا۔

بنگلے کے باہر برآمدے میں ایک چھوٹی سی میز پر لیمپ جل رہا ہے۔ اور پاس ہی پلنگ پر لیٹے اکرام صاحب کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھے۔ شبیر نے دور سے ان کی طرف دیکھا۔ اور دفعتہً سادھوؤں کا مخصوص نعرہ 'مستانہ الکھ نرنجن' بلند کیا۔ اس غیر متوقع شور نے مجھے اور اکرام صاحب دونوں کو چونکا دیا۔ شبیر کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ پھر ہم دونوں برآمدے میں داخل ہو کر اکرم کے پاس بیٹھ گئے۔ میرا منہ سڑک کی جانب تھا۔ عین اس وقت جب میں نے حقے کی نے منہ میں دبائی۔ مجھے سامنے کی سڑک کے اوپر تاریکی میں روشنی کی ایک جھلک دکھائی دی۔ پھر ایک متحرک سایہ نظر آیا۔ اور اس کے بعد روشنی ایک جگہ ساکن ہو گئی۔ میں نے خیال کیا کہ شاید ذریہ کا بھائی اپنے کُتے کو ڈھونڈ رہا ہے۔ چنانچہ ادھر دیکھنا چھوڑ کر میں شبیر اور اکرم صاحب کے ساتھ باتیں کرنے میں مشغول ہو گیا

دوسرے روز شبیر کے نعرہ بلند کرنے کے بعد پھر اخروٹ کے درخت

کے عقب میں روشنی نمودار ہوئی اور سایہ حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔ تیسرے روز بھی ایسا ہی ہوا چوتھے روز صبح کو میں اور شبیرؔ چشمے پر غسل کو جا رہے تھے۔ کہ اوپر سے ایک کنکر گرا۔ میں نے اور شبیر نے بیک وقت سڑک کے اوپر جھاڑیوں کی طرف دیکھا۔ وزیرہ سر پہ پانی کا گھڑا اُٹھائے ہماری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنسی اور شبیر سے کہنے لگی۔ "کیوں جناب یہ آپ نے کیا وطیرہ اختیار کیا ہے کہ ہر روز ہماری نیند خراب کریں"

شبیر حیرت زدہ ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میں وزیرہ کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

شبیر نے اس سے کہا: "آج آپ پہیلیوں میں بات کر رہی ہیں"

وزیرہ نے سر پر گھڑے کا توازن قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا میں اتنی دیر تک لالٹین جلا کر اخروٹ کے نیچے بیٹھی رہتی ہوں اور آپ سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ چھوٹے منہ سے شکریہ ہی ادا کریں۔ بھلا آپ کی چوٹی کو غرض پڑی کیا ہے۔

یہ چوکیدار تو میرے ہی ذمہ ہے

آپ ٹہلنے کو نکلیں اور اکرم صاحب کے بنگلے میں گھنٹوں باتیں کرتے رہیں اور میں سامنے لالٹین لئے اُونگھتی رہوں۔

شبیر نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ بھئی میں تو کچھ نہ سمجھا یہ کس دھن میں الاپ رہی ہیں؟

میں نے شبیر کو جواب نہ دیا۔ اور وزیر سے کہا۔ ہم کئی دنوں سے رات گئے اکرام صاحب کے یہاں آتے ہیں۔ دو تین مرتبہ میں نے اخروٹ کے پیچھے تمہاری لالٹین دیکھی، پر مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم خاص ہمارے لئے ہی آتی ہو ——— اس کی کیا ضرورت ہے ——— تم ناحق اپنی نیند خراب کیوں کرتی ہو۔"

وزیر نے شبیر کو مخاطب کر کے کہا "آپ کے دوست بڑے ہی ناشکرے ہیں۔ ایک تو میں اُن کی حفاظت کروں اور اوپر سے یہی مجھ پر احسان جتائیں، اُن کو اپنی جان پیاری نہ ہو پر ——— " وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی، اور بات کا رُخ یوں بدل دیا۔ "آپ تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہاں ان کے بہت دُشمن پیدا ہو گئے ہیں۔ پھر آپ انہیں کیوں نہیں سمجھاتے کہ رات کو باہر نہ نکلا کریں"

وزیر کو واقعی میری بات کی بہت فکر تھی۔ بعض اوقات وہ مجھے بالکل بچہ سمجھ کر میری حفاظت کی تدبیریں سوچا کرتی تھی۔ جیسے وہ خود محفوظ و مامون ہے اور میں بہت سی بلاؤں میں گھرا ہوا ہوں۔ میں نے اُسے کبھی نہ ٹوکا تھا۔ اس لئے میں نہیں چاہتا تھا کہ اُسے اس شغل سے باز رکھوں جس سے وہ لطف اٹھاتی ہے۔ اس کی اور میری حالت بعینہٖ ایک جیسی تھی۔ ہم دونوں ایک ہی منزل کی طرف جانے والے مسافر تھے جو ایک لق و دق صحرا میں ایک دوسرے سے مل گئے تھے۔ اُسے میری ضرورت تھی اور مجھے اس کی تاکہ ہمارا سفر اچھی طرح کٹ سکے۔ میرا اور اس کا صرف یہ رشتہ تھا جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

ہم ہر شب مقررہ وقت پر ٹہلنے کو نکلتے اور شبیر چوبی مکان کے پاس پہنچ کر گاتا۔ پھر اکرام صاحب کے بنگلے سے کچھ دُور کھڑے ہو کر نعرہ بلند کرتا۔ وزیر لالٹین روشن کرتی اور اس کی روشنی کو ہوا میں لہرا کر ایک جھاڑی کے پیچھے بیٹھ جاتی۔ شبیر، اکرام سے باتیں کرنے میں مشغول ہو جاتا اور میں لالٹین کی روشنی میں اس روشنی کے ذرّے ڈھونڈتا رہتا، جس سے میری زندگی منوّر ہو سکتی تھی۔ وزیر جھاڑیوں کے پیچھے نہ جانے بیٹھی کیا سوچتی رہتی؟

انتظار

(گھڑی آٹھ بجاتی ہے)

منتظر۔ آدھا گھنٹہ ——— صرف آدھا گھنٹہ اور پھر اس کے بعد ———
——— ٹن مَن کی آخری ڈوبتی ہوئی گونج کتنی پیاری تھی۔ اور
——— اور ——— اگر وہ نہ آئی ——— یعنی اگر ———

منتظر۔ کیوں نہ آئے گی۔ ضرور آئے گی (پھیکی ہنسی) ——— یہ اندیشے بالکل فضول ہیں (اپنے آپ کو تسلّی دینے کے انداز میں) اُس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔

منطقی وجود۔ وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا۔

منتظر۔ کتنا لغو خیال ہے۔ کسی کے شعر کا ایک مصرعہ ہے۔ شاید لیکن کسی قدر امیا زو ہے۔ ایسی شاعری ہی نے تو ——— وہ ضرور آئے گی
اور شاعری ——— شاعری اچھی چیز ہے ——— پسپائی

پر جو یہ گلدان پڑا ہے۔ میں نے اس میں ابھی تک پھول کیوں نہ سجائے۔:
(پھول دان اٹھاتا ہے) —— یہ پھول دان اسے پسند تھا۔
آج وہ اسے اور بھی پسند کرے گی۔ نرگس اور بنفشہ کے پھول اسے بہت
بھاتے ہیں —— یہاں پہ یہ ٹھیک رہے گا۔ کیوں (پھول دان پھر وہیں
رکھ دیتا ہے۔ سیٹی بجاتا ہے۔)

منطقی وجود (اسی دھن میں یہ شعر گاتا ہے۔) ؎

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے۔
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں!

—— وقفہ ——

منظور (یک لخت ایک ایک لفظ کر کے):—— آئیں —— گھر ——
میں —— ہمارے —— خدا کی —— قدرت
ہے —— خدا کی قدرت ہے (چونک کر) خدا کی
قدرت، خدا کی قدرت۔ یعنی اس کا آنا بالکل اچانک تھا۔ شاعر کو اس
کی آمد کا یقین نہیں تھا۔ بھئی ہوگا مگر ہمیں تو پورا پورا یقین ہے کیوں؟

منطقی وجود: —— اگر —— اگر ——

منظور (شاید میں اس خیال کو —— ہاں —— نہیں کیا سوچ
رہا تھا۔ سوچ کیا رہا تھا)
سوچنے کی بات ہی کیا ہے؟ وہ ضرور آئے گی۔ چند منٹوں کی بات ہے۔

منطقی وجود: —— ایک گھنٹے میں ساٹھ منٹ ہوتے ہیں —— ساٹھ

منتظر: ستائیس منٹ اور رہ گئے ہیں ——— صرف ستائیس ———
(کھڑکی کی ٹک ٹک بند ہو کر پھر اصلی حالت پر آجاتی ہے) ہر چیز قرینے
سے رکھی ہوئی ہے۔ پھول دان بھی سج گیا سگریٹ سلگا
لیتا ہوں۔ ایک سگریٹ سے کم از کم دس منٹ جلتا رہے گا۔

منطقی وجود: ساڑھے سات منٹ

منتظر: تو کیا ہوا ——— سگریٹ سلگانا ہے

منطقی وجود: کش زور سے کیوں لے رہے ہو۔

منتظر: ساتھ ساتھ ٹہلتا بھی رہوں تو ٹھیک رہے گا ٹہلنا ہے، ہاں تو یہ
بات ہے۔

منطقی وجود: کیا بات ہے۔ تم کھوئے کھوئے سے کیوں ہو؟

منتظر: کوئی بات نہیں، بات کیا ہوگی۔ ایک صرف اتنا ڈر ہے کہ

منطقی وجود: موسم خراب ہے۔

(کھٹک سی بلند ہوتی ہے)

منتظر (گھبرا کر) یہ بجلی کی کڑک تو نہیں ہے۔

منطقی وجود: سگرٹوں کا ڈبہ جو آپ نے ابھی کھولا تھا۔ اس کا ڈھکنا آپ
کے پیر کے نیچے آگیا ہے۔

منتظر: (ہنستا ہے) آواز بالکل بجلی کی سی پیدا ہوئی۔
کیا ڈھکنا ہی تھا ——— (کھڑکی کھولتا ہے) موسم زیادہ خراب تو نہیں
ہے۔ بادل؟ ——— وہ اب تو گھر سے چل پڑی ہوگی ——— یہ

سگریٹ ختم ہونے ہی میں نہیں آتا۔ انگلیوں ہی میں مسلا گیا۔

منطقی وجود:۔ دوسرا سلگا لوں۔ یوں تھوڑا سا وقت بھی صرف ہو جائے گا۔

منتظر:۔ نہیں زیادہ سگریٹ پیوں گا۔ منہ سے بو آئے گی، بہت ممکن ہے اسے ناگوار معلوم ہو، اس نے ایک بار کہا بھی تو تھا ــــــ "

وہ یعنی جس کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ اس کی آواز آتی ہے "تمہیں میری ہی جان کی قسم جواب سے سگریٹ پیو ــــ "

منتظر:۔ مجھے حکم عدولی نہیں کرنی چاہئے ــــــ (دفعۃً) ــــــــــــ

منطقی وجود:۔ سگریٹ بجھا دیا۔ اب یہ وقت کیسے کٹے گا۔

منتظر:۔ یہ گراموفون باجا ریکارڈ نکال کر رکھ دوں۔ بہت ممکن ہے وہ بجانا چاہے

منطقی وجود:۔ ایک ریکارڈ پورے تین منٹ تک بجتا رہے گا

منتظر: تین منٹ ــــــــــ (ریکارڈ لگاتا ہے)

تین منٹ تک بجتا رہے گا۔ کیا برا ہے۔ موسیقی مجھے پسند ہے۔

(ریکارڈ بجاتا ہے)

(رات کٹی گن گن تارے)

(ریکارڈ پر سے ایک دم سوئی ہٹا لیتا ہے)

منتظر:۔ کیا واہیات ریکارڈ ہے۔ رات کٹی گن گن تارے۔

منطقی وجود:۔ ابھی تو رات ٹھ بج کر کچھ منٹ ہوئے ہیں ــــــــ ساری رات پڑی ہے

منظر:۔ ابھی آٹھ بجکر کچھ منٹ ہی ہوئے ہیں تو اس کا مطلب ہے ریں۔
میں اتنا بے تاب کیوں ہو رہا ہوں ——— آجائے گی ———
ایسی باتوں ہی سے تو ان لوگوں کا دماغ ساتویں آسمان پہ پہنچ جاتا ہے۔
میں اس کا انتظار بالکل نہیں کروں گا ——— کرسی پہ بیٹھ جاتا ہوں
میز پر یہ سفید کاغذ رکھا ہی ہے۔ اس پہ اس مہینے کا حساب لکھنا شروع
کر دیتا ہوں ——— ہاں ——— سگریٹ
پانچ روپے ——— سگریٹ پانچ روپے ——— یہ آواز فیڈ
ہوتی جاتی ہے۔ اور جس کا انتظار کیا جا رہا ہے ——— اس کی آواز ابھرتی
آتی ہے۔

وہ:۔ تمہیں پھر وہی قسم جواب کے سگریٹ پیو ——— دیکھو تو
کتنے کمزور ہو رہے ہو ——— بادام کھایا کرو ———

منظر:۔ اسے میرا کتنا خیال ہے ——— اب بھی آجائے
مگر ———"

منطقی وجود:۔ ساڑھے آٹھ بجنے میں ابھی کافی دیر ہے۔
منظر:۔ میں سمجھتا ہوں یہ گھڑی فاسٹ ہے کیا پتہ ہے کہ
منطقی وجود: گھڑی نہ ہو۔
منظر:۔ ابھی نہیں۔ اس گھڑی کا وقت بالکل صحیح ہے۔ ابھی پرسوں ہی ٹھیک کرائی
ہے ——— (وقفہ)۔ کہیں اس کی گھڑی میں فرق نہ ہو۔
منطقی وجود۔ ایسا ہو سکتا ہے۔

منتظر: تو یہ کوئی بڑی بات نہیں ——— پانچ نہیں دس منٹ کا فرق ہوگا۔
منطقی وجود۔ اس وقت سے سے کر اب تک دس منٹ مشکل سے گذرے ہیں۔
ابھی دس منٹ نہیں گذرے
منتظر: گھڑی میں ضرور خرابی ہے۔ کھول کر نہ دیکھ لوں
منطقی وجود: کھول کر آپ کو کیا نظر آئے گا۔
منتظر: کچھ نہیں، میں نے تو یہ کہا تھا کہ چلو یوں تھوڑا سا وقت گذر جائے گا۔
منطقی وجود: تو چلیے پرزے کھول کر بیٹھ جائیے۔ مگر یاد رہے اس دن کی طرح جڑیں گے نہیں۔
منتظر: ہنستا ہے، کیسے کیسے عجب خیال آتے ہیں
ہنستا ہے پھر گنگناتا ہے۔ کیسے کیسے عجب خیال آتے ہیں۔ نہیں وزن ٹھیک نہیں ہے۔
منطقی وجود۔ یہ آپ کو شاعری کیا سوجھی؟
منتظر: خوب ہنستا ہے۔ یہ شاعری بھی اچھی رہی ——— اب بھی آجائیے ——— وقت کیا ہوا ہے ——— ساڑھے ———
منطقی: ابھی ساڑھے کہاں ——— سوا کہیے۔ سوا۔
منتظر: مجھے کوئی کام بھی نہیں ہے آج،
منطقی: اس مہینے کا حساب لکھنا تھا۔
منتظر: اجی لعنت بھیجو حساب کتاب پر، یہ بھی کوئی وقت ہے حساب کتاب کا، لیکن ایسے وقت میں کرنا کیا چاہیئے ———

منطقی :۔ اس کو ایک خط لکھنا شروع کردو،

منتظر :۔ بالکل ٹھیک ہے ——— (وقفہ) ——— اس پیڈ کا کاغذ اچھا رہے گا۔

منطقی :۔ ہاں خوشبو دار ہے۔

منتظر : کیا لکھوں ——— (وقفہ) ——— مضمون سمجھ میں نہیں آتا۔

منطقی : لکھو ہیں تمہارا بہت انتظار کرتا رہا

منتظر : اور جب وہ آئے تو یہ خط اس کو دے دوں ——— خیال اچھا ہے ——— تو لکھتا ہوں ——— وقفہ ——— میرا خیال ہے کہ اب وہ گھر سے چل پڑی ہو گی ——— یہ خط اس کے آنے تک ختم نہ ہو گا۔

منطقی : تم خط لکھنا شروع کرو۔

منتظر : میری پیاری ——— تم نے آج وعدہ کیا تھا ——— کہ ساڑھے آٹھ بجے آؤں گی۔ میں تمہارا شدت کے ساتھ انتظار کرتا رہا۔

منطقی : کتنی پھس پھسی عبارت ہے

منتظر پھس پھسی ——— نہیں تو ——— (وقفہ) ——— واقعی پھس پھسی ہے۔ اب تو وہ آتی ہی ہو گی (کاغذ پھاڑ دیتا ہے) خط کی کوئی ضرورت نہیں میں اس کو زبانی بتا دوں گا

منطقی :۔ بشرطیکہ وہ آجائے

منتظر: یہ کیسی شرط ——— وہ ضرور آئے گی۔

منطقی: اگر ——— اگر ———

منتظر: نہیں ——— نہیں

منطقی: ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے۔

منتظر: کیسے بیہودہ خیال ہیں

منطقی: اگر وہ نہ آئی تو

منتظر: ضرور آئے گی

منطقی: دیکھ لیں گے۔

(دستک کی آواز)

منتظر: (خوش ہو کر) ——— لو وہ آگئی۔ (گھبرا کر) سب چیزیں ٹھیک ہیں نا؟ ——— سگریٹوں کا ڈبہ ——— اسے کہاں رکھوں؟ کون ہے؟ ——— اس کا ڈھکنا ہے کہاں؟ ——— لعنت؟ ——— خالی ہی کہیں چھپا دیتا ہوں ——— ادھر ——— ادھر یہ آیا ——— بس اب ٹھیک ٹھاک ہے۔

منطقی: اپنا دم تو درست کر لو۔ ہانپ رہے ہو۔

منتظر: دم دم سب ٹھیک ہے ——— میرا خیال ہے اس کو دہانا چاہیئے (دروازہ کھولتا ہے اور پھر ایک دم ڈرنے کی خاطر ہمپ کرتا ہے)

اخبار والا (ڈرتے ہوئے انداز میں) اجی صاحب آپ نے تو مجھے ڈرا ہی

دیا۔ آگ۔"

منتظر: تم ——— ت ——— د ——— تم ———

تم کون ہو ——— تم اخبار والے کیوں ہو؟

بھاگ جاؤ یہاں سے۔

اخبار والا۔ حضور، یہ پوچھنے آیا تھا کہ دونوں اخبار اسٹیٹسمین اور ہندوستان ٹائمز لایا کروں یا اکیلا اسٹیٹسمین ——— جیسا آپ حکم دیں

منتظر: جتنے بھی ہوں سے آیا کرو۔

اخبار والا۔ بہت اچھا سرکار!

(اخبار والا چلا جاتا ہے۔ دروازہ بند کر دیا جاتا ہے)

منتظر: اس اخبار والے کو بھی اسی وقت آنا تھا۔ کم بخت ڈر گیا تھا۔

(ہنستا ہے)

(ہنستے ہوئے دستک دینے کی آواز)

منتظر: (ہنسی روک) آگئی ——— آگئی ———

دروازہ کھولتا ہے اور پھر ایک دم "ہپ" کرتا ہے

اخبار والا۔ (ڈرتے ہوئے انداز میں) صاحب ——— یہ ——— یہ آپ بار بار مجھے کیوں ڈراتے ہیں۔

منتظر: اوہ ——— تم کیا چاہتے ہو۔ اب پھر کیوں آئے ہو؟
خدا کے لئے جاؤ

اخبار والا۔ صاحب، یہ پوچھنے آیا تھا کہ اردو کے اخبار بھی لے آیا کروں

منتظر۔ فارسی عربی۔ گجراتی۔ مرہٹی اور پنجابی سب زبانوں کو بے آیا کرو۔ مگر خدا کے لئے اس وقت جاؤ۔

(دروازہ بند کر دیتا ہے۔)

منتظر: حد ہو گئی ہے۔

منطقی وجود۔ بڑے شرم کی بات ہے۔ وہ دل میں کیا کہتا ہو گا۔

منتظر: اجی ہٹاؤ ——— لیکن میں کہتا ہوں کہ وہ ابھی تک کیوں نہیں آئی۔ کہیں ایسا تو نہیں ہو گیا ———۔

منطقی: کہ وہ بھول گئی ہو۔

منتظر: ایسا بھلا ہو سکتا ہے۔ بس اب وہ آتی ہی ہو گی۔ یہاں سے اس کا گھر بھی تو کافی دور ہے۔ اور بہت ممکن ہے کہ وہ پیدل آئے

منطقی: تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ بہت دیر سے آئے گی۔

منتظر: میرا مطلب یہ تو نہیں تھا۔ وہ گھر سے تو بہت پہلے چل پڑی ہو گی۔ گھڑی ——— گھڑی ——— یہ گھڑی ضرور خراب ہو گئی ہے۔ دیکھو نا اس کی سوئی کتنی ہولے ہولے چلتی ہے

منطقی: سامنے کلاک موجود ہے۔

منتظر: دونوں کا وقت مجھے صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ خیر کل پتہ لگ جائے گا۔ ابھی دس منٹ باقی ہیں ——— گذر گئے کتنے چکے ہیں

منطقی: سترہ ——— تیرہ ابھی باقی ہیں

منظر: میں دیوانہ ہو جاؤں گا

منطقی: کیا کہا۔

منظر: کچھ بھی نہیں ——— تو ناول پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔

(لکڑی کے ساتھ کوئی چیز ٹکراتی ہے)

منظر: (اچھل کر) وہ آگئی ——— آیا ———۔

منطقی: آپ کا پیر کرسی کے نچلے ڈنڈے کے ساتھ ٹکرایا ہے ——— دستک نہیں ہوئی۔!

منظر: پھر ٹکرائے گا ——— اٹھ کھڑا ہوتا ہوں ——— ٹہلتا ہوں گا اور پڑھتا رہوں گا۔

(بے قراری کے ساتھ ٹہلتا ہے ——— گھڑی کی ٹک ٹک کی رفتار مدھم ہو جاتی ہے۔ مگر آواز بند ہوتی جاتی ہے۔)

منظر: کچھ سمجھ میں نہیں آتا عجب اوٹ پٹانگ عبارت ہے (کتاب بند کرنے اور میز پر رکھنے کی آواز)۔

پھر پڑھوں گا۔

منطقی: دل میں بیٹھا کیوں جا رہا ہے

منظر: کیا معلوم ——— پانی پیتا ہوں (پانی پیتا ہوں) ——— تھی ——— کس قدر تلخی ہے حلق میں ——— میرا خیال ہے کہ ٹھیک وقت پر آئے گی پورے ساڑھے آٹھ بجے (چونک کر) ابھی ساڑھے آٹھ نہیں بجے ——— میں ——— میں بیٹھ جاتا ہوں گھڑی پڑے

بڑے وقفوں کے بعد ٹک ٹک کرتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیکنڈ لمبے ہو گئے ہیں۔ مجھے کچھ ہو گیا ہے۔

منطقی: پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا (میز پر انگلیوں سے ڈھول بجاتا ہے۔ یہ میں کیا کر رہا ہوں (گھڑی کی بھیانک آواز)

(اٹھ کر اضطراب کے ساتھ ٹہلنا شروع کر دیتا ہے)

منطقی: پیر لڑکھڑا رہے ہیں۔

منتظر: تو اچھا بھلا بیٹھا تو تھا ——— اٹھ کر چلنے کیوں لگا۔ حلق سوکھ رہا ہے۔ لیکن اب تو اس کے آنے میں دیر نہیں چند منٹوں کی ———

منطقی: چند منٹوں کی جن میں ——— (گھڑی لمبے لمبے سانس لیتی ہے۔

(کاغذ کھڑکھڑاتا ہے)

منتظر: آج ہوا کتنی تیز ہے۔ کیلنڈر کا کاغذ کھڑکھڑا رہا ہے)

(برتن گرنے کی آواز)

منتظر: (اس میری ہمسائی کے گھر میں ہر وقت برتن ہی گرتے رہتے ہیں)

منطقی: آج تمہارے کان بڑے تیز ہیں ــــ

آرزو کی سہل انگاری نہیں جاتی
ہم اپنے دل کی دھڑکن تیری آوازِ پا سمجھے

منتظر: ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تیری آوازِ پا سمجھے
آوازِ پا ——— دل کی دھڑکن ——— گھڑی: زیادہ

لمبے لمبے سانس لیتی ہے) ——— یہ میرے دل کو کچھ ہوگیا ہے۔ یا
کلاک خراب ہوگیا ہے۔ میرا حلق بھی سوکھ رہا ہے ——— ابھی
وقت نہیں ہوا (اضطراب سے کے ساتھ ٹہلتا ہے)

(دروازے پر دستک ہوئی)

منتظر: (کمزور آوازمیں ——— آگئی ——— آگئی ———
خوشی سے میری آواز نہیں نکلتی ———"

دروازہ ——— دروازہ ———"

منطقی: دروازہ آپ کے سامنے ہے۔

منتظر: ارے ہاں ——— آیا ——— آیا۔

(دروازہ کھولنے کی آواز)

دوست: السلام علیکم

منتظر (ہکلا کر) دو، دو ——— وعلیکم السلام۔ ک۔ک۔ک کیسے
تشریف لائے

دوست: میں تم کو اس گھوڑی کی بابت کچھ بتانے آیا تھا۔

منتظر۔ گھو۔ گھو۔ گھوڑی

دوست: اماں۔ وہی جس کی بابت کالے خاں کہتا تھا کہ بڑی دولتیاں جھاڑتی
ہے، بھئی تھی بڑی منہ زور ——— پڑی نہیں جمنے دیتی
تھی۔ بگدھڑیاں کرتی تھی بگدھڑیاں

منتظر: بگ ——— دھڑیاں ——— جی۔

دوست :۔ منہ کی بہت کڑی تھی "الف ہو جاتی تھی الف"۔

منتظر :۔ جی کسی سلوتری کے حوالے کر دی ہوتی۔

دوست۔ تم تو گھاس کھا گئے ہو ——— کہاں کا سوار اور کہاں کا سلوتری

قدم رکاب میں گیا اور بگٹٹ ہو گئی ——— "مادہ مجھے تو پٹھے پہ

ہاتھ نہیں دھرنے دیتی تھی - ایسی چمکتی تھی جیسے بجلی ———"

منتظر :۔ میں ——— ہیں

دوست : یہ میں ہیں کیا کہہ رہے ہو۔

منتظر : میں بیمار ہوں ——— سخت بیمار

آپ ——— آپ ——— اوہ ——— ساڑھے آٹھ بجنے

والے ہیں۔

دوست :۔ فکر مند لہجے میں "تم بیمار ہو ——— لیکن بھئی عجیب بیوقوف

ہو۔ مجھ سے پہلے تم نے کیوں نہ کہا ——— اب اطمینان سے سارا

حال سناؤ - مجھے کوئی خدمت بتاؤ، بھئی واللہ کمال کر دیا ——— ادھر

ہاں یہ ساڑھے آٹھ بجے تم نے کیا کہا تھا۔

منتظر :۔ مردہ آواز میں "ساڑھے آٹھ بجے ——— ساڑھے آٹھ بجے

مجھے دوا پینی ہے"

دوست :۔ دوست لاؤ میں پلا دیتا ہوں ——— کہاں ہے دوا،

——— ساڑھے آٹھ بجنے میں اب کونسی دیر ہے ——— دوا

کہاں ہے۔

منتظر:۔ نہیں، نہیں، میں خود پی لوں گا ——— آپ تکلیف نہ کریں۔
———۔آپ ——— آپ ——— آپ جائیے۔

دوست:۔ میں تمہیں یہاں بیمار چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں۔

منتظر: میں ——— میں ——— میں بیمار نہیں ہوں۔
میں ابھی ٹھیک ہو جاؤں گا۔ آپ جائیے ——— اوہ خدا کے لئے آپ
جائیے سب مجھے دل کا دورہ پڑ جائے گا۔

دوست: دل کا دورہ ——— بھئی اب میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔
بتاؤ دوا کہاں ہے۔؟

منتظر: دوا میرے پاس نہیں ہے۔ آپ جائیے۔ خدا کے لئے جائیے۔

دوست:۔ تمہیں اس حالت میں چھوڑ کر میں ڈاکٹر کے پاس بھی نہیں جا سکتا۔

منتظر:۔ کیا کہا ——— (اضطراب بڑھتا جاتا ہے۔ گھڑی کی آواز زیادہ
لمبے لمبے سانس لیتی ہے) کیا کہا ——— آپ ڈاکٹر کے پاس
بھی نہیں جائیں گے ——— میں ——— میں مر جاؤں گا۔
خدا کے لئے ڈاکٹر کے پاس دوڑ یئے جائیے ——— میری حالت بہت
خراب ہے ——— میری ——— حالت ——— بہت ——— نازک ہے
جائیے (آواز کمزور ہو جاتی ہے)

دوست: غش طاری ہو گیا ——— کیا ہوا ——— ڈاکٹر ——— کہاں
ملے گا ——— (ڈاکٹر گھبراہٹ کے عالم میں دوڑتا جاتا ہے۔ اب کوئی ڈاکٹر
مل جائے، اس وقت) چلا جاتا ہے (گھڑی اصلی حالت میں ٹک ٹک

کرتی ہے، یہ آواز ڈیڑھ سیکنڈ تک جاری رہتی ہے۔ آخر میں کلاک میں خرخراہٹ پیدا ہوتی ہے اور ایک ٹن کی آواز آتی ہے۔ اسی ٹن کی گونج تھوری دیر قائم رہتی ہے۔ پھر گھڑی کی ٹک ٹک بالکل بند ہو جاتی ہے۔ اور ایک سیکنڈ تک مکمل خاموشی طاری رہتی ہے ——————— اس خاموشی کے بعد دروازہ کھلتا ہے۔ اور جس کا انتظار کیا جا رہا ہے وہ آتی ہے۔

وہ۔ دیکھو تو، کس مزے سے جناب سو رہے ہیں۔ گویا ان کو معلوم نہیں کہ میں آ رہی ہوں۔ کافی گہری نیند سو رہے ہیں ——————— خدا جانے کہاں سے گھومتے گھامتے تھک کر آئے ہوں گے ——— خفگی کے ساتھ، تو مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ یہاں بن بلائے مہمان کی طرح کھڑی رہوں (دروازہ بند کر کے چلی جاتی ہے)

———————

پھولوں کی سازش

باغ میں جتنے پھول تھے سب کے سب باغی ہو گئے۔ گلاب کے سینے میں بغاوت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ اُس کی ایک ایک رگ آتشیں جذبہ کے تحت بھڑک رہی تھی۔ ایک روز اُس نے اپنی کانٹوں بھری گردن اُٹھائی اور غور و فکر کو بالائے طاق رکھ کر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔

کسی کو حق حاصل نہیں کہ ہمارے پسینے سے اپنے عیش کا سامان مہیا کرے ——— ہماری زندگی کی بہاریں ہمارے لئے اور ہم اس میں کسی کی، شرکت گوارا نہیں کر سکتے!

گلاب کا منہ غصہ سے لال ہو رہا تھا۔ اس کی پنکھڑیاں تھرتھرا رہی تھیں۔

چنبیلی کی جھاڑی میں تمام کلیاں یہ شور سنکر جاگ اٹھیں اور حیرت میں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں۔ گلاب کی مراد آواز پھر بلند ہوئی۔

ہر ذی رُوح کو اپنے حقوق کی نگرانی کا حق حاصل ہے اور ہم پھول، پھول اس سے مستثنےٰ نہیں۔ ہمارے قلوب زیادہ ———— نازک اور حساس ہیں۔ گرم ہوا کا ایک جھونکا ہماری دنیا کے رنگ و بو کو جلا کر خاکستر کر سکتا ہے۔ اور شبنم کا ایک بے مقدار قطرہ ہماری پیاس بجھا سکتا ہے۔ کیا ہم اس کانے مالی کے کھردرے ہاتھوں کو برداشت کر سکتے ہیں جس پر موسموں کے تغیر و تبدل کا کچھ اثر ہی نہیں ہوتا۔؟"

دنیا کے پھول چلائے ہرگز نہیں۔ لالہ کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور کہنے لگا۔ اس کے ظلم سے میرا سینہ داغ دار ہو رہا ہے۔ میں پہلا پھول ہوں گا۔ جو اس جلاد کے خلاف بغاوت کا سرخ جھنڈا بلند کرے گا۔

یہ کہہ کر وہ غصہ سے تھر تھر کانپنے لگا۔

چنبیلی کی کلیاں متحیر تھیں کہ شور کیوں بلند ہو رہا ہے۔ ایک کلی ناز کے ساتھ گلاب کے پودے کی طرف جھکی اور کہنے لگی۔ تم نے میری نیند خراب کر دی ہے۔ آخر گلاب چلا چلا کر کیوں کیوں چلا رہے ہو۔؟

گلنجر وجود در کھڑا گلاب کی قائدانہ تقریر پر غور کر رہا تھا۔ بولا۔" قطرہ قطرہ مل کر دریا بنتا ہے۔ اگر ہم سب مل جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنی جان کے دشمن کو پیس کر نہ رکھ دیں۔ ہماری پتیاں، اگر خوش بُو کو پیدا کرتی ہیں تو زہریلی گیس بھی تیار کر سکتی ہیں۔

بھائیو! گلاب کا ساتھ دو اور اپنی فتح سمجھو!"

یہ کہہ کر اس نے اخوت کے جذبے کے ساتھ ہر پھول کی طرف دیکھا۔

گلاب کچھ کہنے ہی والا تھا کہ چنبیلی کی کلی نے اپنے مرمریں جسم پر ایک تھرتھری پیدا کرتے ہوئے کہا:"یہ سب بے کار باتیں ہیں ——— آؤ تم شعر سناؤ، میں آج تمہاری گود میں سونا چاہتی ہوں ——— تم شاعر ہو۔ میرے پیارے آؤ ہم بہار کے ان خوشگوار دنوں کو ایسی فضول باتوں میں ضائع نہ کریں اور اس دنیا میں چلیں جہاں نیند ہی نیند ہے ——— میٹھی اور راحت بخش نیند!"

گلاب کے سینے میں ایک ہیجان برپا ہو گیا۔ اس کی نبض کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ کسی اتھاہ گہرائی میں اتر رہا ہے۔

اس نے کلی کی گفت گو کے اثر کو دور کرنے کی سعی کرتے ہوئے کہا:"نہیں میں میدانِ جنگ میں اترنے کی قسم کھا چکا ہوں۔ اب یہ تمام رومان میرے لئے نہیں ہیں۔"

کلی نے اپنے لچکیلے جسم کو بل دے کر خوب گول لہجہ میں کہا:"آہ میرے، پیارے گلاب ایسی باتیں نہ کرو، مجھے وحشت ہوتی ہے ——— چاندنی راتوں کا خیال کرو ——— جب میں اپنا لباس اتار کر اس نورانی فوارے کے نیچے نہاؤں گی تو تمہارے گالوں پر سرخی کا اتار چڑھاؤ مجھے کتنا پیارا معلوم ہوگا۔ اور تم میرے سیمیں لب کس طرح دیوانہ وار چومو گے ——— چھوڑو ان فضول باتوں کو، میں تمہارے کاندھے پر سر رکھ کر سونا چاہتی ہوں۔

اور چنبیلی کی نازک ادا کلی گلاب کے تھرائے ہوئے گال کے ساتھ لگ کر سو گئی ——— گلاب مدہوش ہو گیا۔ چاروں طرف سے ایک عرصہ

تک دوسرے پھولوں کی صدائیں بلند ہوتی رہیں۔ مگر گلاب نہ جاگا وہ ساری رات مخمور رہا۔

صبح کا مالی آیا۔ اُس نے گلاب کے پھول کی ٹہنی کے ساتھ چنبیلی کی کلی چمٹی ہوئی پائی۔ اس نے اپنا کھردرا ہاتھ بڑھایا اور دونوں کو توڑ لیا۔"

گرم سوٹ

گنڈا سنگھ نے ایک زمانے سے اپنے کپڑے نہیں تبدیل کیے تھے اس لیے پسینے کے باعث اُن میں ایک عجیب قسم کی بُو پیدا ہو گئی تھی۔ جو زیادہ شدّت اختیار کرنے پر اب گنڈا سنگھ کو کبھی کبھی اداس کر دیتی تھی۔ اس کو بدبُو نے کبھی اتنا تنگ نہیں کیا تھا۔ جتنا کہ اب اس گرم سوٹ نے اسے تنگ کر رکھا تھا۔

اپنے کسی دوست کے کہنے پر وہ امرتسر چھوڑ کر دہلی چلا آیا تھا۔ جب اُس نے امرتسر کو خیرباد کہا تو گرمیوں کا آغاز تھا۔ لیکن اب کے گرمی اپنے پورے جوبن پر تھی۔ گنڈا سنگھ کو یہ گرم سوٹ بہت ستا رہا تھا۔

اس کے پاس صرف یہ کپڑے تھے۔ گرم پتلون گرم کوٹ گرم واسکٹ اور ایک سوتی قمیض یہ گرم سوٹ اسے اس لیے دہلی کی شدید گرمیوں میں پہننا پڑتا تھا کہ اس کے پاس اور کوئی کپڑا ہی نہیں تھا اور سوٹ کے ساتھ واسکٹ اسے اس لیے پہننا پڑتی تھی کہ اس کے پاس کوئی ایسی جگہ نہیں تھی؛

جہاں اُسے احتیاط یا بد احتیاطی سے رکھ سکتا۔ یوں تو وہ اس واسکٹ کو یا کوٹ کو ہی دریبہ کلاں میں اپنے دوست کی دُکان پر رکھ دیتا۔ مگر وہاں اُس نے، پہلے روز ہی کئی چوہے دیکھے تھے۔ دہلی آنے کے دوسرے روز چاندنی چوک میں اس نے رس گلے کھائے تھے۔ ان کا شیرہ جا بجا کوٹ اور واسکٹ پر گر پڑا تھا۔ اور اگر وہ یہ دونوں چیزیں اُس دکان میں رکھ دیتا تو ظاہر ہے کہ جہاں جہاں شیرہ گرا تھا چوہے کپڑا کتر جاتے۔ اور گنڈا سنگھ نہیں چاہتا تھا کہ یہ سُوٹ جو اُسے ستمبر ۱۹۳۹ء یعنی اس جنگ کے ابتدائی روز سلا تھا یوں بیکار چوہوں کی نذر ہو جائے۔ اس سُوٹ کے ساتھ اتفاقیہ طور پر ایک ایسا دن منسوب ہو گیا تھا جو تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

گنڈا سنگھ کو چنانچہ اس لئے بھی اپنا سوٹ عزیز تھا۔ امرتسر میں جب اُس نے اپنا یہ تاریخی سُوٹ پہنا تھا تو دربار صاحب کے آس پاس اس کے جتنے ہاتھی دانت کا کام کرنے والے دوست رہتے تھے۔ متحیر ہو گئے تھے۔ بلبیر نے اُسے جب بازار میں دیکھا تو متحرک خراد کو روک کر زور سے آواز دی: "گنڈا سیاں، گنڈا سیاں ذرا ادھر تو آ یہ آج تجھے کیا ہو گیا ہے"

گنڈا سنگھ لباس کے معاملے میں از حد بے پرواہ تھا۔ بلکہ یوں کہئے کہ اپنے لباس کی طرف اس نے کبھی توجہ ہی نہ دی تھی۔ وہ پتلون اسی طرح پہنا کرتا تھا جس طرح کچھ پہنی جاتی ہے۔ یعنی کسی تکلف کے بغیر اس کے متعلق اس کے دوستوں میں یہ عام مشہور بھی تھی کہ اگر تن ڈھکنا ضروری نہ

ہوتا تو گنڈا سنگھ بالکل ننگا رہتا۔

چھ چھ مہینے تک وہ نہاتا نہیں تھا۔ بعض اوقات اس کے پیروں پر اس قدر میل جم جاتا تھا کہ اور میل جمنے کی گنجائش ہی نہیں رہتی تھی۔ دُور سے اگر آپ اُس کے پیروں کو دیکھتے تو یہی معلوم ہوتا کہ گنڈا سنگھ نے موزے پہن رکھے ہیں۔

گنڈا سنگھ کی غلاظت پسندی کی انتہا یہ تھی کہ وہ صبح کا ناشتہ منہ ہاتھ دھوئے بغیر کرتا تھا۔ اور سردیوں میں ایک ایسا لحاف اوڑھ کر سوتا تھا کہ اگر کوئی اُسے کوڑے پر پھینک دے تو صبح جب بھنگی کوڑا کرکٹ اٹھانے آتا تو یہ لحاف دیکھ کر اس کو بھی گھن آجاتی۔ پر لطف یہ ہے کہ اس کی تمام غلاظتوں کے باوجود لوگ اُس سے محبت کرتے تھے۔ اور امرتسر میں تو آپ کو ایسے کئی آدمی مل جائیں گے جو اس کی محبت خنک پسند کرتے ہیں۔

گنڈا سنگھ کی عمر زیادہ سے زیادہ پچیس برس ہے۔ ڈاڑھی اور مونچھوں کے بھوسلے بال اُس کے چہرے کے دو تہائی حصہ پر موبل آئل میں بھیگے ہوئے چیتھڑے کی طرح پھیلے رہتے ہیں، پگڑی کے نیچے اس کے گیسوؤں کی بھی یہی حالت رہتی ہے۔ کبھی کبھی جب اس کی پنڈلیاں کپڑا اٹھ جانے کے باعث ننگی ہو جاتی ہیں تو اُن پر میل کھرنڈوں کی شکل میں جا بجا نظر آتا ہے۔ مگر لوگ اُن تمام میلی اور گندی حقیقتوں سے باخبر ہونے پر بھی گنڈا سنگھ کو اپنے پاس بٹھاتے ہیں، اور اس سے کئی کئی گھنٹے باتیں کرتے ہیں۔

امرتسر چھوڑ کر جب گنڈا سنگھ اپنے گرم سوٹ سمیت دہلی آیا، تو

اُسے بغیر شعوری طور پر معلوم تھا کہ یہاں بھی خود بخود اس کے دوست پیدا ہو جائیں گے اور اگر اس کو اپنی غلاظت پسندیوں کا احساس ہوتا تو بہت ممکن ہے یہ احساس رکاوٹ بن جاتا اور دہلی میں اس کا کوئی دوست نہ بنتا۔

چند ہی دنوں میں بظاہر کسی وجہ کے بغیر آٹھ دس آدمی گنڈا سنگھ کے دوست بن گئے۔ اور گنڈا سنگھ کو اس بات کا مطلق احساس نہ ہوا کہ اگر یہ آٹھ دس آدمی اس کے دوست نہ بنتے تو شہر دہلی میں وہ بھوکوں مرتا۔

روٹی کے مسئلہ پر دراصل گنڈا سنگھ نے کبھی غور نہیں کیا تھا۔ اور نہ اس نے کبھی یہ جاننے کی تکلیف کی تھی۔ کہ دوسرے اس کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں، کھانا پینا، سونا، یہ تین چیزیں ایسی تھیں جو گنڈا سنگھ کو چلتے پھرتے کہیں نہ کہیں ضرور مل جاتی تھیں، اور ایک زمانہ سے چونکہ اُسے بڑی باقاعدگی کے ساتھ مل رہی تھیں۔ اس لئے ان کے متعلق وہ کبھی سوچتا ہی نہیں تھا۔

چاوڑی میں ہربنس سے ملنے گیا تو وہاں کا ناشتہ بھی مل گیا، ہربنس کے یہاں سے آیا تو راستے میں احمد علی نے دوکان پر ٹھہرا لیا، اور کہا، جو گندر سنگھ بھئی تم خوب وقت پر آئے، میں نے رمضا دل سے کچھ چاٹ منگوائی ہے کھا کے جانا۔

احمد علی کی دوکان پر چاٹ کھانے کے بعد گنڈا سنگھ کے دل میں خیال آیا کہ چلو ہیم چندر سے ملیں۔ ہیم چندر بہت اچھا افسانہ نگار ہے اور گنڈا سنگھ کے دل میں اس کی بہت عزت ہے چنانچہ جب اس سے ملاقات ہوئی تو

باتوں باتوں میں دوپہر کے کھانے کا وقت آ گیا۔ دعوت دینے اور دعوت
قبول کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوا۔ دونوں نے مل کر کھانا کھایا۔ اس کے بعد جب گنڈا
سنگھ تیمار پور کی طرف روانہ ہوا تو راستے میں باغ آ گیا۔ دھوپ چونکہ بہت
کڑی تھی اس لئے گنڈا سنگھ جب کچھ دیر سستانے کے لئے نکلسن باغ کے
ایک بنچ پر لیٹا تو پانچ بجے تک وہیں سویا رہا۔ آنکھیں مل کر اٹھا اور آہستہ آہستہ
تیمار پور کا رخ کیا جہاں اس کا دوست عبدالمجید رہتا تھا۔ چھ بجے کے قریب
گنڈا سنگھ عبدالمجید کے گھر پہنچا اور دنیا بھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ چنانچہ آٹھ
بج گئے۔ عبدالمجید بہت ہوشیار تھا۔ ہندوستان کے ترقی پسند لٹریچر
کے بارے میں اس کی معلومات بڑی وسیع تھیں۔ مگر جنگ کے متعلق
اسے کچھ معلوم نہیں تھا کوشش کرنے کے باوجود چین اور جاپان، جاپان اور
روس، روس اور جرمنی، اور فرانس کے جغرافیائی رشتے نہ سمجھ سکا تھا جب کبھی
وہ دنیا کا نقشہ کھول کر اپنے سامنے رکھتا تو اس کی نگاہوں میں نقشے پر چھپے ہوئے
شہر اور ملک ایک ایسے الجھاؤ کی صورت اختیار کر لیتے جو اکثر اوقات پتنگ
اڑانے کے دوران میں اس کی ڈور میں پیدا ہو جایا کرتے تھے مگر گنڈا سنگھ
کو دنیا کے جغرافیائی صورت پر کافی عبور حاصل تھا۔ ایک اخبار پڑھ لینے کے بعد
جنگ کا صحیح نقشہ اس کے ذہن میں آ جاتا تھا۔ اور وہ بڑے سہل انداز میں
لوگوں کو سمجھا سکتا تھا۔ اگر عبدالمجید کو جنگی خبریں سننے اور ان پر تفصیلی بحث
کرنے کی عادت نہ ہوتی جو ایک بہت بڑی کمزوری کی صورت اختیار کر چکی تھی
تو وہ یقیناً اس آدمی سے کبھی ملنا پسند نہ کرتا تھا۔ جو دانا کھانے کے بعد سنالی

سے بھرے ہوئے ہاتھ اس کے کمرے میں لٹکے ہوئے پردوں سے صاف کرتا تھا۔ ایک دفعہ عبدالمجید نے پردوں کو اس کے حملوں سے محفوظ رکھنے کی خاطر اپنا تولیہ آگے بڑھا دیا اور کہا، لو گنڈا سنگھ اس سے ہاتھ صاف کر لو، کچھ دیر اگر ٹھہر سکو تو پانی اور صابن آ رہا ہے۔

گنڈا سنگھ نے اس انداز سے تولیہ عبدالمجید سے لیا جیسے اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اور ایک منٹ میں منہ ہاتھ صاف کر کے اسے ایک طرف پھینک دیا۔ پانی دانی کی ضرورت ہی نہیں ہاتھ صاف ہو گئے۔

عبدالمجید جب زہر کے گھونٹ پی کر اپنے تولئے کی طرف دیکھا تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ ہاتھ صاف کرنے کے بجائے کسی نے اس کیساتھ سائیکل کی چین صاف کی ہے۔

عبدالمجید کی بیوی کو گنڈا سنگھ کی یہ مکروہ عادات سخت ناپسند تھیں مگر وہ بھی مجبور تھی۔ اس لئے کہ جس دن گنڈا سنگھ نہیں آتا تھا عبدالمجید اسے اپنے پاس بٹھا کر جنگ کے تازہ حالات پر ایک طویل لیکچر دینا شروع کر دیتا تھا جو اس امن پسند عورت کو طوعاً و کرہاً سارے کا سارا سننا ہی پڑتا تھا۔

گنڈا سنگھ ذہین آدمی تھا۔ ادب اور سیاست کے بارے میں اس کی معلومات اوسط آدمی سے بہت زیادہ تھیں۔ امرت سر میں اس کے گرم سوٹ کا سودا بھی ان معلومات کے ذریعہ ہی سے ہوا تھا۔ محمد عمر ٹیلر ماسٹر کو جنگی خبریں سننے کا خبط تھا۔ چنانچہ گنڈا سنگھ نے جنگ کے ابتدائی حالات سنا سنا کر محمد عمر کو اس قدر مرعوب کیا کہ اس کے یہ گرم سوٹ (جو کسی گاہک نے

[illegible] میں تیار کرایا تھا اور دو برس سے اس کے پاس بیکار پڑا تھا چونکہ اس گاہک نے پھر کبھی شکل ہی نہیں دکھائی تھی۔ گنڈا سنگھ کے جنم پر فٹ کر دیا تھا۔ اور اُس کے ساتھ پانچ روپے ماہوار کی قسطیں مقرر کر لیں۔

اِن چھ قسطوں میں سے صرف تین قسطیں گنڈا سنگھ نے ادا کی تھیں۔ باقی تین قسطوں کے لئے محمد عمر کئی بار تقاضا کر چکا تھا مگر ان رسمی تقاضوں کے علاوہ محمد عمر نے گنڈا سنگھ کے اوپر کبھی دباؤ نہیں ڈالا تھا۔ اس لئے کہ جنگ کے حالات دن بدن دلچسپ ہوتے جا رہے تھے۔

گنڈا سنگھ نے امرتسر کیوں چھوڑا یہ ایک لمبی کہانی ہے دہلی میں جو اُس کے نئے دوست بنے تھے صرف اُن کو ایک پرانے دوست کے کہنے پہ یہاں چلا آیا تھا کہ ملازمت تلاش کرے۔

دہلی آکر گنڈا سنگھ ملازمت کی جستجو کرتا مگر یہ کم بخت گرم سوٹ اُسے چین نہیں لینے دیتا تھا۔ اس قدر گرمی پڑ رہی تھی کہ چیل انڈا چھوڑ دے۔ کچھ دنوں سے گرمی انتہا کی ہو گئی تھی۔ لوگ سن اسٹروک سے مر رہے تھے۔ گنڈا سنگھ کو موت کا اتنا خیال نہیں تھا جتنا کہ اُسے تکلیف کا خیال تھا جو گرمی کی شدت کے باعث اُسے اٹھانی پڑ رہی تھی۔ بازاروں میں دھوپ پگھلی ہوئی آگ کی طرح پھیلی رہتی تھی۔ لُو اس غضب کی چلتی تھی کہ منہ پر آگ کے چانٹے پڑتے تھے۔ [illegible] بھری سڑکیں توے کی مانند تپتی رہتی تھیں ان سب کے اوپر قضا کی گرم گرم اداسی تھی جو گنڈا سنگھ کو بہت پریشان کرتی تھی۔

اگر اس کے پاس یہ گرم سوٹ نہ ہوتا تو الگ بات تھی۔ شاید گرمیوں

کا یہ موسم کسی نہ کسی حیلے کٹ ہی جاتا، پر اس سُوٹ کی موجودگی میں جس کا رنگ اس کی بھوسلی ڈاڑھی سے بھی زیادہ گہرا تھا۔ اب ایک دن بھی دلی رہنا، اُسے دشوار معلوم ہوتا تھا۔ اُس سوٹ کا رنگ سردیوں میں بہت خوشگوار ہوتا تھا۔ پر اب گنڈا سنگھ کو اس سے ڈر لگتا تھا۔

سُوٹ کا کپڑا بہت کھردرا تھا۔ کوٹ کا کالر گھسنے کے باعث بالکل ریگمال کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اس سے گنڈا سنگھ کو بہت تکلیف ہوتی تھی یہ گھسا ہوا کالر ہر وقت اوپر نیچے ہو کر اس کی گردن کے بال مونڈتا رہتا تھا۔

ایک دو دفعہ جب غضب کی گرمی پڑی تو گنڈا سنگھ کے جی میں آئی کہ یہ گرم سوٹ اتار کر کسی ایسی جگہ پھینک دے کہ پھر اُسے نظر نہ آئے مگر یہ سُوٹ اگر وہ اتار دیتا تو اس کی جگہ پہنتا کیا۔ اس کے پاس تو اس سُوٹ کے سوا اور کوئی کپڑا ہی نہیں تھا۔ مجبوری گرمی کے احساس میں اور زیادہ اضافہ کر دیتی تھی اور بیچارا گنڈا سنگھ تلملا کر رہ جاتا تھا۔

دہلی میں اس کے چند دوستوں نے اس سے پُوچھا تھا بھئی گنڈا سنگھ تم یہ گرم سوٹ کیوں نہیں اتارتے۔ کیا تمہیں گرمی نہیں لگتی؟ گنڈا سنگھ چوں کہ ذہین آدمی تھا، اس لئے اُس نے یوں جواب دیا تھا۔ گرم کپڑا گرمی کی شدت کو روکتا ہے۔ اس لئے یہ گرم سوٹ پہنتا ہوں۔ سن اسٹروک اثر ہمیشہ گلے کے نچلے حصے پر پڑتا ہے۔ جہاں حرام مغز ہوتا ہے۔ اگر جسم کے اس حصے پر گرم کپڑے کی ایک موٹی سی تہ جمی رہے۔ تو سورج کے اس حملے کا خدشہ نہیں رہتا۔ افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں انگریز وغیرہ سولر ہیٹ کے پچھلے حصے کیساتھ

ایک کپڑا لٹکا دیتے ہیں۔ کہ لُو سے بچے رہیں عرب میں سر کے لئے ایک خاص پہناوا مروج ہے، ایک بڑا سا رُومال ہوتا ہے جو گردن کو ڈھانپے رہتا ہے ہندوستان کے اُن حصوں میں جہاں شدید گرمی پڑتی ہے پگڑی کا رواج استعمال اب تک چلا آرہا ہے، شملہ چھوڑنے کا اب تک دراصل مطلب یہی تھا کہ گردن لُو سے محفوظ رہے، مگر اب لوگوں نے شملہ چھوڑنا قریب ترک کر دیا ہے، اس لئے کہ اسے فضول سمجھا گیا ہے، اور بغیر شملہ چھوڑے پگڑی باندھنا جدید فیشن بن گیا ہے، میں خود اس اس فیشن کا شکار ہوں۔

یہ فاضلانہ جواب سُن کر اس کے دوست بہت مرعوب ہوئے تھے چنانچہ پھر کبھی انہوں نے گنڈا سنگھ سے اس سوٹ کے بارے میں استفسار نہ کیا تھا۔ گنڈا سنگھ جس کو اپنی معلومات کا مظاہرہ کرنے کا شوق تھا، اس وقت یہ جواب دے کر بہت مسرور ہوا تھا۔ مگر یہ مسرت فوراً ہی اس سوٹ کی تکلیف اور گرمی نے غائب کر دی۔

عبدالمجید نیا دیو یعنی شہر کے مضافات میں رہتا تھا جہاں کھلی فضا میسر آسکتی تھی، ایک رات جب تازہ جنگی حالات پر تبصرہ کرتے کرتے دیر ہوگئی۔ تو عبدالمجید نے گنڈا سنگھ کے لئے برآمدے کے باہر ایک چارپائی بچھوادی۔ کوٹ اور ویسٹ کوٹ اتار کر وہ پتلون سمیت اس چارپائی پر صبح چھ بجے تک سویا رہا۔ رات تھی گرم ہی گئی۔ کھلی فضا تھی اس لئے ساری رات خنک ہوا کے جھونکے آتے رہے گنڈا سنگھ کو یہ جگہ پسند۔ چنانچہ اس نے شام کو دیر سے آنا شروع کر دیا۔

عبدالمجید کی بیوی نے دس بارہ روز تک گنڈا سنگھ کا وہاں سونا برداشت

کیا لیکن اس کے بعد اس سے نہ رہا گیا۔ عبدالمجید سے اس نے صاف صاف کہہ دیا اصغر کے ابا۔ اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔ میں اس موٹے گنڈا سنگھ کا یہاں آنا بالکل پسند نہیں کرتی۔ یہ مکان ہے یا سرائے ہے؛

——— یعنی وہ عین کھانے کے وقت آجاتا ہے۔ ادھر اُدھر کی باتیں آپ سے کرتا ہے اور چارپائی بچھا کر سو جاتا ہے۔ میں اس کی غلاظتیں برداشت کر سکتی ہوں۔ مگر اس کا یہاں سونا برداشت نہیں کر سکتی۔ سُنا آپ نے اگر وہ کل یہاں آیا تو میں خود اس سے کہہ دوں گی کہ سردار صاحب۔ جنگ کے متعلق آپ باتیں کرنا چاہتے ہیں شوق سے کیجئے، کھانا حاضر ہے، تولیے، دالانوں کے پردے، گدیوں کے غلاف یہ تمام چیزیں ہیں، بڑے شوق سے منہ پونچھنے کے استعمال کیجئے مگر رات کو آپ یہاں ہرگز نہیں سو سکتے اصغر کے ابا میں خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں میں بہت تنگ آگئی ہوں۔

عبدالمجید کو گنڈا سنگھ کا وہاں سونا بہت برا معلوم ہوتا تھا۔ اسلئے کہ اس کی بیوی پرلی طرف آنگن میں اکیلی رہتی تھی۔ مگر وہ کیا کرتا جب کہ جنگ کی دلچسپ باتیں کرتے کرتے دیر ہو جاتی تھی اور گنڈا سنگھ بغیر کسی تکلیف کے جیسے کہ اس کا روزانہ معمول ہو، اس سے کہہ دیتا تھا۔ بھائی عبدالمجید اب تم جاؤ۔ صبح اٹھ کر تازہ اخبار دیکھیں گے تو نئے حالات کا کچھ پتہ چلے گا، یہ کہہ کر وہ برآمدے میں سے چارپائی نکالتا اور باہر بچھا کر سو جاتا۔

جب عبدالمجید کی بیوی اس پہ بہت برسی تو اس نے کہا "جان من میں خود حیران ہوں کہ اس کو کس طرح منع کروں۔ یہاں دہلی میں اس کا کوئی،

ٹھور ٹھکانہ نہیں۔ مجھے اب اس بات کا خوف لاحق ہو رہا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے میرے مکان کو اپنا اڈہ بنا لے گا۔ آدمی بیحد اچھا یعنی لائق ہے ذہین ہے پر کوئی ایسی ترکیب سوچو کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

یہ سُن کر عبدالمجید کی بیوی نے کہا "تو یہ ترکیب تم ہی سوچو میں تو صاف گو ہوں اگر مجھ سے کہو گے تو میں کھلے لفظوں میں اس سے کہہ دوں گی کہ تمہارا رہنا مجھے بہت ناگوار معلوم ہوتا ہے۔"

عبدالمجید نے اس وقت تہیہ کر لیا کہ وہ گنڈا سنگھ سے اپنی مشکلات اور مجبوریاں صاف لفظوں میں بیان کر دے گا۔ چنانچہ جب شام کو گنڈا سنگھ آیا تو جنگ کے تازہ حالات پر بحث کرنے کے بجائے عبدالمجید نے اُس سے کہا "گنڈا سنگھ میں تم سے ایک بات کہوں بُرا تو نہ مانو گے۔"

گنڈا سنگھ نے ہمہ تن گوش ہو کر جواب دیا "بُرا ماننے کی بات ہی کیا ہے آپ بتائیے۔"

اس پر عبدالمجید نے ایک مختصر سی تمہید شروع کر دی۔ پھر اُس کے آخر میں کہا ——— بات یہ ہے کہ سردیوں میں ایک سے زیادہ آدمیوں کی رہائش کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ اس میں گنجائش نکل آتی ہے، مگر ان گرمیوں میں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ مردوں کو اتنی نہیں ہوتی جتنی کہ مستورات کو ہوتی ہے۔ تم خود سمجھ سکتے ہو۔"

گنڈا سنگھ مطلب سمجھ گیا۔ چنانچہ اُس نے پہلی بار اپنی تکلیفیں بیان کرنا شروع کیں ——— بھائی عبدالمجید میں تمہاری مہربانیوں کا بہت شکر گذار ہوں

رات کاٹنے کے لئے یوں تو مجھے بہت جگہیں مل سکتی ہیں مگر مصیبت یہ ہے کہ اگر ایسی کھلی ہوا کہیں نہیں ملتی۔ سارا دن پھر اس گرم سوٹ میں گھٹتا رہتا ہوں۔ چند راتیں جو میں نے تمہارے یہاں بسر کی ہیں کبھی نہیں بھول سکتا مجھے تمہاری مجبوریوں اور تکلیفوں کا احساس اب ہوا ہے اس لئے کہ جو آرام مجھے یہاں رات کو ملتا تھا اس قدر خوشگوار تھا کہ میں نے دوسرے پہلو پر بھی غور نہ کیا ——— تم میرے دوست ہو کوئی صورت نکالو کہ مجھے اس گرم سوٹ سے نجات مل جائے۔ اس طور پر کہ یہ گرم سوٹ بھی میرے پاس رہے اور گرمیوں کا موسم بھی کٹ جائے۔ کیونکہ دو تین مہینے کے بعد پھر سردیاں آنے والی ہیں۔ اور مجھے پھر اس سوٹ کی ضرورت ہوگی ——— سچ پوچھو تو میں اب دیوانگی کی حد تک اس سوٹ کی گرمی سے بیزار ہو گیا ہوں ——— تم خود سمجھ سکتے ہو؟ ۔۔"

عبدالمجید سمجھ گیا کہ گنڈا سنگھ رخصت ہوا تو عبدالمجید نے اپنی بیوی سے بات چیت کی۔ دونوں دیر تک اس مسئلے پر گفت گو کرتے رہے آخر میں اس کی بیوی نے کہا "صرف ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے اور وہ یہ کہ گنڈا سنگھ کو کسی ایسی جگہ بھیج دیا جائے جہاں گرمی نہ ہو" ———

یہ سن کر عبدالمجید نے کہا "ٹھیک ہے پر اس کے لئے رقم کی ضرورت ہے۔ اگر میرے پاس فالتو روپے ہوتے تو میں نے اسے ٹھنڈے کپڑے نہ بنوا دیئے ہوتے"۔ اس پر عبدالمجید کی بیوی نے کہا "تم پوری بات تو سن لیا کرو۔ میں نے سوچا ہے کہ اسے شملہ بھیج دیا جائے۔ میرا بھائی نصیر کل آنے والا ہے

اس سے کہہ دیں گے کہ وہ گنڈا سنگھ کو بغیر ٹکٹ وہاں پہنچا دے گا۔ ایک دو بار وہ تمہیں بھی تو شملہ لے گیا تھا۔

عبدالمجید یہ بات سن کر اس قدر خوش ہوا کہ اس نے اپنی بیوی کا منہ چوم لیا۔ "بھئی کیا ترکیب سوچی ہے   یعنی سوٹ گنڈا سنگھ کے جسم پر ہی رہے گا اور وہ شملہ پہنچ جائے گا۔ اس سے بہتر اور کیا چیز ہو سکتی ہے"

دوسرے روز شام کو گنڈا سنگھ آیا تو عبدالمجید نے شملہ جانے کی رائے پیش کی، یہ سن کر وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے قطعاً نہ سوچا کہ شملے جا کر وہ بغیر روپے پیسے کے کس طرح گزارہ کرے گا۔ دراصل ایسی باتوں پر اس نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔

تیسرے دن نصیر نے گنڈا سنگھ کو گاڑی میں سوار کر دیا اور گارڈ سے جو کہ اس کا دوست تھا کہہ دیا کہ اسے بحفاظت تمام شملے پہنچا دے۔

میرا اہم سفر

پلیٹ فارم پر شہاب سعید اور عباس نے ایک شور مچایا تھا یہ سب دوست مجھے اسٹیشن پر چھوڑنے کے لئے آئے تھے۔ گاڑی پلیٹ فارم کو چھوڑ کر آہستہ آہستہ چل رہی تھی کہ شہاب نے بڑھ کر پائے دان پر چڑھتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"عباس کہتا ہے کہ گھر جا کر اپنی ان کی خدمت میں سلام ضرور کہنا"

"وہ تو پاگل ہے ——— اچھا خدا حافظ" میں نے ان علیگی دوستوں سے پیچھا چھڑاتے ہوئے یہ الفاظ جلدی ادا کئے اور شہاب سے ہاتھ ملا کر دروازہ بند کرنے کے بعد اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

علی گڑھ اور اس کی رنگین علمی فضا جس میں میں اب سے کچھ عرصہ پہلے سانس لے رہا تھا۔ اب مجھ سے ایک طویل عرصہ کے لئے دور ہو رہی تھی۔ میرا دل سخت مغموم تھا شہاب اگرچہ کالج میں بہت تنگ کرتا تھا مگر اس سے مجھا

ہونے کا مجھے اب احساس ہوا جب میں دفعتہً خیال کیا امرت سر میں مجھے ایسا دلچسپ دوست میسر نہ آسکیگا - اسی خیال کے غم افزا اثر کے تحت، میں نے سر کو جنبش دیتے ہوئے اور عمل سے گویا اپنے ذہن سے اس تاریکی کو جھٹکتے ہوئے جیب میں سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی اور اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر اُس کو سلگایا اور اطمینان سے نشست پر ٹھکانے سے بیٹھ کر اپنے سامان کا جائزہ لیا۔ اور پھر اپنے ساتھی کی طرف جو سیٹ کے آخری حصّے پر بیٹھا تھا پیٹھ کر کے سگریٹ سے دھوئیں کے چھلّے بنانے کی بے سود کوشش میں مصروف ہوگیا

میں بالکل خالی الذہن تھا، معلوم نہیں کیوں ؟ سگریٹ کا دھواں جس کو میں اپنے منہ سے چھلّوں کی صورت میں نکالنے کی کوشش کرتا تھا، ہوا کے تند جھونکوں کی تاب نہ لاکر کھڑکی کے راستے کسی تھرکتی ہوئی رقاصہ کی طرح تڑپ کر باہر نکل رہا تھا۔ میں بہت عرصہ تک سگریٹ کے لرزاں دھوئیں کو بڑے غور سے دیکھتا رہا، یہ رقص کی ایک تکمیل تھی

"رقص کی تکمیل" یہ الفاظ دفعتہً میرے دماغ میں پیدا ہوئے اور میں اپنے اس اچھوتے خیال پر بہت مسرور ہوا۔

کیا میں پاگل ہوں ؟

گاڑی پلیٹ فارم کو چھوڑ کر کھلے میدانوں میں دوڑ رہی تھی آہنی پٹڑیوں کا بچھا ہوا جال بہت پیچھے رہ گیا تھا پتھریلی روش کے آس پاس اُگے ہوئے درخت ایک دوسرے کا تعاقب کرتے معلوم ہوتے رہتے ہیں، رقص کی تکمیل اور ان درختوں کی بھاگ دوڑ کا مشاہدہ کر رہا تھا کہ ان حیران کن الفاظ نے مجھے

چونکا دیا غالباً میرے اس ہمسفر نے ادا کئے تھے جو سیٹ کے آخری حصے پر کونے میں بیٹھا تھا۔ اُس نے یقیناً یہ عجیب سا سوال مجھ ہی سے پوچھا تھا۔"

کیا آپ مجھ سے دریافت فرما رہے ہیں ؟"

جی ہاں کیا میں پاگل ہوں ؟ اس نے ایک بار پھر مجھ سے دریافت کیا۔

ٹرین کی روانگی پر جب میں نے آپ سے یہ کہا تھا " وہ تو پاگل ہے۔ اچھا خدا حافظ !" تو شائد اس شریف آدمی نے یہ خیال کر لیا تھا کہ میں نے اسی کو پاگل کہا ہے ــــــــ میں کھکھلا کر ہنس پڑا تھا اور نہایت مؤدبانہ لہجہ میں کہا :۔

آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ حضرت، گاڑی چلتے وقت شائد میں نے کسی دوست کو پاگل کے نام سے پکارا تھا ــــــــ وہ تو ہے ہی پاگل میں معافی چاہتا ہوں کہ آپ کو خواہ مخواہ تکلیف ہوئی۔

یہ معقول دلیل سن کر کچھ کہنے کے لئے ذرا آگے سرک رہا تھا خاموش ہو گیا یہ دیکھ کر کہ مجھے گونہ اطمینان ہوا کہ معاملہ بڑھا نہیں۔ اتفاق سے میری طبیعت کچھ اس قسم کی واقع ہوتی ہے کہ عموماً کمی سے کمتی باتوں پر طیش آ جایا کرتا ہے چونکہ اس سے قبل کئی مرتبہ دوران سفر میں میرا مسافروں سے جھگڑا ہو چکا تھا۔ اور میں اس کے تلخ نتائج سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس لئے لازمی طور پر میں اس معاملہ کو اتنی جلدی بخیر و خوبی انجام پاتے دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا چنانچہ میں نے اُس مسافر سے خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کے لئے اس سے ایسے ہی گفت گو شروع کی ــــــــ رسمی گفت گو جو

عام طور پر گاڑیوں میں مسافروں کے ساتھ کی جاتی ہے

"آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں" میں نے اس سے دریافت کیا

"میں —————— یہ کہتے ہوئے وہ کونے سے سرکتا ہوا اٹھ کر میرے مقابل والی سیٹ پر بیٹھ گیا "میں دہلی جا رہا ہوں —————— آپ کہاں اتریں گے؟"

مجھے کافی طویل سفر کرنا ہے —————— امرتسر جا رہا ہوں"

"امرتسر ——————"

"جی ہاں"

"مجھے یہ شہر دیکھنے کا کئی مرتبہ اتفاق ہوا ہے۔ اچھی بارونق جگہ ہے۔ کپڑے کی تجارت کا مرکز ہے" کیا آپ وہاں کالج میں پڑھتے ہیں؟"

"جی ہاں" میں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ کیوں اس کا سوال میرے نزدیک بہت غیر دلچسپ تھا۔ اس کے علاوہ مجھے اندیشہ تھا۔ کہ اگر میں نے اپنے ہمسفر سے یہ کہا ہوتا کہ میں علی گڑھ کی یونیورسٹی میں پڑھتا ہوں تو وہ کالج کی دلچسپیوں اس کی عمارت اور اس کے خدا معلوم کن کن حصوں میں اور شعبوں کے متعلق مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ شروع کر دیتا۔ اس سے قبل میرے ساتھ اس قسم کا واقعہ پیش آ چکا تھا۔ جب میرے ایک رفیق سفر نے سوال پوچھتے پوچھتے رات کی نیند مجھ پر حرام کر دی تھی۔

کون سے کالج میں —————— میرے خیال میں وہاں کئی کالج ہیں اس نے مجھ سے دریافت کیا۔

میں نے جھٹ سے جواب دیا: "خالصہ کالج میں"

"اچھا، وہی جو اینڈرسن نے تعمیر کردیا تھا۔"

"اینڈرسن نے مگر وہ سکھوں کا کالج ہے حضرت" میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

مجھے معلوم ہے مسٹر، یہ اینڈرسن سکھ ہوگیا تھا نا آپ نے غالباً سکھ ہسٹری کا مطالعہ نہیں کیا؟"

"شاید۔"

یہ کہہ کر میں نے گفتگو کو دلچسپ نہ پاتے ہوئے منہ موڑ لیا، اور کھڑکی کے باہر کی طرف دیکھنا شروع کردیا۔ گاڑی اب یو۔پی کے وسیع میدانوں میں دندناتی ہوئی چلی جارہی تھی۔ لوہے کے پہیوں کی وزنی جھنکار اور چوبی تختیوں کی کھٹ کھٹ فضا میں ایک عجیب یک آہنگ شور برپا کررہی تھی، اور اس شور کی سنسناتی بازگشت نے آس پاس کے دوڑتے ہوئے کھمبوں اور درختوں سے ٹکرا کر شام کی خنک ہوا میں ایک ارتعاش پیدا کردیا تھا۔ میں نے ایسے ہی کھڑکی میں سے اپنا بازو باہر نکالا۔ منہ زور گاڑی کی تیز رفتار کی وجہ سے ہوا کے زبردست دھکے میرے بازو کو ہلا دے کر پیچھے دبا دیا۔

میں نے ٹھنڈی ہوا کے اس دباؤ کو بہت پیارا محسوس کیا، چنانچہ میں کھیل میں مصروف ہوگیا، اور اپنے ہمسفر اس کی گفتگو کو بالکل بھول گیا ہوا کے دباؤ کی دل نوازی بہت مسرور کن تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد میں اپنے اس کھیل سے اکتا گیا۔ دراصل بار۔ بار

ہواکے چیرنے سے میرا بازو تھک گیا تھا۔ اب میں نے مڑ کر میدانوں کی وسعت کا نظارہ کرنا شروع کر دیا۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخی —— آتشیں و سرخ کرنیں میدان کے گڑھوں میں بارش کے جمع شدہ پانیوں پر زرنگاری کا کام کر رہی تھیں۔ ایسا معلوم کہ خاکستری زمین کے سینے پر کسی نے بڑے آئینے آویزاں کر دیئے ہیں۔ بجلی کا یہ منظر بہت سہانا تھا۔

"کیا میں پاگل ہوں"؟

ان الفاظ نے ایک بار پھر ان رنگوں کو منتشر کر دیا۔ جو میرے دل و دماغ پہ ایک نہائت ہی پیاری تصویر کھینچ رہے تھے۔ میں چونک پڑا۔ میرے اسی ہمسفر نے مجھ سے یہ سوال دریافت کیا تھا کہ میں مڑا اور مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا —— یہ خیال کرتے ہوئے کہ شائد میرے کانوں کو دھوکا ہوا ہے۔ میں نے اس سے کہا:۔

"کیا ارشاد فرمایا آپ نے"؟

وہ ایک لمحہ خاموش رہا، اور پھر اپنے سر کو جھٹکتے ہوئے کہا ——

"کچھ نہیں، شائد آپ نہ بتا سکیں گے۔"

اب میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی عمر غالباً بیس بائیس برس کے قریب ہوگی۔ داڑھی بکمال صفائی سے مونڈی ہوئی تھی۔ اس کے گال گوشت سے بھرے ہوئے تھے۔ ان کی موٹائی میں بہت سا فرق تھا۔ جو صرف مجھ جیسا باریک بیں ہی دیکھ سکتا ہے۔ بال جن میں سے کسی اچھے اور بڑھیا تیل کی خوشبو آ رہی تھی۔ پیچھے کی طرف کنگھی کئے گئے تھے۔ جس سے اس،

کی پیشانی بہت کشادہ ہو گئی تھی۔ وہ معمولی قسم کے کشمیرے کا کوٹ پہنتے ہوئے تھا۔ کلف شدہ کالر قمیض کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ مگر ٹائی موجود نہ تھی ـــــ یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے

وہ ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ پھر بولا۔

"میں آپ سے کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں"

میں اس کے روزانہ لہجے سے متحیر ہوا۔ آخر وہ مجھ سے کیا دریافت کرنا چاہتا ہے یہ خیال کرتے ہوئے میں نے جھک کر گویا اس کے سوال کا جواب دینے کے لئے تیار ہو کر کہا۔ "بصد شوق ـــــــــــ فرمائیے

"کیا میں پاگل ہوں"

میری حیرت اور بھی بڑھ گئی۔ میں سمجھ نہ سکا کہ جواب کیا دوں۔ آپ ہی فرمائیے میں اس شخص کو کیا جواب دے سکتا تھا۔ بظاہر نہایت ہی ہوشمند انسان معلوم ہوتا تھا ـــــــــــ بالکل میری اور آپ کی طرح۔

"آپ! ـــــــ آپ! ـــــــــــ میں نے تتلاتے ہوئے کہا۔"

"ہاں، ہاں میں۔ آپ فرمائیے نا!" اس نے بڑی سنجیدگی سے مجھ سے دریافت کیا ـــــ

"مگر کیوں! آپ بڑے ہوشمند انسان ہیں ـــــــــــ!

آپ اپنی رائے مرتب کرنے میں اتنی جلدی سے کام نہ لیجئے۔ پھر غور فرما کر جواب دیجئے۔ کیا میں واقعی پاگل ہوں"

اس میں غور کرنے کی بات ہی کوئی نہ تھی۔ لیکن پھر بھی میں نے اپنے ہمسفر کے چہرے کی طرف غور سے دیکھنا شروع کیا۔ دراصل میں دو چیزیں معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اولاً یہ کہ کہیں وہ مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہا۔ ثانیاً یہ کہ شاید اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ یہ ظاہر کر دے کہ وہ سچ مچ پاگل ہی ہے۔ میں نے اپنے ایک دوست سے سُنا تھا کہ عام طور پر پاگلوں کی آنکھوں میں ڈورے ابھرے ہوتے ہیں۔ مگر وہ آنکھیں جو میری طرف دیکھ رہی تھیں غیر معمولی طور پر سفید تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سفید چینی کی بنی ہوئی ہیں — میں کچھ معلوم نہ کر سکا۔"

آپ کو کسی نے غلط طور پر شک میں ڈال دیا ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے خیال کیا کہ شاید کسی ڈاکٹر نے اس کو وہم ڈالا ہے۔ کیوں کہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ آج کل کے سستے اور جاہل ڈاکٹر بغیر سوچے سمجھے نبض پر ہاتھ رکھ کر کسی کو دیوانہ، کسی کو مدقوق۔ اور کسی کو ضعفِ اعصاب کا مریض ٹھہرا دیتے ہیں۔

"میرا بھی یہی خیال ہے، مگر آپ کو قطعی طور پر یقین ہے کہ میں واقعی پاگل نہیں ہوں؟" اس نے کہا۔

"قطعی طور پر ——— جس شخص نے آپ کو اس وہم میں مبتلا کر دیا ہے میرے خیال میں وہ خود پاگل ہے"

"خیر وہ تو پاگل نہیں۔ اچھا بھلا ہے۔"

"وہ کون سا بزرگ ہیں؟"

"میرا اپنا باپ ہے۔"

"آپ کا باپ"

"جی ہاں —————— وہ کہتا ہے کہ میں پاگل ہوں، حالانکہ میں خود اس قسم کی کوئی علامت نہیں پاتا۔ آج سے ایک سال قبل اس کی نظروں میں میں پاگل نہ تھا، لیکن جونہی میری شادی ہوئی میرے باپ نے کہنا شروع کر دیا کہ موہن دیوانہ ہے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سسرال والوں نے ڈر کے مارے اپنی لڑکی کو گھر بلوا لیا۔ اب وہ اس کو میرے حوالے نہیں کرتے۔ یہ کس قدر رنج افزا بات ہے۔ مجھے اپنی بیوی کے ساتھ دس پندرہ دن بھی بسر کرنے نصیب نہیں ہوئے"

یہ کہتے ہوئے ان کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ واقعتاً وہ بہت مغموم ہے۔ میں بھی بہت متاثر ہوا۔ لیکن مجھے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کے باپ نے خواہ مخواہ اسے پاگل بنا کر اس کی زندگی کیوں تلخ کر دی ہے۔

"مگر آپ کے والد نے یہ حرکت کیا کی؟" میں نے اس کی داستان میں گہری دلچسپی لیتے ہوئے کہا

"مسٹر وہ یہودی ہے —————— پکا یہودی۔ اس کو صرف اپنے طلائی سکوں سے غرض ہے۔ اور بس میں اس کے خون کا ایک حصہ ہوں۔ مگر یہ چیز اس کے دل پر اثر نہیں کر سکتی ہے۔ اگر اس نے مجھے پاگل بنایا ہے، تو اس میں بھی کوئی بڑا راز مضمر ہے۔ وہ اس قدر نفس پرست ہے کہ مرنے کے بعد بھی وہ یہ نہیں چاہتا کہ اس کی جائداد اس کے اپنے لڑکے کے ہاتھ میں چلی

جائے۔ دیکھئے میں نے تین سال ہوئے بی۔ اے پاس کیا ہے۔ یہ بات علاوہ ہے کہ میں کوئی نوکری حاصل نہیں کر سکا ہوں۔ مگر میرے باپ کو یہ تو چاہیئے کہ وہ مجھے اچھا خرچ دے"

یقیناً۔" میں نے پر زور تائید کی۔

لیکن وہ مجھے صرف پانچ روپے ماہوار دیتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس نے، میرے شباب کی تمام رنگینیوں پر اپنی ہوس پرستیوں پر سیاہی الٹ دی ہے۔ میں آگرہ میں پڑا ہوں۔ میری بیوی دہلی میں ہے۔ میرے اس یہودی باپ نے میرے اور اس کے درمیان ایک خلیج حائل کر دی ہے۔ میں اس سے بیحد محبت کرتا ہوتا ہوں۔ وہ خوب صورت اور پڑھی لکھی ہے۔ مگر وہ مجبور ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی مجھے پاگل سمجھتی ہو۔ اب میں اس کا فیصلہ کر دینا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنی تین پتلونیں اور تین کوٹ بیچ دیئے ہیں۔ اب میں دہلی جا رہا ہوں۔ دیکھا جائے گا جو گا۔"

"آپ اپنی بیوی کے پاس جا رہے ہیں۔" میں نے اس سے دریافت کیا۔

"جی ہاں۔ میں بغیر اجازت لئے گھر میں داخل ہو جاؤں گا۔ اور وہاں سے اپنی بیوی کو لئے بغیر ہرگز نہ ٹلوں گا۔

اگر میں پاگل ہوں تو ہوں مگر مجھے یقین ہے کہ سوشیلا (یہ کہتے ہوئے وہ ذرا سا جھینٹ گیا) میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو گی۔ میں نے اس کے لئے نمائش میں سے ایک ادنیٰ سوئٹر خریدا ہے۔ وہ اس کو یقیناً پسند کرے گی۔ کیا آپ اسے دیکھنا پسند فرمائیں گے؟"

اگر آپ کو ٹرنک وغیرہ کھولنے کی زحمت نہ اٹھانا پڑے" میں نے جواب
دیا۔

"نہیں صاحب یہ تو میں نے قمیض کے اندر خود پہن رکھا ہے" یہ کہہ کر وہ اٹھا
اور کوٹ اتار دیا۔ پھر قمیض کو پتلون کی گرفت سے آزاد کر کے اس نے اُسے
اتار دیا
وہ واقعی ایک رنگ برنگی بیلوں والا زنانہ
سوئٹر پہنے ہوئے تھا۔

"کیا آپ کو پسند ہے؟
یہ میں نے اس لئے پہن رکھا
ہے کہ اگر سوشیلا نے اس کے لینے سے انکار کر دیا تو میں اُسے پہنے ہی رہوں
گا۔"

اس زنانہ سوئٹر میں وہ کس قدر عجیب معلوم ہوتا تھا۔

ترقی پسند

جوگندر سنگھ کے افسانے جب مقبول ہونا شروع ہوئے تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ مشہور ادیبوں اور شاعروں کو اپنے گھر بلائے، اور ان کی دعوت کرے۔ اس کا خیال تھا کہ یوں اس کی شہرت اور مقبولیت اور بھی زیادہ ہو جائے گی۔

جوگندر سنگھ بڑا خوش فہم انسان تھا۔ مشہور ادیبوں اور شاعروں کو اپنے گھر بُلا کر اور اُن کی خاطر تواضع کرنے کے بعد جب وہ اپنی بیوی امرت کور کے پاس بیٹھتا تو کچھ دیر کے لئے بالکل بھول جاتا، کہ اس کا کام ڈاک خانہ میں چٹھیوں کی دیکھ بھال کرنا ہے۔ اپنی نیلی گزی پٹیالہ فیشن کی رنگی ہوئی پگڑی اُتار کر جب وہ ایک طرف رکھ دیتا تو اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کے لمبے لمبے کالے گیسوؤں کے نیچے جو چھوٹا سا سر چھپا ہوا ہے۔ اس میں ترقی پسند ادب کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ اس احساس سے اس کے دل و دماغ میں ایک

عجیب قسم کی اہمیت پیدا ہو جاتی اور وہ یہ سمجھتا تھا کہ دنیا میں جس قدر افسانہ نگار اور ناول نویس موجود ہیں، سب کے سب اس کے ساتھ ایک نہایت ہی لطیف رشتے کے ذریعے سے منسلک ہیں"

امرت کور کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ اس کا خاوند لوگوں کو مدعو کرنے پر اس سے ہر بار کیوں کہا کرتا ہے "امرت یہ جو آج چائے پر آرہے ہیں ہندوستان کے بڑے شاعر ہیں سمجھیں، بہت بڑے شاعر، دیکھو ان کی خاطر تواضع میں کوئی کسر باقی نہ رہے۔

آنے والا کبھی ہندوستان کا بہت بڑا شاعر ہوتا تھا، یا بہت بڑا افسانہ نگار۔ اس سے کم پائے کا آدمی وہ کبھی بلاتا ہی نہیں تھا۔ اور پھر دعوت میں "اونچے اونچے سروں میں جو باتیں ہوتی تھیں ان کا مطلب وہ آج تک نہ سمجھ سکتی تھی۔ ان گفتگوؤں میں ترقی پسند کا ذکر عام ہوتا تھا۔ اس ترقی پسندی کا مطلب بھی امرت کور کو معلوم نہیں ہوتا تھا۔

ایک دفعہ جوگندر سنگھ بہت بڑے افسانہ نگار کو چائے پلا کر فارغ ہوا اور اندر رسوئی میں آکر بیٹھا، تو امرت کور نے پوچھا "یہ موئی ترقی پسندی کیا ہے؟"

جوگندر سنگھ نے پگڑی سمیت اپنے سر کو ایک خفیف سی جنبش دی اور کہا: "ترقی پسندی ... اس کا مطلب تم فوراً ہی نہ سمجھ سکو گی۔ ترقی پسندی اس کو کہتے ہیں۔ جو ترقی پسند کرے۔ یہ لفظ فارسی کا ہے، انگریزی میں ترقی پسند کو ریڈیکل کو کہتے ہیں" وہ افسانہ نگار، یعنی کہانیاں لکھنے والے جو اپنا

نگاری میں ترقی چاہتے ہوں، ان کو ترقی پسند افسانہ نگار کہتے ہیں۔ اس وقت ہندوستان میں صرف تین چار ترقی پسند افسانہ نگار ہیں، جن میں میرا نام بھی شامل ہے۔

جوگندر سنگھ عادتاً انگریزی لفظوں اور جملوں کے ذریعہ سے اپنے خیالات کا اظہار کیا کرتا تھا۔ اس کی یہ عادت یک گونہ طبیعت بن گئی تھی۔ چنانچہ اب وہ بلا تکلف ایک ایسی انگریزی زبان میں سوچتا تھا جو چند مشہور انگریزی ناول نویسوں کے اچھے اچھے چست فقروں پر مشتمل تھی۔ عام گفتگو میں وہ پچاس فیصد انگریزی الفاظ اور انگریزی کتابوں سے چنے ہوئے فقروں کو استعمال کرتا تھا ——— افلاطون کو ہمیشہ پلیٹو کہتا تھا۔ اسی کو ارسطو ارسٹوٹیل۔ ڈاکٹر سگمنڈ فرائیڈ سوپنہار اور نطشے کا ذکر وہ اپنی ہر معرکے کی گفتگو میں کیا کرتا تھا۔ عام بات چیت میں وہ ان فلسفیوں کا نام نہیں لیتا تھا اور بیوی سے گفتگو کرتے وقت وہ اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتا تھا۔ کہ انگریزی لفظ اور یہ فلسفی نہ آنے پائیں۔

جوگندر سنگھ سے جب اس کی بیوی نے ترقی پسندی کا مطلب سمجھا تو اُسے بہت مایوسی ہوئی۔ کیوں کہ اس کا خیال تھا کہ ترقی پسندی کوئی بہت بڑی چیز ہوگی جس پر بڑے بڑے شاعر اور افسانہ نگار اس کے خاوند کے ساتھ مل کر بحث کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جب اس نے یہ سوچا کہ ہندوستان میں صرف تین چار ترقی پسند افسانہ نگار ہیں۔ تو اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ یہ چمک دیکھ کر جوگندر سنگھ کے مونچھوں بھرے ہونٹ ایک دبی دبی سی مسکراہٹ کے

گیا ہے۔ امرت تمہیں سُنکر بہت خوشی ہوگی کہ ہندوستان کا ایک بہت بڑا آدمی مجھ سے ملنے کی خواہش رکھتا ہے۔ اس نے میرے افسانے پڑھے ہیں اور بہت پسند کئے ہیں۔"

امرت کور نے پوچھا "یہ بڑا آدمی کوئی ہے، یا آپ کی طرح کہانیاں لکھنے والا؟"

جوگندر سنگھ نے جیب سے ایک لفافہ نکالا اور اُسے اپنے دوسرے ہاتھ کی پشت پر تھپتھپاتے ہُوئے کہا "یہ آدمی کوئی بھی ہے۔ افسانہ نگار ہے، لیکن اس کی سب سے بڑی خوبی، جو اس کی نہ مٹنے والی شہرت کا باعث ہو رہی ہے۔"

"خوبی کیا ہے؟"

"وہ ایک آوارہ گرد ہے۔"

"آوارہ گرد"

"ہاں ایک آوارہ گرد ہے۔ جس نے آوارہ گردی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا ہے وہ ہمیشہ گھومتا رہتا ہے کبھی کشمیر کی ٹھنڈی وادیوں میں ہوتا ہے۔ اور کبھی ملتان کے تپتے ہوئے میدانوں میں کبھی لنکا میں، کبھی تبت میں"

امرت کور کی دلچسپی بڑھ گئی "مگر یہ کرتا کیا ہے؟"

"گیت اکٹھے کرتا ہے ہندوستان کے ہر حصے کے گیت پنجابی، گجراتی، مرہٹی، پشاوری، کشمیری، مارواڑی،

ہندوستان میں جتنی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اُن کے جتنے گیت اس کو ملتے ہیں، اکٹھے کر لیتا ہے۔

"اتنے گیت اکٹھے کر کے کیا کرے گا؟"

کتابیں چھاپتا ہے مضمون لکھتا ہے۔ تاکہ دوسرے بھی یہ گیت سن سکیں۔ انگریزی زبان کے کئی رسالوں میں اس کے مضمون چھپ چکے ہیں۔

گیت اکٹھے کرنا اور اُن کو سلیقے کے ساتھ پیش کرنا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ وہ بہت بڑا آدمی ہے امرت بہت بڑا آدمی ہے اور دیکھو اس نے مجھے کیسا لکھا ہے۔

یہ کہہ کر جوگندر سنگھ نے اپنی بیوی کو وہ خط پڑھ کر سنایا جو ہرندر ناتھ ترپاٹھی نے اس کو اپنے گاؤں سے ڈاک خانہ کے پتے سے بھیجا تھا ــــ

ــــ اس خط میں ہرندر ناتھ ترپاٹھی نے بڑی میٹھی زبان میں جوگندر سنگھ کے افسانوں کی تعریف کی تھی۔ اور لکھا تھا کہ آپ ہندوستان کے ترقی پسند افسانہ نگار ہیں۔ جب یہ فقرہ جوگندر نے پڑھا تو بول اٹھا "لو دیکھو ترپاٹھی صاحب بھی لکھتے ہیں کہ میں ترقی پسند ہوں۔

جوگندر سنگھ نے پورا خط سنانے کے بعد ایک، دو سیکنڈ اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ اور اثر معلوم کرنے کے لئے پوچھا "کیوں؟"

امرت کور اپنے خاوند کی تیز نگاہی کے باعث کچھ جھینپ سی گئی۔ اور مسکرا کر کہنے لگی "مجھے کیا معلوم ــــ بڑے آدمیوں کی باتیں بڑے ہی سمجھ سکتے ہیں۔

جوگندر سنگھ نے اپنی بیوی کی اس ادا پر غور نہ کیا۔ وہ دراصل ہرمندر ناتھ ترپاٹھی کو اپنے یہاں بلانے اور اُسے کچھ دیر ٹھہرانے کی بابت سوچ رہا تھا۔ "امرت، میں کہتا ہوں کہ ترپاٹھی صاحب کو دعوت دی جائے کیا خیال ہے تمہارا ——— لیکن میں سوچتا یہ ہوں کہ کیا پتہ ہے کہ وہ انکار کر دے ——— بہت بڑا آدمی ہے۔ ممکن ہے وہ ہماری، اس دعوت کو خوشامد سمجھے۔"

ایسے موقعوں پر وہ بیوی کو اپنے ساتھ شامل کر لیتا تھا تاکہ دعوت کا بوجھ دو آدمیوں میں بٹ جائے۔ چنانچہ جب اس نے "ہماری" کہا تو امرت کور نے جو اپنے خاوند جوگندر سنگھ کی طرح بے حد سادہ لوح تھی۔" ہرمندر ناتھ ترپاٹھی سے دلچسپی لینا شروع کر دی۔ حالاں کہ اس کا نام بھی اس کے لئے ناقابلِ فہم تھا۔ اور یہ بات بھی اس کی سمجھ سے بالاتر تھی کہ ایک آوارہ گرد۔ گیت جمع کر کے کیسے بہت بڑا آدمی بن سکتا ہے۔ جب اس سے یہ کہا گیا تھا کہ ہرمندر ناتھ ترپاٹھی گیت جمع کرتا ہے تو اُسے اپنے خاوند کی ایک سنائی ہوئی بات یاد آگئی تھی۔ کہ ولایت میں لوگ تیتریاں پکڑنے کا کام کرتے ہیں۔ اور یوں کافی روپیہ کماتے ہیں۔ چنانچہ اس نے خیال کیا تھا۔ کہ شائد ترپاٹھی صاحب نے گیت جمع کرنے کا کام ولائت کے کسی آدمی سے سیکھا ہوگا۔

جوگندر سنگھ نے پھر اپنا اندیشہ ظاہر کیا۔ "ممکن ہے وہ ہماری اس دعوت کو خوشامد سمجھے؟"

اس میں خوشامد کی کیا بات ہے۔ اور بھی تو کئی بڑے آدمی آپ کے، پاس آتے ہیں۔ آپ اُن کو خط لکھ دیجئے۔ میرا خیال ہے کہ وہ آپ کی دعوت ضرور قبول کر لیں گے۔ اور پھر اُن کو بھی تو آپ سے ملنے کا بہت شوق ہے۔

ہاں، یہ تو بتایئے کیا اُن کے بیوی بچے ہیں؟"

"بیوی بچے"، جوگندرا سنگھ اُٹھا، خط کا مضمون انگریزی زبان میں سوچتے ہوئے کہا۔ "ہوں گے، ضرور ہوں گے ہاں ہیں، میں نے اُن کے ایک مضمون میں پڑھا تھا۔ اُن کی بیوی بھی ہے اور ایک بچی بھی ہے۔"

یہ کہہ کر جوگندر سنگھ اٹھا، خط کا مضمون اس کے دماغ میں مکمل ہو چکا تھا۔ دوسرے کمرے میں جا کر اس نے چھوٹا سائز کا پیڈ نکالا جس پر وہ خاص خاص آدمیوں کو خط لکھا کرتا تھا۔ اور ہرندر ناتھ ترپاٹھی کے نام اردو میں دعوت نامہ لکھا۔ یہ اس مضمون کا ترجمہ تھا جو اس نے اپنی بیوی سے گفتگو کرتے وقت سوچا تھا۔

تیسرے روز ہرندر ناتھ ترپاٹھی کا جواب آیا۔ جوگندر سنگھ نے دھڑکتے ہوئے دل سے لفافہ کھولا۔ جب اس نے پڑھا کہ اس کی دعوت قبول کر لی گئی ہے تو اس کا دل اور دھڑکنے لگا۔ اس کی بیوی امرت کور دھوپ میں اپنے چھوٹے بچے کے کیسوں میں دہی ڈال کر مل رہی تھی کہ جوگندر سنگھ لفافہ ہاتھ میں لے کر اس کے پاس پہنچا۔ "انہوں نے ہماری دعوت قبول کر لی۔ کہتے ہیں کہ وہ لاہور یوں بھی ایک ضروری کام سے آرہے تھے۔ اپنی

تازہ کتاب چھپوانے کا ارادہ رکھتے ہیں اور ہاں، انہوں نے تم کو یہ نام لکھا ہے۔

امرت کور کو اس احساس سے بہت خوشی ہوئی کہ اتنے بڑے آدمی نے جس کا کام گیت اکٹھے کرنا ہے اس کو یہ نام کہا ہے چنانچہ اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کا بیاہ ایسے آدمی سے ہوا جس کو ہندوستان کا ہر بڑا آدمی جانتا ہے

سردیوں کا موسم تھا۔ نومبر کے پہلے دن تھے۔ جوگندر سنگھ صبح سات بجے بیدار ہو گیا۔ اور دیر تک بستر میں آنکھیں کھولے پڑا رہا اس کی بیوی امرت کور اور اس کا بچہ دونوں لحاف میں لپٹے ہوئے پاس والی چارپائی پر پڑے تھے۔ جوگندر نے سوچنا شروع کیا۔ ترپاٹھی صاحب سے مل کر اسے کتنی خوشی حاصل ہوگی۔ اور خود ترپاٹھی صاحب کو بھی یقیناً اس سے مل کر بڑی مسرت حاصل ہوگی۔ کیوں کہ وہ ہندوستان کا جواں افکار افسانہ نویس اور ترقی پسند ادیب تھا۔ ترپاٹھی صاحب سے وہ ہر موضوع پر گفتگو کرے گا۔ گیتوں پر، دیہاتی بولیوں پر، افسانوں پر اور تازہ جنگی حالات پر ——— وہ اُن کو بتائے گا کہ دفتر کا ایک محنتی کلرک ہونے پر بھی وہ کیسے اچھا افسانہ نگار بن گیا۔ کیا یہ عجیب سی بات نہیں کہ ڈاک خانہ میں چٹھیوں کی دیکھ بھال کرنے والا انسان طبعاً "آرٹسٹ ہو۔"

جوگندر سنگھ کو اس بات پر بہت ناز تھا کہ ڈاک خانہ میں مزدوروں

کی طرح چھ سات گھنٹے کام کرنے کے بعد بھی وہ اتنا وقت نکال لیتا ہے کہ ایک ماہانہ پرچہ مرتب کرتا ہے اور دو تین پرچوں کے لئے ہر مہینے ایک افسانہ بھی لکھتا ہے دوستوں کو ہر ہفتے جو لمبے چوڑے خط لکھے جاتے تھے، ان کا ذکر الگ رہا۔

دیر تک وہ بستر پہ لیٹا ہرندر ناتھ ترپاٹھی سے اپنی پہلی ملاقات کی ذہنی تیاریاں کرتا رہا جوگندر سنگھ نے اس کے افسانے اور مضمون پڑھے تھے۔ اور اس کا فوٹو بھی دیکھا اور کسی کے افسانے پڑھ کر اور فوٹو دیکھ کر وہ عام طور پر یہی محسوس کیا کرتا تھا۔ کہ اس نے آدمی کو اچھی طرح جان لیا ہے۔ لیکن ہرندر ناتھ ترپاٹھی کے معاملے میں اس کو اپنے اوپر اعتبار نہیں آتا تھا۔ کبھی اس کا کہنا تھا کہ ترپاٹھی اس کے لئے بالکل اجنبی ہے، اس کے افسانہ نگار دماغ میں بعض اوقات ترپاٹھی ایک ایسے آدمی کی صورت میں پیش ہوتا تھا جس نے کپڑوں کے بجائے اپنے جسم پر کاغذ لپیٹے رکھے ہوں۔ اور جب وہ کاغذوں کے متعلق سوچتا تھا۔ تو اسے انارکلی کی وہ دیوار یاد آجاتی تھی جس پر سینما کے اشتہار اوپر تلے اتنی تعداد میں چپکے ہوئے تھے کہ ایک اور دیوار بن گئی۔

جوگندر سنگھ بستر پہ لیٹا دیر تک سوچتا رہا کہ اگر وہ ایسا ہی آدمی نکل آیا تو اس کو سمجھنا بہت دشوار ہو جائے گا۔ مگر بعد میں جب اس کو اپنی ذہانت کا خیال آیا تو اس کی مشکلیں آسان ہو گئیں اور وہ اٹھ کر ہرندر ناتھ ترپاٹھی کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔

خط و کتابت کے ذریعے سے یہ طے ہو گیا ہے کہ ہرندر ناتھ ترپاٹھی خود جوگندر سنگھ کے مکان پر چلا آئے گا۔ کیوں کہ ترپاٹھی یہ فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ وہ لاری سے سفر کرے گا، یا ریل سے ٹرین سے۔ بہر حال یہ بات تو قطعی طور پر طے ہو گئی تھی کہ جوگندر سنگھ سوموار کو ڈاک خانہ سے چھٹی لے کر سارا دن اپنے مہمان کا انتظار کرے گا۔

نہا دھو کر اور کپڑے بدل کر جوگندر سنگھ دیر تک باورچی خانہ میں اپنی بیوی کے پاس بیٹھا رہا۔ دونوں نے چائے دیر سے پی، اس خیال سے کہ شاید ترپاٹھی آ جائے۔ لیکن جب وہ نہ آیا تو انہوں نے کیک وغیرہ سنبھال کر الماری میں رکھ دئیے اور خود خالی چائے پی کر مہمان کے انتظار میں بیٹھ گئے۔

جوگندر سنگھ باورچی خانے سے اٹھ کر کمرے میں آیا اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر جب اس نے اپنی ڈاڑھی کے بالوں میں رہ گئے چھوٹے چھوٹے گچھے الگ کرنے شروع کئے۔ کہ وہ نیچے کی تہہ ہو جائیں تو باہر دروازہ پر دستک ہوئی۔ ڈاڑھی کو ویسے ہی نامکمل حالت میں چھوڑ کر اس نے ڈیوڑھی کا دروازہ کھولا۔ جیسا کہ اس کو معلوم تھا، سب سے پہلے اس کی نظر ہرندر ناتھ ترپاٹھی کی سیاہ گھنی ڈاڑھی پر پڑی جو اس کی ڈاڑھی سے بیس گنا بڑی تھی۔ بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ

ہرندر ناتھ کے ہونٹوں پر جو بڑی بڑی مونچھوں کے اندر چھپے،

ہوئے مجھے مسکراہٹ پیدا ہوئی ۔ اس کی ایک آنکھ قدرے ٹیڑھی تھی، زیادہ ٹیڑھی ہوگئی ۔ اور اُس نے اپنی لمبی لمبی زلفوں کو ایک طرف جھٹک کر اپنا ہاتھ جو کسی کسان کا ہاتھ معلوم ہوتا تھا جوگندر سنگھ کی طرف بڑھا دیا ۔"

جوگندر سنگھ نے جب اس کے ہاتھ کی مضبوط گرفت محسوس کی اور اس کو ترپاٹھی کا وہ چرمی تھیلا نظر آیا جو حاملہ عورت کے پیٹ کی طرح پھولا ہوا تھا۔ وہ بہت متاثر ہوا ۔ وہ صرف اس قدر کہہ سکا کہ "ترپاٹھی صاحب آپ سے مل کر مجھے بیحد خوشی حاصل ہوئی ہے"

ہرندر ناتھ ترپاٹھی کو آئے اب پندرہ روز ہو چکے تھے ۔ اس کی آمد کے دوسرے روز ہی اس کی بیوی اور بچی بھی آگئی تھیں ۔ یہ دونوں ترپاٹھی کے ساتھ ہی گاؤں سے تھیں ۔ مگر دو روز کے لئے مزنگ ایں ایک دور کے رشتے دار کے پاس ٹھہر گئی تھیں ۔ اور چونکہ ترپاٹھی نے اس رشتہ دار کے پاس ان کا زیادہ دیر تک ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا تھا ۔ اس لئے اس نے اپنے پاس بلوا لیا تھا ۔

پہلے چار دن بڑی دلچسپ باتوں میں صرف ہوئے ۔ ہرندر ناتھ ترپاٹھی سے اپنے افسانوں کی تعریف سنکر جوگندر سنگھ بہت خوش ہوتا رہا تھا ۔ اس نے ایک مکمل افسانہ جو غیر مطبوعہ تھا ترپاٹھی کو سنایا اور داد حاصل کی ۔ دو مکمل افسانے بھی سنائے جن کے متعلق ترپاٹھی نے اچھی رائے کا اظہار کیا ——— ترقی پسند ادب پر بھی بحثیں ہوتی رہیں ۔ مختلف افسانہ نگاروں کی فنی کمزوریاں نکالی گئیں ۔ نئی اور پرانی شاعری کا مقابلہ کیا گیا غرضیکہ یہ چار دن بڑی اچھی

طرح گزرے اور جوگندر سنگھ ترپاٹھی کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا، اس کی گفت گو کا انداز جس میں بیک وقت بچپنا اور بڑھاپا تھا۔ جوگندر کو بہت پسند آیا۔ اس کی لمبی ڈاڑھی جو اس کی اپنی ڈاڑھی سے بیس گنا بڑی تھی۔ اس کے خیالات پر چھا گئی۔ اور اس کی کالی کالی زلفیں جن میں دیہاتی گیتوں کی روانی تھی۔ ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے رہنے لگیں۔ ڈاک خانہ کی چھچھوندل کی دیکھ بھال کرنے کے دوران میں بھی ترپاٹھی کی یہ زلفیں اسے نہ بھولتیں۔

چار دن میں ترپاٹھی نے جوگندر سنگھ کو موہ لیا، وہ اس کا گرویدہ ہو گیا۔ اس کی ٹیڑھی آنکھ میں بھی اس کو خوبصورتی نظر آنے لگی، بلکہ ایک تو اس نے سوچا اگر اس کی آنکھ میں ٹیڑھا پن نہ ہوتا تو چہرے پر یہ بزرگی کبھی پیدا نہ ہوتی۔

ترپاٹھی کے بڑے بڑے ہونٹ جب ترپاٹھی کی گھنی مونچھوں کے پیچھے ہلتے تو جوگندر ایسا محسوس کرتا۔ کہ جھاڑیوں میں پرندے بول رہے ہیں۔ ترپاٹھی ہولے ہولے بولتا تھا۔ اور بولتے بولتے جب وہ اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتا تو جوگندر سنگھ کے دل کو بہت راحت پہنچتی، وہ سمجھتا تھا کہ اس کے دل پر پیار سے ہاتھ پھیرا جا رہا ہے۔

چار روز تک جوگندر سنگھ ایسی فضا میں رہا جس کو اگر وہ اپنے کسی افسانے میں بھی بیان کرنا چاہتا تو نہ کر سکتا۔ لیکن پانچویں روز ایکا ایکی ترپاٹھی نے اپنا چرمی تھیلا کھولا اور اس کو اپنے افسانے سنانے شروع کئے اور دس

روز تک متواتر وہ اس کو اپنے افسانے سناتا رہا۔ اس دوران میں ترپاٹھی صاحب نے جوگندر سنگھ کو کئی کتابیں سنا دیں۔

جوگندر سنگھ تنگ آگیا۔ اب اس کو افسانوں سے نفرت پیدا ہو گئی۔ ترپاٹھی کا چرمی تھیلا جس کا پیٹ بنیوں کی توند کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ اس کے لئے ایک عذاب بن گیا۔ ہر روز شام کو دفتر سے لوٹتے ہوئے اس بات کا کھٹکا رہنے لگا کہ گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی ترپاٹھی سے ملاقات ہو گی۔ ادھر ادھر کی چند باتیں ہوں گی۔ وہ چرمی تھیلا کھولا جائے گا۔ اور اس کو ایک یا دو طویل افسانے سنا دیئے جائیں گے۔

جوگندر سنگھ ترقی پسند تھے۔ یہ ترقی پسندی اگر اس کے اندر نہ ہوتی تو وہ صاف لفظوں میں ترپاٹھی سے کہہ دیتا۔ "بس۔ بس ترپاٹھی صاحب بس۔ بس اب مجھ میں آپ کے افسانے سننے کی طاقت نہیں رہی۔" مگر وہ سوچتا۔ "نہیں نہیں ———— میں ترقی پسند ہوں، مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیئے، دراصل یہ میری کمزوری ہے کہ اب اس کے افسانے مجھے اچھے نہیں لگتے۔ ان میں ضرور کوئی نہ کوئی خوبی ہو گی ———— اس لئے کہ اس کے پہلے افسانے مجھے خوبیوں سے بھرے ہوئے نظر آتے تھے، ———— میں ———— میں ———— متعصب ہو گیا ہوں۔"

ایک ہفتے سے زیادہ عرصے تک جوگندر سنگھ کے ترقی پسند دماغ

میں یہ کشمکش جاری رہی ۔ اور وہ سوچ سوچ کر اس حد تک پہنچ گیا ـــــ جہاں سوچ وچار ہو ہی نہیں سکتی ۔ طرح طرح کے خیال اس کے دماغ میں آتے مگر وہ ٹھیک طور پر ان کی جانچ پڑتال نہ کر سکتا ۔ اس کی ذہنی افرا تفری آہستہ آہستہ بڑھتی گئی ۔ اور وہ ایسا محسوس کرنے لگا کہ ایک بہت بڑا مکان ، ہے جس میں بے شمار کھڑکیاں ہیں ، اس مکان کے اندر وہ اکیلا ہے آندھی آ گئی ہے ۔ کبھی اس کھڑکی کے پٹ بجتے ہیں ، کبھی اس کھڑکی کے ، اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا ۔ کہ وہ اتنی کھڑکیوں کو ایک دم کیسے بند کرے ۔

جب ترپاٹھی کو اس کے یہاں آئے بیس روز ہو گئے ۔ تو اسے بے چینی محسوس ہونے لگی ۔ ترپاٹھی اب شام کو نیا افسانہ لکھ کر جب اسے سناتا ۔ تو جوگندر سنگھ کو ایسا محسوس ہوتا کہ بہت سی مکھیاں اس کے کانوں کے پاس بھنبھنا رہی ہیں ۔ وہ کسی اور ہی سوچ کر میں غرق ہوتا ۔

ایک روز ترپاٹھی نے جب اس کو اپنا تازہ افسانہ سنایا ۔ جس میں کسی عورت اور مرد کے جنسی تعلقات کا ذکر تھا ۔ یہ سوچ کر اس کے دل کو دھکا سا لگا کہ پورے اکیس دن اپنی بیوی کے پاس سونے کے بجائے وہ ایک لم ڈھینگ کے ساتھ ایک ہی لحاف میں سوتا رہا ہے ۔ اس احساس نے جوگندر کے دل و دماغ میں ایک لمحہ کے لئے انقلاب پیدا کر دیا ۔ یہ کیسا مہمان ہے کہ جونک کی طرح چمٹ کر رہ گیا ہے ، یہاں سے ہلنے کا نام ہی نہیں لیتا ـــــ اور ـــــ اور ـــــ

میں اُن کی بیوی صاحبہ کو تو بھول ہی گیا تھا۔ اور اُن کی بچی سارا گھر اٹھ کر چلا آیا ہے۔ ذرا بھر بھی خیال نہیں کہ ایک غریب آدمی کا کچومر نکل جائے گا

میں ڈاک خانہ میں ملازم ہوں۔ صرف پچاس روپیہ ماہوار کماتا ہوں۔ آخر کب تک اُن کی خاطر تواضع کرتا رہوں گا۔ اور پھر افسانے

اس کے افسانے جو کہ ختم ہونے میں نہیں آتے۔ میں انسان ہوں لوہے

لوہے کا ٹرنک نہیں ہوں، جو ہر روز اس کے افسانے سنتا رہوں

اور کس قدر غضب ہے کہ میں اپنی بیوی کے پاس تک نہیں گیا

سردیوں کی یہ راتیں ضائع ہو رہی ہیں۔"

اکیس دنوں کے بعد جوگندر ترپاٹھی کو ایک نئی روشنی میں دیکھنے لگا۔ اب اس کو ترپاٹھی کی ہر چیز معیوب نظر آنے لگی۔ اُن کی ٹیڑھی آنکھ جس میں جوگندر پہلے خوب صورتی دیکھتا تھا۔ اب صرف ایک ٹیڑھی آنکھ تھی۔ اس کی کالی زلفوں میں بھی اب جوگندر کو وہ ملاحی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اور اس کی ڈاڑھی دیکھ کر اب سوچتا تھا کہ اتنی لمبی ڈاڑھی رکھنا بہت بڑی حماقت ہے۔

جب ترپاٹھی کو اس کے یہاں پچیس دن ہو گئے تو ایک عجیب و غریب کیفیت اس کے اوپر طاری ہو گئی۔ وہ اپنے آپ کو اجنبی سمجھنے لگا — اُسے ایسے محسوس ہونے لگا۔ جیسے وہ کبھی جوگندر سنگھ کو جانتا تھا مگر اب نہیں جانتا۔ اپنی بیوی کے متعلق وہ سوچتا کہ "جب ترپاٹھی چلا

جائے گا اور سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تو میری نئے سرے سے شادی ——— ہو گی ——— میری وہ پرانی زندگی جس کو ناٹ کے طور پر یہ لوگ استعمال کر رہے ہیں۔ پھر عود کر آئے گی ——— میں پھر اپنی بیوی کے ساتھ سو سکوں گا ——— اور ———"

اس کے آگے جب وہ سوچتا تو جوگندر سنگھ کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ اور اس کے حلق میں کوئی تلخ سی چیز پھنس جاتی۔ اس کا جی چاہتا کہ دوڑا دوڑا اندر آجائے اور امرت کور جو کبھی اس کی بیوی ہوا کرتی تھی اپنے گلے سے لگا لے اور رونا شروع کر دے۔ مگر ایسا کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ کیوں کہ وہ ترقی پسند افسانہ نگار تھا۔

کبھی کبھی جوگندر سنگھ کے دل میں یہ خیال دودھ کے اُبال کی طرح اٹھتا کہ ترقی پسندی کا لحاف جو اُس نے اوڑھ رکھا ہے۔ اُتار پھینکے اور چلانا شروع کر دے۔ ترپاٹھی: ترقی پسندی کی ایسی تیسی۔ تم اور تمہارے اکٹھے کئے ہوئے گیت بکواس ہیں۔ مجھے اپنی بیوی چاہئیے ——— تمہاری خواہشیں تو ساری گیتوں میں جذب ہو چکی ہیں۔ میں ابھی نوجوان ہوں میری حالت پر رحم کرو ——— ذرا غور تو کرو میں جو ایک منٹ اپنی بیوی کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا، پچیس دنوں سے تمہارے ساتھ ایک ہی لحاف میں سو رہا ہوں ——— کیا یہ ظلم نہیں۔

جوگندر سنگھ بس گھول کر رہ جاتا۔ ترپاٹھی اس کی حالت سے بے خبر ہر روز شام کو تازہ افسانہ اُسے سنا دیتا۔ اور اس کے ساتھ لحاف میں سو

جانا۔ جب ایک مہینہ گزر گیا جوگندر سنگھ کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ تو تیرپاٹھی کی غیر حاضری میں تریپاٹھی کر عسلخانہ میں وہ اپنی بیوی سے ملا، دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس ڈر کے مارے کہ ترپاٹھی کی بیوی نہ آجائے۔ اس نے جلدی سے اُس کا بوسہ لیا جیسے ڈاک خانہ میں لفافوں پہ مہر لگائی جاتی ہے اور کہا ـــــ آج رات تم جاگتی رہنا، میں ترپھائی سے یہ کہہ کر باہر جا رہا ہوں کہ رات کے ڈھائی بجے واپس آؤں گا۔ لیکن میں جلدی آؤں گا بارہ بجے ـــــــــــ پورے بارہ بجے میں ہولے ہولے دستک دوں گا۔ تم چپکے سے دروازہ کھول دینا اور پھر ہم ــــــ ڈیوڑھی بالکل الگ تھلگ ہے۔ لیکن تم احتیاط کے طور پر وہ دروازہ جو غسلخانے کی طرف کھلتا ہے۔ بند کر دینا

بیوی کو اچھی طرح سمجھا کر وہ ترپاٹھی سے ملا اور اس سے رخصت ہو کر چلا گیا ـــ بارہ بجنے میں سر چار گھنٹے باقی تھے۔ جن میں سے دو جوگندر نے اپنی سائیکل پر ادھر ادھر گھومنے میں کاٹے۔ اس کو سردی کی شدت کا بالکل احساس نہ ہوا۔ اس لیئے کہ بیوی سے ملنے کا خیال کافی گرم تھا ـــــــــــــــــــ

دو گھنٹے سائیکل پر گھومنے کے بعد وہ اپنے مکان کے پاس میدان میں بیٹھ گیا۔ اور محسوس کرنے لگا کہ وہ رومانی ہو گیا ہے۔ جب اس نے سرد رات کی دھندیالی خاموشی کا خیال کیا تو اُسے یہ ایک جانی پہچانی چیز نظر آئی۔ اور ٹھٹھرے ہوئے آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ جیسے پانی کی موٹی موٹی بوندیں بن گئی ہیں۔ کبھی کبھی ریلوے انجن کی چیخ خاموشی کو چھیڑ دیتی اور جوگندر سنگھ کا افسانہ نگار دماغ یہ سوچتا کہ خاموشی بہت بڑی برف

ڈھیلا ہے۔ اور سیٹی کی آواز مینج ہے جو اُس کے سینے میں کھُپ گئی ہے۔"

بہت دیر تک جوگندر ایک نئے قسم کے رومان کو اپنے دل و دماغ میں پھیلاتا رہا اور رات کی اندھیاری خوب صورتیوں کو کتنا ہا رہا، یکایک اُن خیالات سے چونک کر اُس نے گھڑی میں وقت دیکھا تو بارہ بجنے میں دو منٹ باقی تھے۔ اٹھ کر اُس نے گھر کا رُخ کیا اور دروازے پر ہولے سے دستک دی۔ پانچ سیکنڈ گزر گئے۔ دروازہ نہیں کھُلا۔ ایک بار پھر اس نے دستک دی۔

دروازہ کھُلا۔ جوگندر نے ہولے سے کہا "امرت ——— اور جب" نظریں اُٹھا کر اُس نے دیکھا تو امرت کور کے بجائے تر پاٹھی کھڑا ہے۔ اندھیرے میں جوگندر سنگھ کو ایسا معلوم ہوا کہ تر پاٹھی کی داڑھی اتنی لمبی ہو گئی ہے کہ زمین کو چھو رہی ہے۔ اس کو تر پاٹھی کی آواز سنائی دی۔ "تم جلدی آ گئے ——— چلو یہ بھی اچھا ہوا ——— میں نے ابھی ابھی ایک افسانہ مکمل کیا ہے ——— آؤ سنو۔"

نیا سال

کیلنڈر کا آخری پتا جس پر موٹے حروف میں ۳۱ دسمبر لکھا ہوا تھا، ایک لمحہ کے اندر اس کی پتلی انگلیوں کی گرفت میں تھا۔ اب کیلنڈر ایک ٹنڈ منڈ درخت سا نظر آنے لگا۔ جس کی ٹہنیوں کے سارے پتے خزاں کی پھونکوں نے اڑا دیئے ہوں۔

دیوار پر آویزاں کلاک ٹک ٹک کر رہا تھا۔ کیلنڈر کا آخری پتا جو ڈیڑھ انچ مربع کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا۔ اس کی پتلی انگلیوں میں یوں کانپ رہا تھا گویا سزائے موت کا قیدی پھانسی کے تختہ کے سامنے کھڑا ہے۔

کلاک نے بارہ بجے، پہلی ضرب پر انگلیاں متحرک ہوئیں۔ اور آخری ضرب پر کاغذ کا ایک ٹکڑا اور ننھی سی گولی بنا دیا گیا۔ انگلیوں نے یہ کام بڑی بے رحمی سے کیا۔ اور شخص کی یہ انگلیاں تھیں اور بھی زیادہ بے رحمی سے اس گولی کو نگل گیا۔"

اس کے لبوں پر ایک تیزابی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اور اس نے خالی کیلنڈر کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھا اور کہا "میں تمہیں لایا ہوں بغیر چبائے نگل گیا ہوں۔"

اس کے بعد ایک ایسے قہقہے کا شور بلند ہوا۔ جس میں توپوں کی گونج دب گئی جو نئے سال کے آغاز پر کہیں دور داغی جارہی تھی۔

جب تک ان توپوں کا شور جاری رہا۔ اس کے سوکھے ہوئے حلق سے قہقہے آتشیں لاوے کی طرح نکلتے رہے۔ وہ بے حد بے حد خوش تھا۔ بے حد خوش، یہی وجہ تھی کہ اس پر دیوانگی کا عالم طاری تھا۔ اس کی مسرت آخری درجہ پر پہنچی ہوئی تھی، وہ سارے کا سارا ہنس رہا تھا مگر اس کی آنکھیں رو رہی تھیں اور جب اس کی آنکھیں ہنستیں تو آپ کے دل سکڑے لبوں کو دیکھ کر یہی سمجھتے کہ اس کی روح کسی نہایت ہی سخت عذاب میں سے گزر رہی ہے۔"

بار بار نعرہ بلند کرتا "میں تمہیں کھا گیا ہوں ——— بغیر چبائے نگل گیا ہوں، ایک ایک کر کے تین سو چھیاسٹھ دونوں کو لیمپ سمیت ۔"

خالی کیلنڈر ——— اس کے اس عجیب و غریب دعوے کی تصدیق کر رہا تھا۔"

آج سے ٹھیک چار برس پہلے جب وہ اپنے کاندھوں پر مصیبت کا پہاڑ اٹھا کر اپنی روٹی کمانے کے لئے میدان میں نکلا تو کتنے آدمیوں نے اس کا مضحکہ اڑایا تھا، کتنے لوگ اس کی ہمت پر زیر لب ہنستے تھے۔

مگر اس نے ان باتوں کی کوئی پرواہ نہ کی تھی اور اُسے اب بھی کسی کی کیا پرواہ تھی۔ اس کو صرف اپنے آپ سے غرض تھی اور بس دوسروں کی جنت پر وہ ہمیشہ اپنی دوزخ کو ترجیح دیتا تھا، اور اب بھی اس چیز پر پابند تھا وہ ان دونوں گدھوں کی سی مشقت کر رہا تھا، کتوں سے بڑھ کر ذلیل زندگی بسر کر رہا تھا۔ مگر یہ چیزیں اس کے راستے میں حائل نہ ہوتی تھیں۔

کئی بار اُسے ہاتھ پھیلانا پڑا ——— اس نے ہاتھ پھیلایا لیکن ایک شان کے ساتھ پھیلایا کرتا تھا۔ اور کہا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا "یہ سب بھکاری جو سڑکوں پر جھولیاں پھیلائے اور کشکول اٹھائے پھرتے رہتے ہیں گویا مار کر اُدھار دینے چاہئیں۔ بھیک لے کر یہ ذلیل کتے شکر گزار نظر آتے ہیں حالاں کہ انہیں شکریہ گالیوں سے ادا کرنا چاہیئے ——— جو بھیک مانگتے ہیں وہ اتنے لعنتی نہیں جتنے کہ یہ لوگ جو دیتے ہیں۔ دان پُن کے طور پہ ——— جنت میں ایک ٹھنڈی کوٹھڑی بُک کرانے والے سوداگر!

اس کو کئی مرتبہ روپے پیسے کی امداد حاصل کرنے کی خاطر شہر کے دھنوانوں کے پاس جانا پڑا ——— اس نے ان دولتمندوں سے امداد حاصل کی ——— اُن کی کمزوریاں اُن ہی کے پاس بیچ کر! ——— اور اس نے یہ سودا کبھی اناڑی دکاندار کی خاطر نہیں کیا۔"

آپ شہر کی صحت کے محافظ کہے گئے ہیں۔ لیکن درحقیقت آپ بیماریاں فراہم کرنے کے ٹھیکیدار ہیں۔ حکومت کی کتابوں میں آپ کے نام کے سامنے میڈیکل آفیسر لکھا جاتا ہے مگر میری کتاب میں آپ کا نام امراض فروشوں کی فہرست میں درج ہے ــــــــ "پرسوں مارکیٹ میں آپ نے سنگتروں کے دو سو ٹوکرے پاس کر کے بھجوائے جو طبی اصول کے مطابق صحت عامہ کے لئے مضر تھے، دس روز پہلے آپ نے تقریباً دو ہزار کیلوں پر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ جن میں ہر ایک ہیضے کی پڑیا تھی، اور آج آپ نے اس بوسیدہ اور غلیظ عمارت کو بچا لیا۔ جہاں بیماریاں پرورش پاتی ہیں اور ــــــــ"

اسے عام طور پر آگے کہنے کی ضرورت ہی نہیں پیش آتی تھی، اس لئے اس کا سودا بہت کم گفت گو ہی سے طے ہو جاتا تھا۔ ــــــــ

ایک سستے اور بازاری قسم کے اخبار کا ایڈیٹر تھا جس کی اشاعت دو سو سے زیادہ نہ تھی ــــــــ دراصل وہ اشاعت کا قائل ہی نہ تھا ــــــــ وہ کہا کرتا تھا جو لوگ اخبار پڑھتے ہیں بے وقوف ہیں جن لوگوں کی زندگی ہنگامے سے پُر ہو اُن کو ان چھپے ہوئے چیتھڑوں سے کیا مطلب۔"

وہ اخبار اسے نہیں نکالتا تھا کہ اسے مضامین لکھنے کا شوق تھا یا وہ اخبار کے ذریعے سے شہرت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ نہیں بالکل نہیں ــــــــ ایک دو گھنٹے کی مصروفیت کے سوا جو اس کے اخبار

کی اشاعت کے لیے ضروری تھا۔ وہ اپنا بقایا وقت اُن خوابوں کی تعبیر دیکھنے میں گزارا کرتا تھا۔ جو ایک زمانہ سے اس کے ذہن میں موجود تھے۔ وہ اپنے لیے ایک ایسا مقام بنانا چاہتا تھا۔ جہاں اُسے کوئی چھیڑ نہ سکے۔ جہاں وہ اطمینان حاصل کر سکے ——— خواہ وہ دو سیکنڈ ہی کا کیوں نہ ہو۔

جنگ کے میدان میں فتح بر لب گور ہی نصیب ہو مگر ہو ضرور۔"

——— اور اگر شکست ہو جائے، اپنا پڑے گا تو بھی کیا ہرج ہے۔

——— شکست کھائیں گے۔ لیکن فتح کی کوشش حاصل کرتے ہوئے ——— موت اُن کی ہے۔ جو موت سے ڈر کر جان دیں اور جو زندہ رہنے کی کوشش میں موت سے لپٹ جائیں۔ زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے ——— کم از کم اپنے لیے!"

دنیا اس کے خلاف تھی۔ جو شخص بھی اُس سے ملتا تھا اُس سے نفرت کرتا تھا۔ وہ خوش تھا۔ نفرت میں محبت سے زیادہ تیزی ہوتی ہے

——— اگر سب لوگ مجھ سے محبت کرنا شروع کر دیں تو میں اس پہیے کی مانند ہو جاؤں جس میں اندر باہر اوپر نیچے سب جگہ تیل دیا گیا ہو ——— میں بھی کبھی اس گاڑی کو آگے دھکیل سکوں گا،، جسے لوگ زندگی کہتے ہیں

قریب قریب سب اس کے خلاف تھے۔ اور وہ اپنے مخالفین کی طرف یوں دیکھا کرتا تھا۔ گویا۔ وہ موٹر کے انجن میں لگے ہوئے پرزوں کو دیکھ رہا ہے۔"

کبھی ٹھنڈے نہیں ہونے چاہئیں۔"

اور اس نے اب تک اُن کو ٹھنڈے نہیں ہونے دیا تھا؛ وہ اس الاؤ کو بے جلائے رکھتا تھا جس پر وہ اپنا ہاتھ ناپ پر اپنا کام کرتا تھا۔ جس روز وہ اپنے مخالفین میں کسی کو نئے آدمی کا اضافہ کرتا تو اپنے دل سے کہا کرتا تھا۔ "آج میں نے الاؤ میں ایک سوکھی لکڑی جھونک دی ہے۔ جو دیر تک جلتی رہے گی۔"

اس کے ایک مخالف نے جلسے میں اُس کے خلاف بہت زہر اُگلا۔ اُسے بُرا بھلا کہا۔ حتیٰ کہ اُسے ننگی گالیاں دیں۔ اس کے مخالف کا یہ خیال تھا کہ یہ سب کچھ سُن کر اُسے نیند نہ آئے گی۔ مگر اس کے برعکس وہ تو اس روز معمول کے خلاف آرام سے سویا۔ اور اُسے، خود ساری رات آنکھوں میں کاٹنا پڑی، سب بھر اس کا ضمیر اُسے ستاتا رہا، حتیٰ کہ صبح اُٹھ کر وہ اس کے پاس آیا اور بہت بڑے ندامت بھرے لہجہ میں اس سے معذرت طلب کی۔

"مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے آپ جیسے بلند اخلاق انسان کو بُرا بھلا کہا۔ گالیاں دیں ——— دراصل ——— دراصل میں نے یہ سب کچھ بہت جلد بازی میں کہا۔ سوچے سمجھے بغیر ——— مجھے اکسایا گیا تھا۔ میں اپنے کئے پر نادم ہوں۔ اور مجھے اُمید ہے کہ آپ مجھے معاف فرمائیں گے۔ مجھ سے سخت غلطی ہوئی!"

——— بلند اخلاق! ——— اُسے اس اخلاق سے بہت چڑ تھی

اخلاق —— رخِ انسانیت کا غازہ —— اخلاق —— اخلاق

اخلاق —— یعنی چہ؛ یہ نہ کرو، وہ نہ کرو کی بے معنی گردان۔ انسان کی

آزادانہ سرگرمیوں میں بیٹھا ہُوا اسپنسر!"

اس کو معلوم تھا کہ اس کے کمزور دل مخالف نے جھوٹ بولا۔ مگر نہ معلوم

اس کے دل میں غصّہ پیدا نہ ہُوا —— بخلاف اس کے اُسے

ایسا محسوس ہوا کہ جو شخص اس کے سامنے بیٹھا معافی مانگ رہا ہے۔ ،

اس کی کوئی نہایت عزیز سے فنا ہو گئی ہے۔ وہ غایت درجہ بے رحم تصوّر

کیا جاتا تھا۔ اور وہ اصل میں تھا بھی بے رحم، نرم و نازک جذبات سے اس

کا سینہ بالکل پاک تھا۔ مگر اس پھر یہ اُسے کوئی چیز رینگتی ہوتی نظر آئی، اُسے

اس شخص پر رحم آنے لگا۔

آج تم روحانی طور پر مر گئے ہو —— اور مجھے تمہاری اس

موت پہ افسوس ہے!"

یہ سن کر اس کے مخالف کو پھر گالیاں دینا پڑیں۔ مگر اس کے کانوں تک

کوئی آواز نہ پہنچ سکی۔ مدّت ہوئی وہ اس کو کسی دور دراز قبرستان میں دفن کر

چکا تھا۔

چار برس سے وہ اسی طرح جی رہا تھا۔ زبردستی، دنیا کی مرضی کے خلاف

بہت سی قوتیں پسپا کر دینے پر تُلی ہوئی تھیں، مگر وہ اپنے وجود کا ایک ذرّہ

بھی جنگ کے بغیر ان کے حوالے کرنے کے لئے تیار نہ تھا —— جنگ

—— جنگ —— جنگ —— مخالف قوت کے خلاف

چمک، رحم و ترحم سے ناآشنائی و عشق و محبت سے پرہیز، امید و خوف اور استقبال سے بیگانگی اور پھر مونسو ہو۔"

چار برس سے، وہ زمانے کی تیز و تند ہوا میں ایک تازہ اور مضبوط درخت کی طرح کھڑا تھا۔ موسموں کے تغیر و تبدیل نے ممکن ہے اس کے جسم پر اثر کیا ہو۔ مگر اس کی روح پر ابھی تک کوئی خیر اثر انداز نہ ہو سکی تھی۔ وہ ابھی تک ویسی ہی تھی۔ جیسی کہ آج سے چار برس پہلے تھی۔ فولاد کی طرح سخت، یہ سختی قدرت کی طرف سے عطا کی گئی تھی۔ بلکہ خود اس نے پیدا کی تھی۔"

وہ کہتا تھا نرم و نازک روح کو اپنے سینے میں دبا کر اپنے زمانے کی پتھریلی زمین پر نہیں چل سکو گے۔ جو پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کاٹنا چاہے اُسے پاگل خانے میں بند کر دینا چاہیئے۔

شاعرانہ خیالات کو اس نے اپنے دماغ میں کبھی داخل نہ ہونے دیا تھا۔ اور اگر کبھی کبھار غیر ارادی طور پر اس کے دماغ میں پیدا ہو جاتے تھے تو وہ "حرامی بچوں" کا فوراً گلا گھونٹ دیا کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا "میں اُن بچوں کا باپ بننا نہیں چاہتا۔ جو میرے کاندھوں کا بوجھ بن جائیں۔"

اس نے اپنے ساز حیات سے ساری طرہیں تار دوی تھیں۔ اس نے اس میں سے وہ تمام تار ذبح کر باہر نکال دئے تھے۔ جن میں سے نرم و نازک سُر نکلتے تھے۔

زندگی کا صرف ایک راز ہے، اور وہ جزبہ ہے، جو آگے بڑھنے حملہ کرنے

مرنے اور مارنے کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ اس کے سوا باقی تمام راگنیاں فضول ہیں جو اعضاء پر تھکاوٹ طاری کرتی ہیں۔

اس کا دل شباب کے وجود عشق و محبت سے خالی تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے سے ہزارہا خوب صورت لڑکیاں اور عورتیں گزر چکی تھیں، مگر ان میں سے کسی ایک نے بھی اس کے دل پر اثر نہ کیا تھا ——— ——— وہ کہا کرتا تھا، اس پتھر میں عشق کی جونک نہیں لگ سکتی!"

وہ اکیلا تھا، بالکل اکیلا ——— کھجور کے اس درخت کی مانند جو کسی تپتے ریگستان میں کھڑا ہو ——— مگر وہ اس تنہائی سے نہ گھبرایا تھا۔ دراصل وہ کبھی تنہا رہتا ہی نہ تھا

جب میں کام میں مشغول ہوتا ہوں تو وہ ہی میرا ساتھی ہوتا ہے۔ اور جب میں اس سے فارغ ہو جاتا ہوں، تو میرے خیالات و افکار میرے گرد و پیش جمع ہو جاتے ہیں ——— میں ہمیشہ اپنے دستوں کے جمگھٹے میں رہتا ہوں"

وہ اپنے دن یوں بسر کر رہا تھا جیسے آم کھا رہا ہے۔ شام کو جب وہ بستر پر دراز ہوتا تھا۔ تو ایسا محسوس کرتا تھا۔ کہ اس نے دن کو چوسی گٹھلی کے مانند پھینک دیا ہے۔ اگر آپ اسکے کمرے کی ایک دیوار ہوتے تو کئی بار آپ کے ساتھ یہ لفظ ٹکراتے، جو کبھی کبھی سوتے وقت اس کی زبان سے نکلا کرتے تھے "آج کا دن کتنا کھٹا تھا

"اس برس کے ٹکڑے ہیں اگر یقایا دن بھی، اسی قسم کے ہوئے تو مزہ آجائے گا۔"

اور راتیں ———— ۔ ———— خواہ تاریک ہوں یا منور اس کی نظر میں داستانیں تھیں۔ جن کو ہر روز طلوع آفتاب کے ساتھ ہی بھول جاتا تھا۔

چار برس سے وہ اسی طرح زندگی بسر کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک اونچے چبوترے پر بیٹھا ہے، ہاتھ میں ہتھوڑا لیے زمانہ کا آہنی فیتہ اس کے سامنے سے گزر رہا ہے۔ اور وہ اس ہتھوڑے کی ضربوں سے اپنا چھٹہ لگائے جا رہا ہے۔ ایک دن جب گزرنے لگتا ہے۔ تو وہ فیتے کو تھوڑی دیر کے لئے تھام لیتا ہے اور پھر اُسے چھوڑ کر کہتا ہے "اب جاؤ ———— میں تمہیں استعمال کر چکا ہوں۔"

بعض لوگوں کو افسوس ہوا کرتا ہے کہ ہم نے فلاں کام فلاں وقت پر کیوں نہیں کیا۔ اور یہ پچھتاوا دیر تک محسوس کیا کرتے ہیں، مگر اُسے آج تک اس قسم کا افسوس یا رنج نہیں ہوا ———— جو وقت سوچنے میں ضائع ہوتا ہے، وہ اس سے بغیر سوچے سمجھے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا تھا ———— خواہ انجام کار اُسے نقصان ہی کیوں نہ پہنچے۔ اگر سوچ سمجھ کر چلنے ہی میں فائدہ ہوتا تو ان پیغمبروں اور نیکوکار ———— کی زندگی تکلیفوں اور ناکامیوں سے بھری ہوئی ہرگز

نہ ہوتی، جو حرام بڑے غور و فکر سے کیا کرتے تھے۔ اگر سوچ بچار کے بعد بھی نقصان ہو، یا ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے، تو کیا اس سے بہتر نہیں کہ غور و فکر میں پڑنے کے بغیر ہی نتائج کا سامنا کر لیا جائے۔"

اُسے چار برسوں میں قرار ہانا کا بیولی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ صرف منہ ہی نہیں بلکہ اُن کو سر سے پیر تک دیکھنا پڑا تھا۔ مگر وہ اپنے اصُول پر اسی طرح قائم تھا، جس طرح تند لہروں میں ٹھوس۔ چٹان کھڑی رہتی ہے۔

"آج رات بارہ بجے کے بعد نیا سال اُس کے سامنے میں آرہا تھا۔ اور یہ اُنے سال کو ہضم کر گیا تھا بغیر ڈکار لئے۔"

نئے سال کی آمد پر وہ خوش تھا۔ جس طرح اکھاڑے میں کوئی نامور پہلوان اپنے نئے مدِ مقابل کی طرف خم ٹھونک کر بڑھتا ہے۔ اُسی طرح وہ نئے سال کے مقابلے میں اپنے ہتھیاروں سے لیس ہو کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اب وہ بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔ "میں تم جیسے پہلوانوں کو بچھاڑ چکا ہوں۔ اب تمہیں بھی چاروں شانے چت گرا دوں گا۔"

جی بھر کر خوشی منانے کے بعد وہ نئے کیلنڈروں کی طرف بڑھا جو میلی دیوار پر اوپر کی طرف سمٹے رہے تھے۔ تاریخ نما کے اُس نے اوپر کا کاغذ ایک جھٹکے سے علیحدہ کر دیا، اور کہا۔ ذرا انقلاب ہٹاؤ تو

—— دیکھو تمہاری شکل کیسی ہے —— س

ہوں تمہارا آقا ——— تمہارا ملک ——— تمہارا سب
کچھ! یکم جنوری۔!"

"کل رات تم فنا کر دیئے جاؤ گے!"

چوہیدان

شوکت کو چوہے پکڑنے میں بہت مہارت حاصل ہے۔ وہ مجھ سے کہا کرتا ہے کہ یہ ایک فن ہے جس کو باقاعدہ سیکھنا پڑتا ہے۔ اور سچ پوچھئے تو جو ترکیبیں شوکت کو چوہے پکڑنے کے لئے یاد ہیں، اُن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کافی محنت کی ہے۔ اور اگر چوہے پکڑنے کا کوئی فن نہیں ہے، تو اس نے اپنی ذہانت سے اُسے فن بنایا ہے۔ اس کو آپ کوئی چوہا دکھا دیجیے وہ فوراً آپ کو بتائے گا کہ اس ترکیب سے وہ اتنے گھنٹوں میں پکڑا جائے گا۔ اور اس طریقے سے اگر آپ اُسے پکڑنے کی کوشش کریں تو اتنے دن لگ جائیں گے۔

چوہوں کی نسلوں اور اُن کی مختلف عادات واطوار کا شوکت بہت گہرا مطالعہ کر چکا ہے، اس کو اچھی طرح معلوم ہے کہ کس ذات کے چوہے جلدی پھنس جاتے ہیں۔ اور کس نسل کے چوہے بڑی مشکل کے بعد قابو میں

آتے ہیں۔ اور پھر ہر قسم کے چوہوں کو پھانسنے کی ایک سو ایک ترکیب شوکت کو معلوم ہے۔

موٹے موٹے اصول اس نے ایک روز مجھے بتائے تھے کہ چھوٹی چھوٹی، چوہیاں اگر پکڑنی چاہو تو ہمیشہ بنا چوہے دان استعمال کرنا چاہیئے۔ چوہے دان کی ساخت کسی قسم کی بھی ہو۔ اس کی کوئی پرواہ نہیں، خیال اس بات کا رکھنا چاہیئے کہ چوہیدان ایسی جگہ پر نہ رکھا جائے۔ جہاں آپ نے چوہے یا چوہیاں دیکھی تھیں ٹرنکوں کے پیچھے، الماریوں کے نیچے جہاں کہیں بھی آپ نے چوہیاں نہ دیکھی ہوں، چوہے دان رکھ دیا جائے اور اس میں تلی ہوئی مچھلی کا چھوٹا سا ٹکڑا رکھ دیا جائے۔ ٹکڑا بڑا نہ ہو۔ اگر چوہے دان کھٹ سے بند ہونے والا ہے۔ تو اس میں خاص طور پر بڑا ٹکڑا نہیں لگانا چاہیئے کہ چوہیا اندر آ کر اس ٹکڑے کا کچھ حصہ کتر کر باہر چلی جائے گی۔ ٹکڑا چھوٹا ہو گا تو اسے اتارنے کی کوشش کرے گی۔ اور یوں جھٹ پٹ پنجرے میں قید ہو جائے گی۔ ایک چوہیا پکڑنے کے بعد چوہے دان کو گرم پانی سے دھو لینا چاہیئے۔ اگر گھر میں زیادہ چوہے چوہیاں ہوں اور ان سب کو پکڑنا ہو۔ تو ایک چوہے دان کام نہیں دے گا تین چار چوہے دان پاس رکھنے چاہئیں۔ جو بدل بدل کر کام میں لائے جائیں۔ چوہے کی ذات بڑی سیانی ہوتی ہے اگر ایک ہی چوہے دان گھر میں رکھا جائے گا۔ تو چوہے اس سے خوف کھانا شروع کر دیں گے۔ اور اس کے نزدیک تک نہیں آئیں گے۔"

——— بعض اوقات ان تمام باتوں کا خیال رکھنے پر بھی چوہے

چوہیاں تابو میں نہیں آتے۔ اس کی بہت سی وجہیں ہوتی ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ آپ سے پہلے مکان میں رہتا تھا اس نے اسی قسم کا چوہے دان استعمال کیا ہو جیسا کہ آپ کر رہے ہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اس نے چوہے کو پکڑ کر باہر گلی یا بازار میں چھوڑ دیا ہو۔ اور وہ چند دنوں کے بعد واپس گھر آگیا ہو۔ ایسے چوہے جو ایک بار چوہے دان میں پھنس کر پھر اپنی جگہ واپس آجائیں تو اس قدر ہوشیار ہو جاتے ہیں کہ بڑی مشکل سے تابو میں آتے ہیں۔ یہ چوہے دوسرے چوہوں کو خبردار کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آپ کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہوتی ہیں۔ اور چوہے بڑے اطمینان سے ادھر ادھر دوڑتے رہتے ہیں۔ اور آپ کا اور آپ کے چوہے دان کا منہ چڑاتے رہتے ہیں ——————— چوہے کے بل کے پاس چوہے دان ہرگز نہیں رکھنا چاہیے۔ اس لئے کہ اتنی بڑی چیز اپنے گھر کے پاس دیکھ کر جو پہلے نہیں ہوتی تھی چوہا چوکنا ہو جاتا ہے۔ اور اس کو دال میں کالا کالا نظر آجاتا ہے۔ جب کسی حیلے سے چوہے نہ پکڑے جائیں تو گرد و پیش کی فضا کا مطالعہ مشاہدہ کر کے یہ معلوم کرنا چاہیے۔ کہ آس پاس کے لوگ کیسے ہیں۔ کس قسم کی چیزیں کھاتے ہیں۔ اور ان کے گھروں کے چوہے کس چیز پر جلد کہ تے ہیں۔ یہ تمام باتیں معلوم کر کے آپ کو تجربے کرنا پڑیں گے اور ایسی چیز یا ترکیب ڈھونڈنا پڑے گی جس کے ذریعے سے آپ اپنے گھر کے چوہے گرفتار کر سکیں۔

شوکت چوہے کے فن پر ایک طویل لیکچر دے سکتا ہے کتاب لکھ

سکتا ہے۔ مگر چونکہ طبعاً خاموش پسند ہے۔ اس لیئے اس کے متعلق زیادہ
بات چیت نہیں کرتا۔"

صرف مجھے معلوم ہے کہ وہ فن میں کافی مہارت رکھتا ہے، محلے کے
دوسرے آدمیوں کو اس کی مطلق خبر نہیں کہ، البتہ اس کے پڑوسی اس کے
یہاں سے کبھی کبھی چوہے دان عاریتاً ضرور منگایا کرتے ہیں، اور اس نے
اس غرض کے لیئے ایک پرانا چوہے دان مخصوص کر رکھا ہے۔

پچھلی برسات کی بات ہے۔ میں شوکت کے یہاں بیٹھا تھا کہ اس
کے پڑوسی خواجہ احمد صادق صاحب ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کا بڑا لڑکا،
ارشد صادق آیا۔ میں نے جب اُٹھ کر دروازہ کھولا تو اس نے کہنا شروع
کیا، ان کمبخت چوہوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اباجی سے جلد ہا
کہہ چکا ہوں کہ زہر منگوائیے ان کے مارنے کے لیئے مگر اُن کو اپنے کاموں
ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ اور یہاں ہر روز میری کتابوں کا ستیاناس ہو رہا
ہے ——— آج الماری کھولی تو ایک بڑا چوہا میرے سر پر آن گرا۔
——— نہیں کیا بتاؤں، ان چوہوں نے مجھے کتنا تنگ کیا ہے
کسی کتاب کی جلد سلامت نہیں۔ بعض بڑی کتابوں کی جلد تو اس صفائی
سے کم بختوں نے کتری ہے۔ کہ معلوم ہوتا ہے کسی نے آری سے
کاٹ دی ہے۔"

میں ارشد کو شوکت کے پاس لے گیا۔ اور کہا ارشد صاحب
تشریف لائے ہیں، چوہوں کی شکایات لے کر آئے ہیں!"

ارشد کرسی پہ بیٹھ گیا۔ اور پیشانی سے پسینہ پونچھ کر کہنے لگا۔ شوکت صاحب میں کیا عرض کروں۔ ابھی الماری کی تمام کتابیں باہر نکال کر آیا ہوں۔ ایک بھی تو ان میں ایسی نہیں رہی جس پر چوہوں نے اپنے دانت تیز نہ کئے ہوں۔ باورچی خانہ موجود ہے۔ دوسری الماریاں ہیں جن میں کھانے پینے کی چیزیں پڑی رہتی ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ میری کتابیں کترنے میں ان کو کیا مزہ آتا ہے۔ یعنی کاغذ اور وقتی بھلا کوئی کاغذ ہے۔ اجی صاحب کترے ہوئے گتے اور دھنکے ہوئے کاغذوں کا انبار میں نے الماری میں سے نکالا ہے۔"

شوکت مسکرایا "ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے گھر میں چوہے ہر روز سینڈ لگاتے پھریں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔؟"

ارشد نے اس مذاق سے لطف نہ اٹھایا۔ اس لئے کہ وہ واقعی بہت پریشان تھا شوکت صاحب، وہ معمولی چوہے تھوڑے ہی ہیں، موٹے موٹے سنڈے ہیں۔ جو کھلے بندوں پھرتے ہیں، میرے سر پہ ایک آن پڑا، خدا کی قسم ابھی تک درد ہو رہا ہے۔

شوکت اور میں دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے، ارشد بھی مسکرا دیا۔ "آپ تو دل لگی کر رہے ہیں۔ اور یہاں غصہ کے مارے برا حال ہے۔"

شوکت نے اٹھ کر ارشد کو سگریٹ پیش کیا، اپنے دل کا غبار اس کے دھوئیں کے ساتھ باہر نکالئے اور مجھے بتائیے کہ میں آپ کی

کیا خدمت کر سکتا ہوں ۔"

ارشد نے سگریٹ سلگایا اور کہا "میں آپ سے چوہے دان مانگنے آیا تھا۔ امی جان نے مجھ سے کہا تھا کہ شوکت کے گھر میں میں نے دو تین چوہے دان پڑے دیکھے ہیں ۔"

شوکت صاحب نے فوراً نوکر کو آواز دی اور اس سے کہا: "وہ چوہے دان جو تم نے گرم پانی سے دھو کر خوب صاف کیا تھا۔ ارشد صاحب کے گھر دے آؤ اور دیکھو ان کے نوکر سے کہنا کہ اس الماری کے نیچے کونے میں رکھے جہاں ارشد صاحب اپنی کتابیں رکھتے ہیں ——— اس الماری سے دور نہیں بھئی۔ اس میں مچھلی یا تیل میں تلی ہوئی کسی چیز کا ٹکڑا لگا کر رکھ دیا جائے ۔" پھر ارشد صاحب سے مخاطب ہو کر کہا "آپ بھی اچھی طرح سے سن لیجئے گا، بازار سے اگر پکوڑے مل جائیں تو ایک پکوڑا کافی رہے گا ۔ اور جب چوہا پکڑا جائے تو خدا کے لئے اسے میرے گھر کے پاس نہ چھوڑ دیجئے گا ۔ اور بہت جگہیں آپ کو مل جائیں گی۔ جہاں سے وہ پھر واپس نہ آ سکے ۔

دیر تک ارشد ہمارے پاس بیٹھا رہا، شوکت اس کو مزید ہدایات دیتا رہا جب نوکر چوہے دان ان کے گھر پہنچا کر واپس آ گیا تو اس نے اجازت چاہی اور چلا گیا ۔

اس واقعہ کے چار روز بعد ارشد میرے گھر آیا۔ میں اور وہ چونکہ اکٹھے کالج میں پڑھتے رہے ہیں ۔ اس کے لیے وہ میرے بے تکلف دوست

ہیں۔ شوکت سے اس کا تعارف میں نے ہی کرایا تھا، آتے ہی اس نے اِدھر اُدھر دیکھا، جیسے مجھ سے کوئی راز کی بات تخلیہ میں کرنا چاہتا ہے؛

میں نے پوچھا" کیا بات ہے۔ تم اتنے پریشان کیوں ہو۔"

"میں تمہیں ایک بڑی دلچسپ بات سنانے آیا ہوں، مگر یہاں نہیں سناؤں گا۔ تم باہر چلو۔ یہ کہہ کر اس نے مجھے بازو سے پکڑا، اور باہر لے گیا راستے میں اس نے مجھے اپنی داستان سنانا شروع کی عجیب و غریب کہانی ہے جو میں تمہیں سنانے والا ہوں، بخدا ایسی بات ہوئی ہے کہ میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ یعنی کسے یقین تھا کہ اتنی ضدی اور نفاست پسند لڑکی ایک چوہے دان کے ذریعے سے میرے قابو میں آجائے گی۔ اسی چوہے دان کے ذریعے سے جو اس روز تمہارے سامنے میں نے شوکت سے لیا تھا"

میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا "کونسی لڑکی اس چوہے دان میں پھنس گئی ——— لڑکی نہ ہوئی چوہیا ہو گئی ——— آخر بتاؤ تو سہی لڑکی کون ہے۔

اماں وہی سلیمہ۔ جس کی نفاست پسندیوں کی بڑی دھوم دھام ہے اور جس کی ضدی طبیعت کے بڑے چرچے ہیں ———

"میری حیرت اور زیادہ بڑھ گئی، سلیمہ ——— جھوٹ

"خدا کی قسم ——— جھوٹ بولنے والے پر لعنت ——— اور بھلا میں تم سے جھوٹ کیوں کہنے لگا۔ سلیمہ۔ شوکت کے دیئے ہوئے

چوہے دان کے ذریعے سے میرے قابو میں آگئی۔ اور بخدا یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ آسانی سے پھنس جائے گی۔"

میں نے پھر اس سے حیرت کے لہجہ میں کہا۔" لیکن یہ ہوا کیوں کر، تم مجھے یہ پوری داستان سناؤ تو کچھ پتہ چلے، چوہے دان والا سے بھی کبھی کسی نے لڑکیاں پھانسی ہیں، بڑی بے تکی سی بات معلوم ہوتی ہے مجھے۔

میں سلیمہ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ ہمارے ہاں اکثر اُن کا آنا جانا ہے وہ صرف نفاست پسند ہی نہیں، بلکہ بڑی ذہین لڑکی ہے۔ انگریزی زبان پر اُسے خوب عبور حاصل ہے، تین چار مرتبہ اس سے مجھے گفت گو کرنے کا اتفاق ہوا۔ تو میں نے معلوم کیا کہ ادب و شعر کے متعلق اُن کی معلومات کافی ہیں۔ مصوّر بھی ہے۔ پیانو بجانے میں بڑی مہارت رکھتی ہے، اس کی ضدی اور نفاست پسند طبیعت کے بارے میں بھی چونکہ مجھے بہت کچھ معلوم ہوا ہے اسی لیے مجھے ارشد کی بات سنکر سخت تعجب ہوا۔ وہ کسی کو خاطر ہی میں لانے والی نہیں، ارشد جیسے چغد کو اس نے کیسے پسند کر لیا۔ یہ معمہ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

ارشد بے ہوش تھا۔ اس نے میری طرف فتحمندانہ نظروں سے دیکھا اور کہا۔" میں تمہیں سارا واقعہ سنا دیتا ہوں" اس کے بعد کسی قسم کی وضاحت کی ضرورت نہ رہے گی۔ قصہ یہ ہے کہ پرسوں رات، کو امی جان اور ابا جی اور دوسرے سب لوگ سینما دیکھنے چلے گئے۔ میں گھر اکیلا

تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہ دوں، آرام کرسی پر ٹانگیں پھیلائے لیٹا یہی سوچ رہا تھا کہ ایک موٹا سا چوہا۔ مجھے نظر آیا۔ اس کو دیکھنا تھا۔ کہ مارے غصّہ کے میرا خون کھولنے لگا۔ فوراً اٹھا اور اس کو پکڑنے کی ترکیب سوچنے لگا۔ اسے ہاتھ سے پکڑنا تو ظاہر ہے کہ بالکل محال تھا۔ میں کسی طریقے سے اس کو مار بھی نہیں سکتا تھا۔ اس لئے کہ کمرے میں بے شمار فرنیچر اور ٹرنک وغیرہ پڑے تھے۔ میں نے شوکت کے دیئے ہوئے چوہے دان کا خیال کیا۔ جس سے آٹھ چوہے ہم لوگ پکڑ چکے تھے۔ مگر شوکت کی ہدایات کے مطابق اس کو گرم پانی سے دھونا ضروری تھا۔ مجھے کوئی کام تو تھا نہیں اور وقت بھی کافی تھا۔ چنانچہ میں نے خود ہی سماوار میں پانی گرم کیا۔ اور چوہے دان کو دھونا شروع کر دیا تھا۔ ابھی میں نے لوٹے سے گرم پانی کی دھار اس کے آہنی تاروں پر ڈالی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی، دروازہ کھولا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سلیمہ کھڑی ہے میں نے کہا "آیئے، آیئے" وہ اندر چلی آئی، اور کہنے لگی "کیا کر رہے ہیں آپ؟" میں نے جھینپ کر جواب دیا۔ جی چوہے دان دھو رہا ہوں۔" وہ بے اختیار ہنس پڑی "چوہے دان دھو رہے ہیں —— —— یہ صفائی آخر کس لئے ہو رہی ہے، کوئی بڑا چوہا انسپکشن کے لئے تو نہیں آیا" یہ سن کر میری جھینپ دور ہو گئی۔ اور میں نے قہقہہ لگا کر کہا "جی ہاں —— ایک بہت بڑا چوہا انسپکشن کے لئے آنا چاہتا ہے۔ یہ صفائی اسی سلسلے میں ہو

رہی ہے۔"

یہ کہہ کر ارشد خاموش ہوگیا۔ اس پر میں نے اس سے کہا۔"سناتے جاؤ، رکو نہیں —— تمہاری داستان بہت دلچسپ ہے۔

—— ہاں تو پھر سلیمہ نے کیا کہا۔"

—— کچھ نہیں —— میری بات سن کر وہ صحن ہی میں چوکی پر بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔"آپ صفائی کیجئے —— اس صفائی کی انسپکشن میں کر دوں گی —— ہاں یہ تو بتائیے، آج یہ سب لوگ کہاں گئے ہیں۔"

میں نے جواب دیا۔" سینما گئے ہیں۔ میں بیکار بیٹھا تھا کہ ایک چوہا اپنے کمرے میں مجھے نظر آیا۔ کیا عرض کر دوں۔ ہمارے گھر میں بڑے موٹے موٹے مسنڈے چوہے سینڈھ مارتے پھرتے ہیں۔ میری کتابوں کا تو انہوں نے ستیاناس کر دیا ہے۔ اب ان کے ظلم و ستم سے میرے اندر ایک انتقامی جذبہ پیدا ہوگیا ہے۔ یہ چوہے دان لے آیا ہوں۔ اس سے ہر روز دو تین چوہے پکڑتا ہوں۔ اور ان کو کالے پانی بھیجتا ہوں۔" سلیمہ نے میری گفتگو میں دلچسپی ظاہر کی۔"خوب خوب۔" لیکن یہ تو بتائیے کہ کالا پانی یہاں سے کتنا دور ہے۔" میں نے کہا۔" بہت دور نہیں کوتوالی کے پاس جو گندہ نالا بہتا ہے، اسی کو فی الحال میں نے کالا پانی بنا لیا ہے چوہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ کیونکہ اس موری کا پانی کالا ہے۔" ہم دونوں خوب ہنسے۔ پھر میں نے لوٹا اٹھایا، اور چوہے دان کو برش کے پاس دھونا شروع کیا۔ حسب چھینٹے اڑے میں نے سلیمہ سے کہا۔" آپ یہاں سے

اُٹھ جایئے، چھینٹے اُڑ رہے ہیں ویسے بھی میری بڑی بدتمیزی ہے کہ میں آپ کے سامنے ایک ایسی غلیظ چیز صاف کرنے بیٹھ گیا ہوں" اس نے فوراً ہی کہا، آپ تکلف نہ کیجئے اور اپنا کام کرتے چلے جایئے۔ چھینٹوں کے متعلق بھی آپ کوئی فکر نہ کریں" جب میں نے چوہیدان اچھی طرح دھو کر صاف کر لیا تو سلیمہ نے پوچھا "اچھا اب، آپ یہ بتایئے کہ اس کو دھونے کی کیا ضرورت تھی۔ بغیر دھوئے کیا آپ اس ظالم چوہے کو نہیں پکڑ سکتے" میں نے کہا "جی نہیں اس سے پہلے چونکہ اس چوہے دان میں ہم ایک چوہا پکڑ چکے ہیں، اور اس کی بو ابھی تک اس میں باقی ہے اس لئے دھونا ضروری ہے گرم پانی سے پہلے چوہے کی بو غائب ہو جائے گی۔ اس لئے آسانی کے ساتھ دوسرا چوہا پھنس جائے گا۔ میری یہ بات سنکر سلیمہ نے بالکل بچوں کی طرح کہا، اگر چوہے دان میں چوہے کی بو رہ جائے گی، تو دوسرا چوہا نہیں آئے گا" میں نے اسکول ماسٹروں کا انداز اختیار کر لیا، بالکل نہیں، اس لئے کہ چوہوں کی ناک بڑی تیز ہوتی ہے، آپ نے سنا نہیں۔ عام طور پر یہ کہا کرتے ہیں کہ فلاں آدمی کو چوہے کی ناک ہے یعنی اس کی قوت شامہ بڑی تیز ہے سمجھیں آپ، سلیمہ نے میری طرف جب دیکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے ایک بہت بڑی بات اس سے کہہ دی ہے جسکو سنکر وہ بہت مرعوب ہو گئی ہے۔ اس کی نگاہوں میں مجھے اپنے متعلق قدر و منزلت کی جھلک نظر آئی۔ اس سے مجھے شہ مل گئی، چنانچہ وہ تمام باتیں جو میں

نے شوکت سے اس روز سنی تھیں، ایک لکچر کی صورت میں دہرانا شروع کر دیں اور وہ"

میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا: "یہ سب مجھے افسانہ معلوم ہوتا ہے تم جھوٹ کہتے ہو۔"

"تم بھی عجیب قسم کے منکر ہو۔" ارشد نے بگڑ کر کہا: "بھئی خدا کی قسم۔ اس کا ایک ایک لفظ سچ ہے، مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔" تمہیں حیرت تو ضرور ہوگی اس لئے کہ میں خود متحیر ہوں، سلیمہ جیسی پڑھی لکھی اور ذہین لڑکی ایسی فضول باتوں سے متاثر ہو گئی، یہ بات مجھے ہمیشہ متحیر رکھے گی۔ مگر بھئی حقیقت سے تو انکار نہیں ہو سکتا۔ اس نے میری اوٹ پٹانگ باتیں بڑے غور سے سنیں۔ جیسے میں اس سے دنیا کا رازِ نہفتہ بتا رہا ہوں ——— واللہ یہ ذہین لڑکیاں بھی پرلے درجے کی سادہ لوح ہوتی ہیں ——— سادہ لوح نہیں کہنا چاہیئے، خدا معلوم کیا ہوتی ہیں۔ تم ان سے کوئی بات کہو تو بگڑ جائیں گی۔ یہ سمجھیں گی کہ ہم نے ان کی عقل و دانش پر حملہ کر دیا ہے۔ اور جب ان سے کوئی معمولی سی بات کہو جس سے ذہانت کے دور کا تعلق بھی نہ ہو تو وہ یہ سمجھیں گی کہ ان کی معلومات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ تم کسی فلسفہ دان اور بال کی کھال اتارنے والی عورت سے کہو کہ خدا ایک ہے تو وہ نکتہ چینی شروع کر دے گی۔ اگر اس سے کہو کہ دیکھو میں نے ماچس کی ڈبیہ سے ایک تیلی نکالی ہے۔ یہ ہوئی ایک تیلی، اب میں دوسری نکالتا ہوں

پر ان تیلیوں کو پاس رکھ کر جب تم اس سے یہ کہو گے۔ دیکھو اب یہ دو تیلیاں ہو گئی ہیں۔ تو وہ اس قدر خوش ہو گی کہ اٹھ کر تمہیں چومنا شروع کر دے گی۔"

یہ کہہ کر ارشد خوب ہنسا۔ مجھے بھی ہنسنا پڑا۔ اس لئے کہ بات ہی ہنسی پیدا کرنے والی تھی۔ جب ہم دونوں کی ہنسی کم ہوئی۔ میں نے اُس سے کہا "اب تم اپنی بقایا کہانی سناؤ، اور ہنسی مذاق چھوڑ دو۔

"ہنسی مذاق کیسے چھوڑ سکتا ہوں بھائی" ارشد نے بڑی سنجیدگی سے کہا "میں تو اُس سے مذاق ہی سے باتیں کر رہا تھا، مگر وہ بڑی سنجیدگی سے سن رہی تھی، ہاں تو جب میں نے اُسے چوہے پکڑنے کے اصول، بتا دیئے تو اور زیادہ بچہ بن کر اُس نے مجھ سے کہا "ارشد صاحب، آپ تو فوراً چوہے پکڑ لینے ہوں گے؟" میں نے بڑے فخر کے ساتھ جواب دیا "جی ہاں! کیوں نہیں"، اس پر سلیمہ نے بڑے اشتیاق کے ساتھ کہا "کیا آپ اس چوہے کو جو آپ نے ابھی ابھی دیکھا تھا، میرے سامنے پکڑ سکتے ہیں! ظاہر ہے کہ سلیمہ کا یہ سوال بہت ہی مشکل تھا۔ مگر میں نے فوراً ہی جواب دیا "اجی یہ بھی کوئی مشکل بات ہے۔ یوں چٹکیوں میں اُسے گرفتار کیا جا سکتا ہے" سلیمہ اٹھ کھڑی ہوئی "تو چلئے میرے سامنے اُسے گرفتار کیجئے، میں سمجھتی ہوں کہ آپ کبھی اس چوہے کو پکڑ نہیں سکیں گے" میں یہ سنکر یوں ہی مسکرا دیا "آپ غلط سمجھتی ہیں، پندرہ یا بیس منٹ میں، وہ چوہا اس چوہے دان میں ہوگا۔ اور آپ کی نظروں

کے سامنے بشرطیکہ آپ اتنے عرصے تک انتظار کر سکیں۔ سلیمہ نے کہا۔ میں ایک گھنٹے تک یہاں بیٹھنے کے لیے تیار ہوں۔ آپ سے پھر کہتی ہوں کہ آپ ناکام رہیں گی؛ ——————— وقت مقرر کر کے آپ چوہے کو کیسے پکڑ سکتے ہیں۔؟ میں اس وقت عجیب و غریب موڈ میں تھا اگر کوئی مجھ سے یہ کہتا کہ تم خدا دکھا سکتے ہو، تو میں فوراً یہ کہتا، ہاں دکھا سکتا ہوں۔" چنانچہ میں نے بڑے فخریہ لہجے میں سلیمہ سے کہا، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ———————

میں ابھی آپ کو وہ چوہا پکڑ کر دکھا دیتا ہوں۔ مگر شرط باندھیئے۔" اس نے کہا، میں ہر شرط باندھنے کے لیے تیار ہوں، اس لیے کہ ہار آپ کی ہو گی اس پر خدا معلوم مجھ میں کہاں سے جرأت آ گئی۔" جو میں نے اس سے کہا "تو یہ وعدہ کیجیے کہ اگر میں نے چوہا پکڑ لیا۔ تو آپ سے جو چیز میں طلب کروں گا۔ آپ بخوشی دے دیں گی۔ سلیمہ نے جواب دیا، "مجھے منظور ہے چنانچہ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چوہے دان میں صبح کی تلی ہوئی مچھلی کا ایک ٹکڑا لگا یا۔ اور اس کو اپنی کتابوں کی الماری سے دور صوفے پر رکھ دیا۔ شرط و ربط کا مجھے اس وقت کوئی خیال نہ تھا۔ لیکن میں دل میں یہ دعا ضرور مانگ رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی چوہا ضرور پھنس جائے تاکہ میری سرخروئی ہو نہ جانے کس جذبہ کے تحت میں نے گپ ہانک دی۔ بعد میں مجھے افسوس ہوا کہ خواہ شرمندہ ہونا پڑے گا۔ چنانچہ ایک بار میرے جی میں آئی کہ اس سے کہہ دوں، میں تو آپ سے یوں ہی مذاق کر رہا تھا۔ چوہا پندرہ منٹ میں کیسے پکڑا جا سکتا ہے۔"

گاندھی جی کا ستیہ گرہ ہی ہوتا تو اُسے جب چاہتے پکڑ لیتے۔ مگر یہ تو چوہا ہے۔ آپ خود ہی غور فرمائیں، مگر میں اُس سے یہ کہہ نہ سکا۔ اس لئے کہ اس میں میری شکست تھی۔"

یہ کہہ کر ارشد نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور مجھ سے پوچھا کیا خیال ہے تمہارا اس اس داستان کے متعلق؟"

میں نے کہا، بہت دلچسپ ہے، مگر اس کا دلچسپ ترین حصہ تو ابھی باقی ہے" "جلدی جلدی وہ سنا دو۔"

کیا پوچھتے ہو دوست ——— وہ پندرہ منٹ جو میں نے یاد میں گزارے ساری عمر مجھے یاد رہیں گے۔ اور سلیمہ کمرے کے باہر کرسیوں پر بیٹھی۔ وہ نہ معلوم کیا سوچ رہی تھی۔ مگر میری حالت تھی۔ سلیمہ نے میری جیب اپنی ران پر رکھی ہوئی تھی۔ میں بار بار اس وقت جھک کر دیکھ رہا تھا۔ دس منٹ گزر گئے۔ میرے پاس والے کمرے چوہے دان بند ہونے کی کھٹ نہ سنا دی۔ گیارہ منٹ گزر گئے۔ کوئی آواز نہ آئی، ساڑھے گیارہ منٹ ہو گئے۔ خاموشی طاری رہی، بارہ منٹ گزرنے پر بھی کچھ نہ ہوا، ساڑھے بارہ ہوئے کہ دفعتاً کھٹ کی آواز بلند ہوئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ چوہے دان، میرے سینے میں بند ہوا ہے کچھ لمحے کے لئے میرے دل کی دھڑکن بند سی ہو گئی، لیکن فوراً ہی ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے، دوڑ کر کمرے میں گئے۔ اور چوہے دان کے تاروں میں سے جب مجھے ایک موٹے چوہے کی تھوتھنی اور لمبی لمبی مونچھیں نظر آئیں تو میں خوشی سے اچھل پڑا، پاس ہی سلیمہ کھڑی

تھی، اس کی طرف میں نے فتحمندانہ نظروں سے دیکھا اور جھٹ پٹ اس کے حیرت سے کھلے ہوئے ہونٹوں کو چوم لیا۔ یہ سب کچھ اس قدر جلدی میں ہوا کہ سلیمہ چند لمحات تک بالکل خاموش رہی، لیکن اس کے بعد اُس نے خفگی آمیز لہجہ میں مجھ سے کہا: "یہ کیا بے ہودگی ہے؟" اس وقت خدا معلوم میں کس موڈ میں تھا کہ ایک بار میں نے پھر اُسی اندازِ دلبری میں اس کا بوسہ لے لیا۔ اور کہا: "اجی مولینا آپ سے شرط ہار رہی ہے" اور ——————

تیسری اس نے اپنے ہونٹ بوسے خود پیش کر دیئے، جس طرح چوہا ہاتھ میں آیا، اسی طرح سلیمہ بھی ہاتھ میں آ گئی۔ مگر بھئی میں شوکت کا بہت ممنون ہوں، اگر میں نے چوہے دان کو گرم پانی سے نہ دھویا ہوتا تو چوہا کبھی نہ پھنستا۔"

چوری

سکول کے تین چار لڑکے الاؤ کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھ گئے اور اس بوڑھے آدمی سے جو ٹاٹ پر بیٹھا تھا، اپنے استخوانی ہاتھ تاپنے کی خاطر بڑھائے ہوئے تھا، کہنے لگے "باباجی کوئی کہانی سنائیے"

مردِ معمّر نے جو غالباً کسی گہرے سوچ میں غرق تھا اپنا بھاری سر اُٹھایا جو گردن کی لاغری کی وجہ سے نیچے جھکا ہوا تھا۔ "کہانی، اب میں خود ایک کہانی ہوں مگر ——" اس کے بعد کے الفاظ اپنے پوپلے منہ ہی میں بڑبڑائے —— شاید وہ اس جملے کو لڑکوں کے سامنے ادا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ جن کی سمجھ اس قابل نہ تھی کہ فلسفیانہ نکات حل کر سکتے۔ لکڑی کے ٹکڑے ایک شور کے ساتھ جل جل کر آتشیں تبسّم کو پیدا کر رہے تھے۔ شعلوں کی رعنائی روشنی لڑکوں کے معصوم چہروں پر ایک عجیب انداز میں رقص کر رہی تھی، ننھی ننھی چنگاریاں

سفید راکھ کی نقاب الٹ الٹ کر حیرت میں سربلند شعلوں کا منہ تک رہی تھیں۔

بوڑھے آدمی نے الاؤ کی روشنی میں لڑکوں کی طرف نگاہیں اٹھا کر کہا۔ "کل ——— ہر روز کہانی! ——— کہانی سناؤں گا۔"

لڑکوں کے ٹمٹماتے ہوئے چہروں پر افسردگی چھا گئی۔ ناامیدی کے عالم میں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ گویا وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہے تھے "آج رات کہانی سنے بغیر سونا ہوگا۔ یکایک ان میں سے ایک لڑکا جو دوسروں کی بہ نسبت بہت زیادہ ہوشیار تھا اور ذہین معلوم ہوتا تھا اگر الاؤ کے قریب سرک کر بلند آواز میں بولا "مگر کل آپ نے وعدہ کیا تھا کہ اور وعدہ خلافی کرنا درست نہیں ———" کیا آپ کو کل والے حامد کا انجام معلوم نہیں جو ہمیشہ اپنا کہا بھول جایا کرتا تھا۔"

"دوست! ——— میں بھول گیا تھا" بوڑھے آدمی نے یہ کہہ کر اپنا سر جھکا لیا۔ جیسے وہ اپنی بھول پر نادم ہے تھوڑی دیر بعد وہ اس دلیر لڑکے کی جرأت کا خیال کر کے مسکرایا "میرے بچے مجھ سے غلطی ہوگئی۔ مجھے معاف کردو اگر میں کونسی کہانی سناؤں؟ پھر وہ مجھے یاد کر لینے دو۔ یہ کہتے ہوئے سر جھکا کر گہری سوچ میں غرق ہوگیا۔

اسے جن اور پریوں کی لامعنی داستانوں سے سخت نفرت تھی۔ وہ

بچوں کی ایسی کہانیاں سُنایا کرتا تھا جو اُن کے دل و دماغ کی اصلاح کر سکیں۔ اُسے بہت سے فضول قصے یاد تھے۔ جو اس نے بچپن میں، سُنے تھے۔ یا کتابوں میں پڑھے تھے۔ مگر اس وقت وہ اپنے بربط پیری کے بوسیدہ تار۔ چھیڑ رہا تھا۔ کہ شائد اُن میں کوئی خوابیدہ راگ جاگ اُٹھے

لڑکے باباجی کو خاموش دیکھ کر آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے، غالباً اس لڑکے کی جسے کتاب چرانے پر بید کی سزا ملی تھی، باتوں باتوں میں اُن میں سے کسی نے بلند آواز میں کہا، "ماسٹر جی کے لڑکے نے بھی تو میری کتاب چرائی تھی، مگر اُسے سزا نہ ملی"

"کتاب چرائی تھی۔" ان چار لفظوں نے جو بلند آواز میں ادا کئے گئے تھے بوڑھے کی خفیہ یاد میں ایک واقعہ کو جگا دیا۔ اس نے سپید سر اُٹھایا اور اپنی آنکھوں کے سامنے بھولی بسری داستان کو انگڑائیاں لیتے پایا۔ ایک لمحہ کے لئے اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی، مگر وہیں غرق ہو گئی ——— اضطراب کی حالت میں اس نے نحیف جسم کو جنبش دے کر الاؤ کے قریب کہا، اس کے چہرے کے تغیر و تبدل صاف طور پر عیاں تھا کہ وہ کسی واقعے کو دوبارہ یاد کر کے بہت تکلیف محسوس کر رہا ہے

الاؤ کی روشنی بدستور لڑکوں کے چہروں پر ناچ رہی تھی، دفعتاً بوڑھے نے آخری ارادہ کرتے ہوئے کہا "بچو! آج میں اپنی کہانی سناؤں گا۔"

"لڑکے فوراً اپنی باتیں چھوڑ کر ہمہ تن گوش ہو گئے، الاؤ کی چٹختی ہوئی لکڑیاں ایک شور کے ساتھ اپنی اپنی جگہ پر ابھر کر خاموش ہو گئیں"

——— ایک لمحے کے لیے فضا پر مکمل سکوت طاری ہو گیا۔

"باباجی اپنی کہانی سنائیں گے؟" ایک لڑکے نے خوش ہو کر کہا۔ پھر سب لڑکے قریب، خاموشی سے بیٹھ گئے۔

"ہاں، اپنی کہانی" یہ کہہ کر بوڑھے آدمی نے اپنی جھکی ہوئی گھنی بھنووں میں سے کوٹھڑی کے باہر تاریکی میں دیکھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ لڑکوں سے پھر مخاطب ہوا۔ "میں آج تمہیں پہلی چوری کی داستان سناؤں گا"

لڑکے حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ انہیں اس بات کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ کہ باباجی کسی زمانہ میں چوری بھی کر رہے ہیں

——— باباجی جو ہر وقت انہیں برے کاموں سے بچنے کی نصیحت کیا کرتے ہیں

لڑکا جو ان سب میں دلیر تھا۔ اپنی حیرت نہ چھپا سکا" پر کیا آپ نے واقعی چوری کی؟"

"واقعی!"

"آپ اس وقت کس جماعت میں پڑھا کرتے تھے؟"

"نویں میں"

یہ سنکر لڑکے کی حیرت اور بھی بڑھ گئی۔ اسے اپنے بھائی کا

خیال آیا جو نویں جماعت میں تعلیم پا رہا تھا، وہ اس سے عمر میں دو گنا بڑا تھا، اس کی تعلیم اس سے کہیں زیادہ تھی، وہ انگریزی کی کئی کتابیں پڑھ چکا تھا۔ اور اُسے ہر وقت نصیحتیں کیا کرتا تھا۔ یہ کیوں کر ممکن تھا کہ اس عمر کا اور اچھا پڑھا لکھا لڑکا چوری کرے؟ اس کی عقل اس معمّہ کو حل نہ کر سکی۔

چنانچہ اس نے پھر سوال کیا "آپ نے چوری کیوں کی-؟"

اس مشکل سوال نے بڈھے کو تھوڑی دیر کے لئے گھبرا دیا۔

آخر وہ اس کا کیا جواب دے سکتا تھا۔ اس لئے کہ اس وقت اس کے دماغ میں یہی خیال آیا۔

اس نے دل میں یہی سوچا، مگر اس سے مطمئن نہ ہو کر یہ بہتر خیال کیا کہ تمام داستان من و عن بیان کر دے۔

"اس کا جواب میری کہانی ہے۔ جو میں اب تمہیں سنانے والا ہوں گا"

"سنائیے"

لڑکے اس بوڑھے آدمی کی چوری کا حال سننے کے لئے اپنی اپنی جگہ پر جم کر بیٹھ گئے۔ جوالا لڑکے سامنے اپنے سپید بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کر رہا تھا۔ اور جسے وہ ایک بہت بڑا آدمی خیال کرتے تھے،

بڈھا کچھ عرصہ تک اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا۔ پھر اس بھولے ہوئے واقعہ کے تمام منتشر ٹکڑے فراہم کر کے بولا۔

"ہر شخص خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، اپنی زندگی میں کوئی نہ کوئی ایسی حرکت

ضرور کرتا ہے۔ جس پر وہ تمام عمر نادم رہتا ہے، میری زندگی میں سب سے برا فعل ایک کتاب کی چوری ہے ———"

یہ کہہ کر وہ رک گیا، اس کی آنکھیں جو ہمیشہ چمکتی رہتی تھیں۔" دھندلی پڑ گئیں۔ اس کے چہرے کی تبدیلی سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اُس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے، زبردست ذہنی تکلیف کا سامنا کر رہا ہے۔ چند لمحات کے توقف کے بعد وہ پھر بولا۔"

سب سے مکروہ فعل کتاب کی چوری ہے، یہ میں نے ایک کتب فروش کی دکان سے چرائی۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے۔ جب میں نویں جماعت میں تعلیم پاتا تھا قدرتی طور پر جیسے کہ اب تمہیں کہانی سننے کا، شوق ہے۔ مجھے افسانے اور ناول پڑھنے کا تھا۔ دوستوں سے مانگ کر یا خود خرید کر میں ہر ہفتے ایک نہ ایک کتاب ضرور پڑھا کرتا تھا۔ وہ کتابیں عموماً عشق و محبت کے معنی داستانیں یا فضول جاسوسی قصے ہوا کرتے تھے۔ یہ کتابیں میں ہمیشہ چھپ چھپ کر پڑھا کرتا تھا والدین کو اس بات کا علم نہ تھا۔ اگر انہیں معلوم ہوتا تو وہ مجھے ایسا ہرگز ہرگز نہ کرنے دیتے، اس لئے کہ اس قسم کی کتابیں، اسکول کے لڑکوں کے لئے بہت نقصان دہ ہوتی ہیں۔ میں اُن کے ہلک نقصان سے غافل تھا چنانچہ مجھے اس کا نتیجہ بھگتنا پڑا۔ میں نے چوری کی اور پکڑا گیا۔"

ایک لڑکے نے حیرت زدہ ہو کر کہا " آپ پکڑے گئے ؟"

رہاں پکڑا گیا۔ چونکہ میرے والدین اس واقعہ سے بالکل بے خبر تھے۔ یہ عادات پکتے پکتے میری طبیعت بن گئی۔ گھر سے جتنے پیسے ملتے تھے انہیں جوڑ جوڑ کر بازار سے افسانوں کی کتابیں خریدنے میں صرف کر دیتا اسکول کی پڑھائی سے رفتہ رفتہ مجھے نفرت ہونے لگی۔ ہر وقت میرے دل میں یہی خیال سمایا رہتا کہ فلاں کتاب جو ناول نویس نے لکھی ہے، ضرور پڑھنی چاہیئے، یا فلاں کتاب فروش سے ناولوں کا جو ذخیرہ اس کے پاس موجود ہے ایک نظر ضرور دیکھنا چاہیئے شوق کی یہ انتہا دوسرے معنوں میں دیوانگی ہے۔ اس حالت میں انسان کو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کرنے والا ہے یا کر رہا ہے، اس وقت بے عقل بچے کی مانند ہوتا ہے جو اپنی طبیعت خوش کرنے یا شوق پورا کرنے کے لئے جلتی ہوئی آگ میں بھی ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ اسے یہ پتہ نہیں ہوتا کہ یہ چمکنے والی شے جسے وہ پکڑ رہا ہے اس کا ہاتھ جلا دے گی۔ ٹھیک یہی حالت میری تھی، فرق اتنا ہے کہ بچہ شعور سے محروم ہوتا ہے۔ اس لیئے وہ بغیر سمجھے بوجھے بری سے بری حرکت کر بیٹھتا ہے۔ مگر میں نے عقل کا مالک ہوتے ہوئے چوری ایسے مکروہ جرم کا ارتکاب کیا —— یہ آنکھوں کی موجودگی میں میرے اندھے ہونے کی دلیل ہے، میں ہرگز ایسا کام نہ کرتا، اگر میری عادت مجھے مجبور نہ کرتی۔

ہر انسان کے دماغ میں شیطان موجود ہوتا ہے، جو وقتاً فوقتاً اسے برے کاموں پر مجبور کرتا ہے، یہ شیطان مجھ پر اس وقت غالب آیا۔

جبکہ سوچنے کے لئے میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ خیر“
لڑکے خاموشی سے بوڑھے کے ہلتے ہوئے لبوں کی طرف، نگاہیں گاڑے اُس کی داستان سُن رہے تھے، داستان کا تسلسل اس وقت ٹوٹتا دیکھ کر جب کہ اصل مقصد بیان کئے جانے والا تھا بڑی بیقراری سے بقایا تفصیل کا انتظار کرنے لگے۔

”مسعود بیٹا! یہ سامنے والا دروازہ تو بند کر دینا ———— سرد ہوا آرہی ہے“ بوڑھے نے اپنا کمبل گھٹنوں پر ڈال کیا۔

مسعود ”اچھا باباجی“ یہ کہہ کر اُٹھا اور کوٹھڑی کا دروازہ بند کرنے کے بعد اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

ہاں تو ایک دن جب کہ والد گھر سے باہر تھے۔ بوڑھے نے اپنی داستان کا بقایا حصہ شروع کیا“ مجھے بھی کوئی خاص کام نہ تھا۔ اور وہ کتاب جو میں ان دنوں پڑھ رہا تھا۔ ختم ہونے کے قریب تھی۔ اس لئے میرے جی میں آئی کہ چلو اس کتب فروش کے پاس ہو آئیں۔ جن کے پاس بہت سی جاسوسی ناولیں پڑی تھیں۔“

میری جیب میں اس وقت اتنے پیسے موجود تھے۔ جو ایک معمولی ناول کے دام ادا کرنے کے لئے کافی ہوں، چنانچہ میں گھر سے سیدھا اس کتب فروش کی دوکان پر گیا۔ یوں تو اس دکان پر ہر وقت بہت اچھی اچھی ناولیں موجود رہتی تھیں۔ مگر اس وقت خاص طور پر بالکل نئی کتابوں کا ایک ڈھیر باہر تختے پر رکھا تھا۔ ان کتابوں کے رنگ برنگے سرورق دیکھ کر میری

طبیعت میں ایک ہیجان سا برپا ہو گیا۔ دل میں اس خواہش نے گدگدی کی کہ وہ تمام میری ہو جائیں۔

میں دوکاندار سے اجازت لے کر اُن کتابوں کو ایک نظر دیکھنے میں مشغول ہو گیا۔ ہر کتاب کے شوخ سرِ ورق پر اس قسم کی کوئی نہ کوئی عبارت لکھی ہوئی تھی۔

"ناممکن ہے کہ ان کا مطالعہ آپ پر سنسنی نہ طاری کر دے۔"

"مصوّرِ اسرار کا لاثانی شاہکار"

"تمثیل: ہیجان!!! رومان!!! ——— سب یکجا۔"

اس قسم کی عبارتیں شوق بڑھانے کے لئے کافی تھیں، مگر میں نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ اس لئے کہ میری نظروں سے ایسے الفاظ گذر چکے تھے۔ میں تھوڑا عرصہ کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ اس وقت میرے دل میں چوری کرنے کا مطلقاً خیال نہ تھا بلکہ میں نے خریدنے کے لئے ایک کم قیمت کی ناول چن کر الگ بھی رکھ لی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد دل میں یہ ارادہ کر کے۔ میں دوسرے ہفتے ان ناولوں کو دوبارہ دیکھنے آؤں گا ——— میں نے اپنی چنی ہوئی کتاب اٹھائی۔

کتاب کا اٹھانا تھا کہ میری نگاہیں ایک مجلد ناول پر گڑ گئیں۔ سرِ ورق میرے محبوب ناولسٹ کا نام سرخ لفظوں میں چھپا تھا اُس کے ذرا اوپر کتاب کا نام تھا۔

"منتقم شعاعیں ——— کس طرح ایک دیوانے ڈاکٹر نے لندن

کو تباہ کرنے کا ارادہ کیا"

یہ سطور پڑھتے ہی میرے اشتیاق میں طغیانی سی آ گئی۔ کتاب کا مصنف وہی تھا جس نے اس سے پیشتر میری راتوں کی نیند حرام کر رکھی تھی۔ ناول کو دیکھتے ہی میرے دماغ میں خیالات کا ایک گروہ داخل ہو گیا۔

"منتقم شعاعیں ——— دیوانے نے ڈاکٹر کی ایجاد ——— کیا دلچسپ افسانہ ہو گا۔ ؟"

"لندن تباہ کرنے کا ارادہ ——— یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ ؟"

"اس مصنف نے فلاں فلاں کتابیں کتنی سنسنی خیز لکھی ہیں :۔

"یہ کتاب ضرور ان سب سے بہتر ہو گی !"

میں خاموش اشتیاق کے ساتھ اس کتاب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور یہ خیالات یکے بعد دیگرے میرے کانوں میں شور برپا کر رہے تھے۔ میں نے اس کتاب کو اٹھایا اور کھول کر دیکھا تو پہلے ورق پر یہ عبارت نظر آئی "مصنف اس کتاب کو اپنی بہترین تصنیف دیتا ہے"

"ان الفاظ نے میرے اشتیاق میں آگ پر ایندھن کا کام کیا ——— اور ایکا ایکی میرے دماغ کے خدا کو کسی گوشے سے ایک خیال کود پڑا ——— وہ یہ کہ میں اس کتاب کو اپنے کوٹ میں چھپا کر لے جاؤں میری آنکھیں بے اختیار کتب فروش کی جانب مڑیں جو کاغذ پر

کچھ لکھنے میں مشغول تھا۔ دوکان کی دوسری طرف، دو نوجوان کھڑے میری طرح کتابیں دیکھ رہے تھے ——— میں سر سے پیر تک لرز گیا۔

یہ کہتے ہوئے بوڑھے کا نحیف جسم اس واقعہ کی یاد سے کانپا ——— تھوڑی دیر تک خاموش رہ کر اُس نے پھر اپنی داستان شروع کر دی۔ ایک لمحہ کے لئے میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ چوری کرنا بہت بُرا کام ہے۔ مگر ضمیر کی آواز سرد ترق بہ بنی لائبی شعاعوں میں غرق ہو گئی۔ میرا دماغ "منتقم شعاعیں، منتقم شعاعیں" گردان کر رہا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر جھانکا اور جھپٹ سے وہ کتاب کوٹ کے اندر بغل میں دبالی۔ مگر میں کانپنے لگا۔

اس حالت پر قابو پا کر میں کتب فروش کے قریب گیا۔ اور اس کتاب کے دام ادا کئے۔ جو میں نے پہلے خریدی تھی۔ قیمت لیتے وقت اور روپے میں سے باقی پیسے واپس کرنے میں اس نے غیر معمولی تاخیر سے کام لیا۔ میری طرف اس نے گھور کر بھی دیکھا جس سے میری طبیعت سخت پریشان ہو گئی۔ جی میں آئی کہ سب کچھ چھوڑ کر وہاں سے بھاگ نکلوں ———

میں نے اس دوران میں کئی بار اس جگہ پر جو کتاب کی وجہ سے اُبھری ہوئی تھی نگاہ ڈالی ——— اور شائد اُسے چھپانے کی بے سود کوشش بھی کی۔ میری ان عجیب و غریب حرکتوں کو دیکھ کر اُسے شک ضرور ہوا۔ اس لئے کہ وہ بار بار کچھ کہنے کی کوشش کر کے پھر خاموش ہو جاتا۔"

میں نے باقی پیسے جلدی سے لئے اور وہاں سے چل دیا۔ دو سو قدم کے فاصلے پر میں نے کسی کی آواز سُنی، مڑ کر دیکھا تو کتب فروش ننگے پاؤں چلا آ رہا تھا اور مجھے ٹھہرنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ میں نے اندھا دھند بھاگنا شروع کر دیا۔

مجھے معلوم نہ تھا کہ میں کدھر بھاگ رہا ہوں۔ میرا رُخ اپنے گھر کی جانب نہ تھا۔ شروع ہی اُس طرف بھاگ رہا تھا۔ جدھر بازار کا اختتام تھا۔ اس غلطی کا مجھے اُس وقت احساس ہوا، جب دو تین آدمیوں نے مجھے پکڑ لیا۔"

بوڑھا اتنا کہہ کر اضطراب کی حالت میں اپنی خشک زبان لبوں پر پھیرنے لگا۔ کچھ توقف کے بعد وہ ایک لڑکے سے مخاطب ہوا۔

"مسعود! پانی کا ایک گھونٹ پلانا۔"

مسعود خاموشی سے اُٹھا۔ اور کوٹھڑی کے ایک کونے میں پڑے ہوئے گھڑے سے گلاس میں پانی انڈیل کر لے آیا۔ بوڑھے گلاس لیتے ہی منہ سے لگا لیا۔ اور ایک گھونٹ میں سارا پانی پی گیا۔ اور خالی گلاس زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں میں کیا بیان کر رہا تھا۔"

لڑکے نے جواب دیا: "آپ بھاگ کر جا رہے تھے۔"

"میرے پیچھے کتب فروش "چور چور" کی آواز بلند کرتا چلا آ رہا تھا جب میں نے دو تین آدمیوں کو اپنا تعاقب کرتے دیکھا تو میرے ہوش ٹھکانے نہ رہے، جیل کی آہنی سلاخیں، پولیس اور عدالت کی تصویریں ایک

ایک کر کے میری آنکھوں کے سامنے آگئیں، بے عزتی کے خیال سے میری پیشانی عرق آلود ہو گئی میں لڑکھڑاتا ہوا گر پڑا، اٹھنا چاہا تو ٹانگوں نے جواب دے دیا۔ اس وقت میرے دماغ کی عجیب حالت تھی۔ ایک تند سا دھواں میرے سینے میں کروٹیں لے رہا تھا۔ آنکھیں فرط خوف سے اُبل رہی تھیں۔ اور کانوں میں زبردست شور برپا تھا۔ جیسے بہت سے لوگ آہنی چادریں ہتھوڑے سے کوٹ رہے ہیں۔ میں اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ کتب فروش اور اس کے ساتھیوں نے مجھے پکڑ لیا۔ اس وقت اس وقت میری کیا حالت تھی۔ اس کا بیان کرنا بہت دشوار ہے سینکڑوں خیالات پتھروں کی طرح میرے دماغ سے ٹکرا کر مختلف آوازیں پیدا کر رہے تھے۔ جب انہوں نے مجھے پکڑا تو ایسا معلوم ہوا کہ آہنی پنجہ نے میرے دل کو مسل ڈالا ہے۔ میں بالکل خاموش تھا۔ وہ مجھے دوکان کی طرف کشاں کشاں لے گئے۔

جیل خانے کی کوٹھڑی اور عدالت کا منہ دیکھنا یقینی تھا۔ اس خیال پر میرے ضمیر نے لعنت ملامت شروع کر دی۔ چونکہ اب جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ اور میرے پاس اپنے ضمیر کو جواب دینے کے لئے کوئی الفاظ موجود نہ تھے۔ اس لئے میری آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے اور میں نے بے اختیار رونا شروع کر دیا۔"

یہ کہتے ہوئے بوڑھے کی دھندلی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔"

کتب فروش نے مجھے پولیس کے حوالے کر دیا۔ اپنی کتاب لے

لی۔ اور نصیحت کرنے کے بعد چھوڑ دیا۔ بوڑھے نے اپنے آنسو کھردرے کمبل سے خشک کئے خدا اُس کو جزائے خیر دے، میں عدالت کے دروازے سے تو بچ گیا۔ مگر اس واقعہ کی خبر اسکول والوں کو خبر ہو گئی۔ والد مجھ پر بہت خفا ہوئے لیکن انھوں نے بھی آخر میں مجھے معاف کر دیا۔

دو تین روز مجھے اس ندامت کے باعث بخار آتا رہا۔ اس کے بعد جب میں نے دیکھا۔ میرا دل کسی کروٹ آرام نہیں لیتا۔ اور مجھ میں اتنی قوت نہیں کہ میں لوگوں کے سامنے اپنی نگاہیں اُٹھا سکوں۔ تو میں شہر چھوڑ کر وہاں سے ہمیشہ کے لئے روپوش ہو گیا۔ اس وقت سے لے کر میں نے اب تک مختلف شہروں کی خاک چھانی ہے۔ ہزاروں مصائب برداشت کئے ہیں۔ صرف اس کتاب کی چوری کی وجہ مجھے تا دم مرگ نادم و شرمسار رکھے گی۔

اس آوارہ گردی کے دوران میں میں نے اور بھی بہت سی چوریاں کیں، ڈاکے ڈالے اور ہمیشہ پکڑا گیا۔ مگر ان پر نادم نہیں ہوں۔ مجھے فخر حاصل ہے۔"

بوڑھے کی دھندلی آنکھوں میں پھر پہلی سی چمک نمودار ہو گئی۔ اور اس نے الاؤ کے شعلوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا شروع کر دیا۔ "ہاں مجھے فخر ہے۔" یہ لفظ اُس نے تھوڑے توقف کے بعد دوبارہ کہے،

الاؤ میں آگ کا شعلہ بلند ہوا۔ اور ایک لمحہ تھر تھرا کر وہیں سو گیا،

______ بوڑھے نے شعلے کی حرارت دیکھی اور مسکرا دیا۔ میرا دکوں کو

مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ کہانی ختم ہو گئی ہے' اب تم جاؤ' تمہارے ماں باپ انتظار کرتے ہوں گے۔

مسعود نے سوال کیا "مگر آپ کو اپنی دوسری چوریوں پر کیوں فخر ہے؟"

"فخر کیوں ہے؟" —— بوڑھا مسکرایا۔ اس لئے کہ وہ چوریاں ہنیں تھیں —— اپنی مسروقہ چیزوں کو دوبارہ حاصل کرنا چوری ہنیں ہوتی میرے عزیز! بڑے ہو کر تمہیں اچھی طرح معلوم ہو جائے گا۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"ہر وہ چیز جو تم سے چرالی گئی ہے تمہیں حق حاصل ہے کہ اسے ہر ممکن طریقے سے اپنے قبضہ میں لے آؤ۔ یاد رہے تمہاری کوشش کامیاب ہونی چاہیئے ورنہ ایسا کرتے ہوئے پکڑے جانا اور اذیتیں اٹھانا عبث ہے۔

لڑکے اٹھے اور بابا جی کو شب بخیر کہتے ہوئے کوٹھڑی کے دروازہ سے باہر چلے گئے۔ بوڑھے کی نگاہیں ان کو تاریکی میں گم ہوتے دیکھتی رہیں، تھوڑی دیر اسی طرح دیکھنے کے بعد اٹھا اور کوٹھڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔

کاش کہ یہ بڑے ہو کر اپنی کھوئی چیزیں واپس لے سکیں، بوڑھے کو خدا معلوم ان لڑکوں سے کیا امید تھی۔؟

اینفس

قاسم

باورچی خانہ کی مٹ میلی فضا میں بجلی کا اندھا سا بلب کمزور روشنی پھیلا رہا تھا۔ اسٹوپ پر پانی سے بھری ہوئی پتیلی دھری تھی۔ پانی کا کھلاؤ اور اسٹوپ کے حلق سے نکلتے ہوئے شعلے مل جل کر مسلسل شور برپا کر رہے تھے۔ انگیٹھیوں میں آگ کی آخری چنگاریاں آگ میں سو گئی تھیں۔ دور کونے میں قاسم گیارہ برس کا لڑکا برتن مانجنے میں مصروف تھا۔ ریلوے انسپکٹر صاحب کا نوکر تھا۔ برتن صاف کرتے وقت یہ لڑکا کچھ گنگنا رہا تھا۔ یہ ایسے الفاظ تھے جو اس کی زبان سے بغیر کسی کوشش کے نکل رہے تھے۔

"جی آیا صاحب! جی آیا صاحب! بس ابھی صاف ہو جاتے ہیں — صاحب!"

ابھی برتنوں کو راکھ سے صاف کرنے کے بعد انہیں پانی سے دھو کر قرینے سے رکھنا بھی اور یہ کام جلدی سے نہ ہو سکتا تھا۔ لڑکے کی آنکھیں

نیند سے بند ہو جا رہی تھیں ۔ سر سخت بھاری ہو رہا تھا ۔ مگر کام کئے بغیر آرام ——— یہ کیوں کر ممکن تھا ۔

اسٹوو بدستور ایک شور کے ساتھ نیلے شعلوں کو اپنے حلق سے اُگل رہا تھا ۔ کیتلی کا پانی اسی طرح انداز میں کھلکھلا ہنس رہا تھا ۔

دفعتاً لڑکے نے نیند کے ناقابلِ مغلوب حملے کو محسوس کر کے اپنے جسم کو ایک جنبش دی " اور جی آیا صاحب " گنگناتا پھر کام میں مشغول ہو گیا ۔

دیوار گیریوں پر چنے ہوئے برتن سوئے ہوئے تھے ۔ پانی کے نل سے پانی کی بوندیں نیچے سیلی سِل پر ٹپک رہی تھیں ۔ اور اداس آواز پیدا کر رہی تھیں ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فضا پر غنودگی سی طاری ہے ۔ دفعتاً آواز بلند ہوئی ۔

"قاسم قاسم !"

"جی آیا صاحب " لڑکا جو ابھی الفاظ کی گردان کر رہا تھا بھاگا بھاگا اپنے اپنے آقا کے پاس گیا ۔

انسپکٹر صاحب نے گرج کر کہا " بیوقوف کے بچے آج پھر یہاں صراحی اور گلاس رکھنا بھول گیا ہے "

" ابھی لایا صاحب ——— ابھی لایا صاحب "

کمرے میں صراحی اور گلاس رکھنے کے بعد وہ ابھی برتن صاف کرنے کے لئے بیٹھا ہی تھا کہ پھر اُسی کمرے میں سے آواز آئی

" قاسم ——— قاسم "

"جی آیا صاحب!" قاسم بھاگتا ہوا پھر اپنے آقا کے پاس گیا۔

"بمبئی کا پانی کس قدر خراب ہے جاؤ پارسی کے ہوٹل سے سوڈا لے کر آؤ۔ بھاگے جاؤ سخت پیاس لگ رہی ہے۔"

"بہت اچھا صاحب۔"

قاسم بھاگم بھاگ گیا اور پارسی کے ہوٹل سے جو گھر سے قریباً نصف میل کے فاصلے پر تھا۔ سوڈے کی بوتل لے آیا اور اپنے آقا کو گلاس میں ڈال دی۔

"اب تم جاؤ مگر اس وقت تک کیا کر رہے ہو۔ برتن صاف نہیں ہوئے کیا؟"

"ابھی صاف ہو جاتے ہیں صاحب!"

"برتن صاف کرنے کے بعد دونوں کالے شو پالش کر دینا مگر دیکھنا احتیاط رہے چمڑے پر کوئی خراش نہ آئے۔ ورنہ"

قاسم کو ورنہ کے بعد کا جملہ بخوبی معلوم تھا۔ "بہت اچھا صاحب" کہہ کر باورچی خانہ میں چلا گیا۔ اور برتن صاف کرنے شروع کر دیئے۔

اب نیند اس کی آنکھوں میں سمٹی چلی آ رہی تھی۔ پلکیں آپس میں ملی جا رہی تھیں، سر میں پگھلا ہوا سیسہ اتر رہا تھا یہ خیال کرتے ہوئے کہ صاحب کے بوٹ بھی ابھی پالش کرنے ہیں۔ قاسم نے اپنے سر کو بہت زور سے جنبش دی اور وہی راگ الاپنا شروع کر دیا۔

"جی آیا صاحب۔ جی آیا صاحب۔ بوٹ ابھی پالش ہو جاتے ہیں

صاحب"

مگر نیند کا طوفان ہزار بند باندھنے پر بھی نہ رکا۔ اب اُسے محسوس ہوا کہ نیند ضرور غلبہ پا کر رہے گی۔ پر ابھی برتنوں کو دھو کر انہیں اپنی جگہ رکھنا باقی تھا۔ جب اس نے یہ سوچا تو ایک عجیب و غریب خیال اس کے دماغ میں آیا۔ بھاڑ میں جائیں برتن اور چولہے میں جائے شنو ———— کیوں نہ تھوڑی دیر سو جاؤں اور پھر چند لمحہ آرام کرنے کے بعد۔"

اس خیال کو باغیانہ تصور کر کے قاسم نے ترک کر دیا۔ اور برتنوں پر جلدی جلدی راکھ ملنا شروع کر دی۔

تھوڑی دیر کے بعد جب نیند پھر غالب آئی تو اس کے جی میں آئی کہ اُبلتا ہوا پانی اپنے سر میں انڈیل لے اور اس طرح اس غیر مرئی طاقت سے جو اس کام میں خارج ہو رہی تھی۔ نجات پائے۔ مگر پانی اتنا گرم تھا کہ اس کے بھیجے تک کو پگھلا دیتا۔ چنانچہ منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار کر اس نے باقی ماندہ برتن صاف کئے۔ یہ کام کرنے کے بعد اس نے اطمینان کا سانس لیا اب وہ آرام سے سو سکتا تھا۔ اور نیند ———— وہ نیند جس کے لئے اس کی آنکھیں اور دماغ اس شدت سے انتظار کر رہے تھے اب بالکل نزدیک تھی۔

باورچی خانے کی روشنی گل کرنے کے بعد قاسم نے باہر برآمدے میں اپنا بستر بچھا لیا اور لیٹ گیا۔ اس سے پہلے کہ اُسے اپنے نرم نرم بازوں میں تھام لے۔ اس کے کان شنو شنو کی آواز سے گونج اُٹھے۔

"بہت اچھا صاحب، ابھی پالش کرتا ہوں" قاسم بڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔

ابھی قاسم شو کا ایک پیر بھی اچھی طرح پالش کرنے نہ پایا تھا کہ نیند کے غلبہ نے اُسے وہیں سلا دیا۔

سورج کی لال لال کرنیں مکان کے شیشوں میں نمود ہوئیں، مگر قاسم سویا رہا۔

جب انسپکٹر صاحب نے اپنے نوکر کو باہر برآمدے میں اپنے کالے جُوتوں کے پاس سویا دیکھا تو اُسے ٹھوکر مار مار کر جگاتے ہوئے کہا۔ یہ سور کی طرح بے ہوش پڑا ہے، اور میرا خیال تھا کہ اس نے شو صاف کر لئے ہوں گے ——— نمک حرام! ——— اے قاسم"

"جی آیا صاحب:"

قاسم فوراً اٹھ بیٹھا۔ ہاتھ میں جب اس نے پالش کرنے کا برش دیکھا اور رات کے اندھیرے کی بجائے دن کی روشنی دیکھی تو اس کی جان خطا ہو گئی۔

میں سو گیا تھا، مگر ——— مگر شو ابھی پالش ہو جاتے ہیں صاحب"

"یہ کہہ کر اس نے جلدی جلدی پالش کرنا شروع کر دیا"

پالش کرنے کے بعد اس نے اپنا بستر بند کر دیا۔ اور اسے اوپر کے کمرے میں رکھنے چلا گیا"

"قاسم!"

"جی آیا صاحب!"

قاسم بھاگا ہوا آیا اور اپنے آقا کے پاس آکر کھڑا ہو گیا

"دیکھو، آج ہمارے مہمان آئیں گے، اس لئے باورچی خانہ کے تمام برتن اچھی طرح صاف رکھنا، فرش دُھلا ہوا ہونا چاہیئے، اس کے علاوہ تمہیں ڈرائینگ روم کی تصویریں، میزیں اور کرسیاں بھی صاف کرنا ہوں گی۔ سمجھے! خیال رہے میری میز پر ایک تیز دھار والا چاقو پڑا ہے۔ اُسے مت چھیڑنا۔ میں اب دفتر جا رہا ہوں، مگر یہ کام دو گھنٹے کے پہلے پہلے ہو جائے"

"بہت بہتر صاحب"

انسپکٹر صاحب دفتر چلے گئے، قاسم باورچی خانہ صاف کرنے میں مشغول ہو گیا۔

ڈیڑھ گھنٹے کی اَن تھک محنت کے بعد اس نے باورچی خانے کا سارا کام ختم کر دیا۔ اور ہاتھ پاؤں صاف کرنے کے بعد جھاڑن لے کر ڈرائینگ روم میں چلا گیا

وہ ابھی کرسیوں کو جھاڑن سے صاف کر رہا تھا کہ اس کے تھکے ہوئے دماغ میں ایک تصویر سی کھچ گئی۔ کیا دیکھتا ہے کہ اس کے گرد برتن ہی برتن پڑے ہیں۔ اور پاس ہی راکھ کا ڈھیر لگ رہا ہے، ہوا زوروں پر چل رہی ہے جس سے وہ راکھ اڑ کر فضا کو خاکستری بنا رہی ہے۔ یکایک اس ظلمت میں ایک سرخ آفتاب نمودار ہوا جس کی کرنیں سرخ برچھیوں

کی طرح ہر برتن کے سینے میں گھس گئیں۔ زمین خون سے شرابور ہو گئی۔ قاسم دہشت زدہ ہو گیا۔ اور اس دہشت ناک تصور کو دماغ سے جھٹک کر "جی آیا صاحب، جی آیا صاحب!" کہتا پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے اس تصور میں ایک اور منظر رقص کرنے لگا، چھوٹے چھوٹے لڑکے آپس میں کھیل کھیل رہے تھے۔ دفعتہً آندھی چلنے لگی جس کے ساتھ ہی ایک بدنما اور بھیانک دیو نمودار ہوا۔ یہ دیو ان سب لڑکیوں کو نگل گیا۔ قاسم نے خیال کیا کہ وہ دیو اس کے آقا کے ہم شکل تھا۔ گو یا کہ قد و قامت کے لحاظ سے وہ اس سے کہیں بڑا تھا۔ اب اس دیو نے زور زور سے ڈکارنا شروع کیا۔ قاسم سر سے پیر تک لرز گیا۔

ابھی تمام کمرہ صاف کرنا تھا۔ اور وقت بہت کم رہ گیا تھا چنانچہ قاسم نے جلدی جلدی کرسیوں پر جھاڑن مارنا شروع کیا۔ کرسیوں کا کام ختم کرنے کے بعد وہ میز صاف کرنے کے لئے آگے بڑھا تو اسے خیال آیا کہ "آج مہمان آ رہے ہیں۔ خدا معلوم کتنے برتن صاف کرنے پڑیں گے۔ نیند کمبخت پھر ستائے گی۔ مجھ سے تو ہو بھی نہ سکے گا۔"

وہ یہ سوچ رہا تھا اور میز پر رکھی ہوئی چیزوں کو پونچھ رہا تھا اچانک اسے قلمدان کے پاس ایک کھلا ہوا چاقو نظر آیا ——— وہی چاقو جس کے متعلق اس کے آقا نے کہا تھا۔ "بہت تیز ہے۔ چاقو" کا دیکھنا تھا کہ اس کی زبان پر یہ لفظ خود بخود جاری ہو گئے، ———

—— "چاقو تیز دھار چاقو! یہی تمہاری مصیبت ختم کر سکتا ہے۔"

کچھ اور سوچنے کے بغیر قاسم نے تیز دھار چاقو اُٹھا کر اپنی اُنگلی پر پھیر لیا۔ اب وہ شام کو برتن صاف کرنے کی زحمت سے بہت دور تھا۔ اور نیند —— پیاری نیند اُسے باآسانی نصیب ہو سکتی تھی۔

اُنگلی سے سُرخ خون کی دھار بہہ رہی تھی۔ سامنے والی دوات کی سُرخ روشنائی سے چمکتی قاسم اس خون کی دھار کو مسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا اور منہ سے گنگنا رہا تھا۔ نیند —— نیند —— پیاری نیند!

تھوڑی دیر کے بعد وہ بھاگا ہوا، اپنے آقا کی بیوی کے پاس گیا، جو زنان خانہ میں بیٹھی، سلائی کر رہی تھی۔ اور اپنی انگلی دکھا کر کہنے لگا —— "

"دیکھیے بی بی جی۔"

"ارے، قاسم یہ تو نے کیا کیا؟ —— کمبخت، صاحب کے چاقو کو چھیڑا ہو گا تو نے۔"

قاسم مسکرا دیا۔ "بی بی جی —— بس میز صاف کر رہا تھا کہ اس نے کاٹ کھایا۔"

سو، مر، اب ہنستا ہے۔ ادھر آ، میں اس پر کپڑا باندھ دوں —— پر اب یہ تو بتا کہ آج یہ برتن تیرا باپ صاف کرے گا؟

قاسم اپنی فتح جی ہی جی میں بہت خوش ہوا۔

انگلی پر پٹی بندھوا کر قاسم پھر کمرے میں چلا آیا۔ میز پر سے خون کے دھبے صاف کرنے کے بعد اس نے خوشی خوشی اپنا کام ختم کر دیا۔ سامنے طوطے کا پنجرہ لٹک رہا تھا۔ اس کی طرف دیکھ کر قاسم نے مسرت بھرے لہجے میں کہا "اب اس نمک حرام باورچی کو برتن صاف کرنے ہوں گے، ——— اور ضرور صاف کرنے ہوں گے۔ کیوں میاں مٹھو؟"

شام کے وقت مہمان آئے اور چلے گئے۔ باورچی خانہ میں جوٹھے برتنوں کا ایک طومار سا لگ گیا۔ انسپکٹر صاحب قاسم کی انگلی دیکھ کر بہت بپھرے اور اور جی کھول کر اُسے گالیاں دیں مگر اُسے مجبور نہ کر سکے ——— شائد اس وجہ سے کہ ایک بار اُن کی انگلی میں قلم تراش چبھ جانے سے بہت درد ہوا تھا۔

آقا کی خفگی آنے والی مسرت نے بھلا دی، اور قاسم کودتا پھاندتا اپنے بستر پر جا لیٹا۔ تین چار روز تک وہ برتن صاف کرنے کی زحمت سے بچا رہا۔ مگر اس کے بعد انگلی کا زخم بھر آیا ——— اب وہی مصیبت پھر نمودار ہو گئی

"قاسم ——— صاحب کی جرابیں اور قمیض دھو ڈالو"

"بہت اچھا بی بی جی"

"قاسم اس کمرے کا فرش کتنا میلا ہو رہا ہے۔ پانی لا کر ابھی صاف کر دو۔ دیکھنا کوئی دھبہ نہ رہے"

"بہت اچھا صاحب"

"قاسم شیشے کے گلاس کتنے چکنے ہو رہے ہیں۔ انہیں نمک سے ابھی ابھی صاف کر دو"

"ابھی کرتا ہوں بی بی جی"

"قاسم، ابھی بھنگن آ رہی ہے، تم پانی ڈالتے جانا وہ سیڑھیاں دھو ڈالے گی"

"قاسم ذرا بھاگ کر ایک آنے کا دہی تو لے آنا"

"ابھی چلا بی بی جی"

پانچ چھ روز اس قسم کے احکام سنتے میں گزر گئے۔ قاسم کام کی زیادتی اور آرام کے قحط سے تنگ آ گیا۔ ہر روز اُسے نصف شب تک کام کرنا پڑتا۔ پھر علی الصبح چار بجے کے قریب بیدار ہو کر ناشتے کے لئے چائے تیار کرنی پڑتی۔ یہ کام قاسم کی عمر کے لئے بہت زیادہ تھا۔

ایک روز انسپکٹر صاحب کی میز صاف کرتے وقت اس کا ہاتھ خود چاقو کی طرف بڑھا اور ایک لمحہ کے بعد اس کی انگلی سے خون بہنے لگا۔

انسپکٹر صاحب کی طرف اور اس کی بیوی قاسم کی اس حرکت پر سخت خفا چنانچہ سزا کی صورت میں اُسے شام کو کھانا نہ دیا گیا۔ مگر قاسم خوش تھا۔ ایک وقت روٹی نہ ملی، انگلی پر معمولی سا زخم آ گیا، مگر برتنوں کا انبار صاف کرنے سے تو نجات مل گئی ——— یہ سودا کیا برا ہے"

چند دنوں کے بعد اس کی انگلی کا زخم ٹھیک ہو گیا۔ اب پھر کام کی وہی بھرمار تھی۔ پندرہ بیس روز گدھوں کی سی مشقت میں گذر گئے۔ اس عرصہ میں قاسم نے بارہا ارادہ کیا کہ چاقو سے پھر اپنی انگلی زخمی کر لے مگر اب میز پر سے وہ چاقو اٹھا لیا گیا تھا۔ اور باورچی خانہ والی چھری کند تھی۔

ایک روز باورچی بیمار پڑ گیا۔ اب قاسم کو ہر وقت باورچی خانہ میں رہنا پڑا۔ کبھی مرچیں پیستا، کبھی آٹا گوندھتا، کبھی آگ سلگاتا، غرض صبح سے لے کر شام تک اس کے کانوں میں "ابے قاسم یہ کر! ابے قاسم وہ کر" کی صدا گونجتی رہتی۔

باورچی دو روز تک نہ آیا ——— قاسم کی ننھی سی جان اور ہمت جواب دے گئی۔ مگر سوائے کام کے اور چارہ ہی کیا تھا۔

ایک روز انسپکٹر صاحب نے اُسے الماری صاف کرنے کو کہا۔ جس میں ادویات کی شیشیاں اور مختلف چیزیں تھیں، الماری صاف کرتے وقت اسے ڈاڑھی مونڈنے کا ایک بلیڈ نظر آیا۔ بلیڈ پکڑتے ہی اُس نے اپنی انگلی پر پھیر لیا۔ دھار بہت تیز تھی۔ انگلی میں دور تک چلی گئی جس سے بہت بڑا زخم بن گیا

قاسم نے بہت کوشش کی کہ خون نکلنا بند ہو جائے۔ مگر کا منہ بڑا تھا۔ سیروں خون پانی کی طرح بہ گیا۔ یہ دیکھ کر قاسم کا رنگ کاغذ کی مانند سفید ہو گیا، بھاگا ہوا انسپکٹر کی بیوی کے پاس گیا۔

"بی بی جی میری انگلی میں صاحب کا استرا لگ گیا ہے"

جب انسپکٹر صاحب کی بیوی نے قاسم کی انگلی کو تیسری مرتبہ زخمی دیکھا تو فوراً معاملے کو سمجھ گئی۔ چپ چاپ اٹھی اور کپڑا نکال کر اس کی انگلی پر باندھ دیا۔ اور کہا "قاسم! اب تم ہمارے گھر نہیں رہ سکتے۔"

"کیوں بی بی جی ؟"

"یہ صاحب سے پوچھنا"

صاحب کا نام سنتے ہی قاسم کا رنگ اور پیلا پڑ گیا۔

چار بجے کے قریب انسپکٹر صاحب دفتر سے لوٹے اور اپنی بیوی سے قاسم کی نئی حرکت سُن کر اسے فوراً اپنے پاس بلا لیا۔

"کیوں میاں یہ انگلی ہر روز زخمی کرنے کے کیا معنی ؟"

قاسم خاموش کھڑا رہا

"تم نوکر لوگ سمجھتے ہو کہ ہم اندھے ہیں۔ اور ہمیں بار بار دھوکہ دیا جا سکتا ہے —— اپنا بوریہ بستر دبا کر ناک کی سیدھ میں یہاں سے بھاگ جاؤ —— ہمیں تم جیسے نوکروں کی ضرورت نہیں ہے۔"

—— سمجھے !

مگر —— مگر صاحب

"صاحب کا بچہ —— بھاگ کر جا یہاں سے تیری بقایا تنخواہ کا ایک پیسہ بھی نہیں دیا جائے گا —— اب میں اور کچھ نہیں سننا چاہتا۔"

قاسم کو افسوس نہ ہوا بلکہ خوشی محسوس ہوئی کہ چلو کام سے کچھ دیر کے لئے چھٹی مل گئی۔ گھر سے نکل کر وہ اپنی زخمی انگلی سے بے پرواہ سیدھا

چوپاٹی پہنچا اور وہاں ساحل کے پاس ایک بنچ پر لیٹ گیا۔ اور خوب سویا۔

چند دنوں کے بعد اس کی زخمی انگلی کا زخم بد احتیاطی کے باعث سیپٹک ہو گیا۔ سارا ہاتھ سوج گیا۔ جس دوست کے پاس ٹھہرا تھا۔ اس نے اپنی وقت کے مطابق اسکا بہتر علاج کیا۔ مگر تکلیف بڑھتی گئی آخر قاسم خیراتی ہسپتال میں داخل ہو گیا۔ جہاں اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔

اب جب کبھی قاسم اپنا کٹا ہوا ٹنڈ منڈ ہاتھ بڑھا کر فلورا فاؤنٹین کے ان لوگوں سے بھیک مانگتا ہے تو اسے پلید یاد آجاتا ہے۔ جس نے اسے بہت بڑی مصیبت سے نجات دلائی۔ اب وہ جس وقت چاہے سر کے نیچے اپنی گدڑی رکھ کر فٹ پاتھ پر سو سکتا ہے۔ اس کے پاس ٹین کا ایک چھوٹا سا بھبکا ہے، جس کو کبھی نہیں مانجھتا، اس لئے کہ اسے انسپکٹر صاحب کے گھر کے وہ برتن یاد آجاتے ہیں، جو کبھی ختم ہونے میں نہیں آتے تھے۔

دیوانہ شاعر

"میں آہوں کا بیوپاری ہوں۔"
لہو کی شاعری میرا کام ہے
چمن کی درماندہ ہواؤں!
اپنے دامن سمیٹ لو ـــــ کہ
میرے آتشیں گیت،
دبے ہوئے سینوں میں تلاطم برپا کرنے والے ہیں"

یہ اک نغمہ درد کی طرح اٹھا، اور باغ کی فضا میں چند لمحہ تھرتھرا کر ڈوب گیا آواز میں دیوانگی سی تھی ـــــ ناقابل بیان، میرے جسم پر کپکپی پیدا ہو گئی۔ میں نے آواز کی جستجو میں ادھر ادھر نگاہیں اٹھائیں، سامنے چبوترے کے قریب گھاس کے تختے پر چند بچے اپنی ماماؤں کے ساتھ کھیل کود میں محو تھے پاس ہی دو تین گنوار بیٹھے تھے اور گنا چوس رہے تھے۔ بائیں طرف نیم کے

درختوں کے نیچے مالی زبان کھودنے میں مصروف تھا۔ میں ابھی اس جستجو میں تھا کہ وہی درد میں ڈوبی ہوئی آواز پھر بلند ہوئی۔

"میں ان لاشوں کا گیت گاتا ہوں،
جن کی سردی دسمبر مستعار لیتا ہے۔
میرے سینے سے نکلی ہوئی آہ،
وہ لُو ہے جو جُون کے مہینے میں چلتی ہے۔
میں آہوں کا بیوپاری ہُوں،
لہو کی شاعری میرا کام ہے ——"

آواز کنوئیں کے عقب سے آرہی تھی۔ مجھ پر رقت سی طاری ہو گئی میں ایسا محسُوس کرنے لگا۔ کہ سرد اور گرم لہریں، بیک وقت میرے جسم سے لپٹ رہی ہیں۔ اس خیال نے مجھے کسی قدر خوف زدہ کر دیا کہ آواز اس کنوئیں کے قریب سے بلند ہو رہی تھی۔ جس میں آج سے کچھ سال پہلے لاشوں کا انبار لگا تھا۔ اس خیال کے ساتھ میرے دماغ میں جلیانوالہ باغ کے خونی حادثے کی تصویر کھچ گئی۔ تھوڑی دیر کے لئے مجھے ایسا محسُوس ہُوا کہ باغ کی فضا گولیوں کی سنسناہٹ اور بھاگتے ہوئے لوگوں کی چیخ پکار سے گونج رہی ہے۔

میں لرز گیا، اپنے کاندھوں کو زور سے جنبش دی، اور اس عمل سے اپنے خوف کو دُور کر کے میں اُٹھا۔ اور کنوئیں کا رُخ کیا۔

سارے باغ پر پراسرار خاموشی چھائی تھی۔ میرے قدموں کے نیچے خشک پتوں کی کھڑکھڑاہٹ سوکھی ہڈیوں کے ٹوٹنے کی آواز پیدا کر رہی تھی۔

کوشش کے باوجود میں اپنے دل سے وہ نامعلوم خوف سے دور نہ کر سکا جو اس آواز نے پیدا کر دیا تھا۔ ہر قدم پر مجھے یہی معلوم ہوتا تھا۔ کہ گھاس کے سر سبز پردے بے شمار لاشیں پڑی ہیں جن کی بوسیدہ ہڈیاں میرے پاؤں کے نیچے ٹوٹ رہی ہیں، یکایک میں نے اپنے قدم تیز کر دئیے اور دھڑکتے ہوئے دل سے اس چبوترے پر بیٹھ گیا جو کنوئیں کے ارد گرد بنا ہے۔

میرے دماغ میں بار بار یہ عجیب سا شعر گونج رہا تھا۔

میں آہوں کا بیوپاری ہوں

لہو کی شاعری میرا کام ہے۔

کنوئیں کے نزدیک کوئی متنفس موجود نہ تھا۔ میرے سامنے پھاٹک کی ساتھ والی دیوار پر گولیوں کے نشان تھے۔ جن پر چوکور جالی منڈھی ہوئی تھی۔ میں ان نشانوں کو بیسیوں مرتبہ دیکھ چکا تھا۔ اور اب وہ دو نشانی جو میری نگاہوں کے عین سامنے تھے، دو خونیں آنکھیں معلوم ہوتی تھیں جو دور ——— بہت دور کسی غیر معمولی چیز کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی ہوں۔ بلا ارادہ میری نگاہیں ان دو چشم نما سوراخوں پر جم کر رہ گئیں۔ میں ان کی طرف مختلف خیالات میں کھویا۔ خدا معلوم کتنے عرصے تک دیکھتا رہا۔ کہ دفعتاً پاس والی روشس پر کسی کے بھاری قدموں کی چاپ نے مجھے اس خواب سے بیدار کر دیا۔

میں نے مڑ کر دیکھا گلاب کی جھاڑیوں سے ایک دراز قد آدمی سر جھکائے، بڑھا آ رہا تھا۔

اس کے دونوں ہاتھ اس کے بڑے کوٹ کی جیبوں میں ٹھسے تھے۔ چلتے ہوئے وہ زیر لب کچھ گنگنا رہا تھا۔ کنوئیں کے قریب پہنچ کر وہ یکایک ٹھٹکا اور گردن اٹھا کر مجھ سے کہا۔

"میں پانی پیوں گا۔"

میں فوراً چبوترے پر سے اٹھا اور پمپ کا ہینڈل ہلانا شروع کیا: "آپ پیجیے۔"

اچھی طرح پانی پی چکنے کے بعد اس نے اپنے کوٹ کی میلی آستین سے منہ پونچھا اور واپس چلنے ہی کو تھا کہ میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے دریافت کیا۔

"کیا ابھی ابھی گا رہے تھے آپ؟"

"ہاں —— پر آپ کیوں پوچھتے ہیں؟" یہ کہہ کر اس نے اپنا سر پھر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں، جن میں سرخ ڈورے غیر معمولی طور پر نمایاں تھے، میری قلبی واردات کا جائزہ لینے لگیں۔ میں گھبرا گیا۔

"آپ ایسے گیت نہ گایا کریں —— یہ مجھے خوفناک ہیں۔"

"خوف ناک —— نہیں، نہیں، ہیبت ناک ہونا چاہیئے۔ —— جب کہ میرے راگ کے ہر سُر میں رستے ہوئے زخموں کی جلن اور رُکی ہوئی آہوں کی تپش مستور ہے، معلوم ہوتا ہے کہ میرے شعلوں کی زبانیں آپ کی برفانی ہوئی روح کو اچھی طرح چاٹ نہیں سکیں۔" اس نے اپنی نوکیلی ٹھوڑی کو انگلیوں سے کھجلایا۔ اس کے الفاظ اس کے شور کے مشابہ تھے،

جو برف کے ڈھیلے پر تپتی ہوئی سلاخ گزارنے سے پیدا ہوتا ہے۔

میں نے کہا "آپ مجھے ڈرا رہے ہیں۔"

اس پر پُر مسرت مرد عجیب کے حلق سے ایک قہقہہ نما شور بلند ہوا

ہاہاہا ——— آپ ڈرتے ہیں۔ کیا آپ کو یہ معلوم نہیں کہ آپ اس وقت اس منڈیر پر کھڑے ہیں جو آج سے کچھ عرصہ پہلے بے گناہ انسانوں کے خون سے لتھڑی ہوئی تھی۔ یہ حقیقت میری گفتگو سے زیادہ وحشت خیز ہے۔"

یہ سنکر میرے قدم لڑکھڑائے۔ میں واقعی خونی منڈیر پر کھڑا تھا۔ مجھے خوف زدہ دیکھ کر وہ پھر بولا۔"

"تھراتی ہوئی رگوں سے بہا ہوا خون کبھی فنا نہیں ہوتا۔ اس خاک کے ذرّے ذرّے میں مجھے سُرخ بوندیں تڑپتی نظر آرہی ہیں۔ آؤ تم دیکھو۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی نظریں زمین پر گاڑ دیں۔ میں کنوئیں پر سے نیچے اُتر آیا۔ اور اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ دفعتہً اس نے اپنا ہاتھ میرے کاندھے پر رکھا، اور بڑے دھیمے لہجہ میں کہا "مگر تم اسے نہیں سمجھ سکو گے۔ یہ بہت مشکل ہے!!"

میں اس کا مطلب بخوبی سمجھ رہا تھا ——— وہ غالباً مجھے اس خونی حادثے کی یاد دلا رہا تھا۔ جو آج سے سولہ سال قبل اس باغ میں واقع ہوا تھا۔ اس وقت میری عمر قریباً پانچ سال کی تھی۔ اس لئے میرے دماغ میں اس کے صرف دھندلے نقوش باقی تھے۔ لیکن مجھے اتنا ضرور معلوم تھا۔ کہ اس باغ میں

عوام کے ایک جلسے پر گولیاں برسائی گئی تھیں، جس کا نتیجہ قریباً دو ہزار اموات تھیں۔ میرے دل میں اُن لوگوں کا بہت احترام تھا۔ جنہوں نے مادرِ وطن اور جذبۂ آزادی کی خاطر اپنی جانیں قربان کی تھیں، بس اس احترام کے علاوہ میرے دل میں اس حادثہ کے متعلق اور کوئی خاص جذبہ نہ تھا۔ مگر آج اس مردِ عجیب کی گفتگو نے میرے سینے میں ہیجان سا برپا کر دیا۔ میں ایسا محسوس کرنے لگا۔ کہ گولیاں "تڑ تڑ" برس رہی ہیں" اور بہت سے لوگ دہشت کے مارے اِدھر اُدھر بھاگتے ہوئے ایک دوسرے پر گر کر مر رہے ہیں۔

"میں سمجھتا ہوں ——— میں سب کچھ سمجھتا ہوں۔

موت بھیانک ہے، مگر ظلم اس سے کہیں خوفناک بھیانک ہے۔!!"

یہ کہہ کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے سب کچھ کہہ ڈالا ہے۔ اور میرا سینہ بالکل خالی رہ گیا ہے۔ مجھ پر بیرونی سی چھا گئی۔ غیر ارادی طور پر میں نے اس شخص کا کوٹ پکڑ لیا۔ اور تھرائی آواز میں کہا۔

"آپ کون ہیں ؟ ——— آپ کون ہیں ؟"

"آہوں کا بیوپاری ——— دیوانہ شاعر"

"آہوں کا بیوپاری ——— دیوانہ شاعر" اس کے الفاظ زیرِ لب گنگناتا، میں کنوئیں کے چبوترے پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا، سامنے سپیدے کے دو درخت ہیبت ناک دیوؤں کی طرح انگڑائیاں لے رہے تھے۔ پاس ہی چنبیلی اور گلاب کی

خاردار جھاڑیوں میں ہوا آہیں بھر رہی تھی —— دیوانہ شاعر خاموش سامنے والی دیوار کی ایک کھڑکی پر نگاہیں جمائے تھا۔ شام کے خاکستر دھندلکے میں وہ ایک سایہ دکھائی دیتا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ گنگنایا۔

"آہ! یہ سب خوفناک حقیقت ہے —— کسی صحرا میں جنگلی انسان کے پیروں کے نشانات کی طرح خوفناک!"

"کیا کہا؟"

میں ان الفاظ کو اچھی طرح نہ سن سکا تھا، جو اس نے منہ ہی منہ میں ادا کئے تھے۔

"کچھ نہیں۔" میرے پاس چبوترے پر بیٹھ گیا۔

"مگر آپ گنگنا رہے تھے!"

اس پر اس نے اپنی آنکھیں ایک عجیب انداز سے سکیڑیں۔ اور ہاتھوں کو آپس میں زور زور سے ملنا شروع کیا۔ "سینے میں قید کئے ہوئے الفاظ باہر نکلنے کے لئے مضطرب ہوتے ہیں۔ اپنے آپ سے بولنا اس الوہیت سے گفتگو کرنا ہے، جو ہمارے دل کی پہنائیوں میں مستور ہوتی ہیں۔" پھر ساتھ ہی گفتگو کا رخ بدل دیا۔ "کیا آپ نے وہ کھڑکی دیکھی ہے؟"

اس نے اپنی انگلی اس کھڑکی کی طرف اٹھائی جسے وہ چند لمحہ پہلے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس جانب دیکھا، چھوٹی کھڑکی تھی،

جو سامنے دیوار کی خستہ اینٹوں میں سوئی معلوم ہوتی تھی۔

میں نے کہا: "یہ گھڑی کا ڈنڈا نیچے لٹک رہا ہے؟"

"ہاں ——— یہی جس کا ایک ڈنڈا نیچے لٹک رہا ہے۔ کیا تم اس پر اس معصوم لڑکی کے خون کے چھینٹے نہیں دیکھتے۔ جس کو صرف اس لئے ہلاک کیا گیا تھا کہ ترکش استبداد کو اپنے تیروں کی قوت پرواز کا امتحان لینا تھا ——— میرے عزیز! تمہاری اس عزیز بہن کا خون ضرور رنگ لائے گا۔ میرے گیتوں کی زیر و بم میں اسی کی معصوم روح کی پھڑپھڑاہٹ اور اسی کی دل دوز چیخیں ہیں۔ یہ سکون کے دامن کو تار تار کر دے گی۔ ایک ہنگامہ ہوگا۔ سینہ گیتی شق ہو جائے گا۔ میری بے لگام بلند سے بلند تر ہو جائے گی ——— پھر کیا ہوگا ——— پھر کیا ہوگا؟ پھر کیا ہوگا؟ ——— یہ مجھے معلوم نہیں ——— آؤ دیکھو اس سینے میں کتنی زبردست آگ لگ رہی ہے!"

اس نے میرا ہاتھ پکڑا، اور اسے کوٹ کے اندر لے جا کر اپنے سینے پر رکھ دیا۔ اس کے ہاتھوں کی طرح اس کا سینہ بھی غیر معمولی پر گرم تھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں کے ڈورے بہت ابھرے ہوئے تھے، میں نے اپنا ہاتھ اٹھا لیا اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا: "آپ علیل ہیں، کیا میں آپ کو گھر لے آؤں؟"

"یہ درست ہے مگر آپ کی طبیعت خراب ہے، آپ کے ہاتھ گرم ہیں، اس سردی میں آپ کو زیادہ بخار ہونے کا اندیشہ ہے۔

اس کے ہاتھوں کی غیر معمولی گرمی اور آنکھوں میں ابھرے ہوئے، سُرخ ڈورے صاف طور پر ظاہر کر رہے تھے کہ اُسے تیز بخار ہے۔"

اُس نے میرے کہنے کی کوئی پرواہ نہ کی اور جیبوں میں ہاتھ ٹھونس کر میری طرف بڑے غور سے دیکھا۔

یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ آگ جلے اور دھواں نہ آوے ——— میرے عزیز ان آنکھوں نے ایسا سماں دیکھا ہے کہ انہیں اُبل کر باہر آنا چاہیئے تھا۔ کیا کہہ رہے تھے میں علیل ہوں ——— ہا ہا ہا ——— عدالت! کاش کہ سب لوگ میری طرح علیل ہوتے جائیے، آپ جیسے نازک مزاج میری آنکھوں کے خریدار نہیں ہو سکتے۔ "مگر ———"

"مگر وہ کچھ نہیں" وہ دفعتہً جوش میں چلانے لگا۔ انسانیت کے بازار میں صرف تم لوگ باقی رہ گئے ہو جو کھوکھلے قہقہوں اور پھیکے تبسموں کے خریدار ہو، ایک زمانے سے تمہارے مظلوم بھائیوں اور بہنوں کی فلک شگاف چیخیں تمہارے کان سے ٹکرا رہی ہیں۔ مگر تمہاری خوابیدہ سماعت میں ارتعاش پیدا نہیں ہوا۔ اپنی روح کو میری آہوں سے آنچ دو، یہ انہیں حساس بنا دے گی۔

میں اس کی گفتگو غور سے سُن رہا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ چاہتا کیا ہے۔ اور اس کے خیالات اسقدر پریشان و مضطرب کیوں ہیں، میں نے یہ بھی سوچا کہ شائد وہ پاگل ہے۔ اُس کی گفتگو بامعنی ضرور تھی۔

مگر لہجہ میں عجیب قسم دیوانگی تھی۔ اس کی عمر یہی کوئی پچیس تیس برس کے قریب ہوگی۔ داڑھی کے بال جو ایک عرصہ سے مونڈے نہ گئے تھے۔ کچھ اس انداز میں اس کے چہرے پر اُگے ہوئے تھے کہ کسی خشک روٹی پر بہت سی چیونٹیاں چمٹی ہوئی ہیں، گال اندر کو پچکے ہوئے، ماتھا باہر کیطرف اُبھرا ہوا، ناک نوکیلی، آنکھیں بڑی بڑی جن سے وحشت ٹپکتی تھی۔ سر پر خشک اور خاک آلودہ بالوں کا ایک ہجوم بڑے سے بھورے کوٹ میں اور واقعی شاعر معلوم ہوتا تھا۔

——— دیوانہ شاعر، جیسا کہ خود اس نے اس نام سے اپنے آپ کو متعارف کرایا تھا۔

میں نے اکثر اوقات اخباروں میں ایک جماعت کا خیال پڑھا تھا۔ اس جماعت کے خیالات دیوانے شاعر کے خیالات سے بہت ملتے جلتے تھے میں نے خیال کیا کہ شائد وہ بھی اسی جماعت کا رکن ہے۔

"آپ انقلابی معلوم ہوتے ہیں"

وہ کھکھلا کر ہنس پڑا۔ آپ نے بہت بڑا انکشاف کیا ہے۔

میاں، میں تو کوٹھوں کی چھتوں پر چڑھ کر پکارتا ہوں۔ میں انقلابی ہوں ——— میں انقلابی ہوں، مجھے روک لے جس سے بن پڑے آپ نے واقعی بہت بڑا انکشاف کیا ہے

وہ اچانک سنجیدہ ہوگیا۔

اسکول کے طالب علموں کی طرح انقلاب کے حقیقی معانی سے

تم بھی نا آشنا ہو، انقلابی وہ ہے جو ہر نا انصافی اور ہر غلطی پر چلا اٹھے انقلابی وہ ہے جو سب زمینوں سب آسمانوں، سب زبانوں اور سب دستنوں ایک مجسم گیت ہو۔ انقلابی سماج کے قصاب خانے کی بیمار اور ناتواں مری بھیڑ نہیں، وہ مزدور ہے تنومند، جو اپنے آہنی ہتھوڑے کی ایک ہی ضرب سے ارضی جنت کے دروازہ وا کر سکتا ہے۔ میرے عزیز! یہ منطق خوابوں اور نظریوں کا زمانہ نہیں، انقلاب ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ یہ تمہارے سامنے موجود ہے۔ اس کی لہریں بڑھ رہی ہیں، کون ہے جو اس کو روک سکتا ہے۔

اس کا ہر لفظ ہتھوڑے کی اس ضرب کے مانند تھا، جو سرخ لوہے پر پڑ کر اس کی شکل تبدیل کر رہا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ میری روح، کسی غیر مرئی چیز کو سجدہ کر رہی ہے۔

شام کی تاریکی بتدریج بڑھ رہی تھی۔ نیم کے درخت کپکپا رہے تھے، میرے سینے میں ایک نئی دنیا آباد ہو رہی تھی، اچانک میرے دل سے کچھ الفاظ اٹھے اور ہونٹوں سے باہر نکل گئے۔

"اگر انقلاب یہی ہے تو میں بھی انقلابی ہوں۔"

شاعر نے اپنا سر اٹھایا اور میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

تو پھر اپنے خون کو کسی طشتری میں نکال کر رکھ چھوڑو، کہ ہمیں آزادی کے کھیت کے لئے اس سرخ کھاد کی بہت ضرورت ہے۔ آہ وہ وقت کس قدر خوشگوار ہوگا، جب میری آہوں کی ندی کا تبسم

کا رنگ اختیار کرے گی۔

یہ کہہ کر وہ کنوئیں کی منڈیر سے اٹھا اور میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر کہا:۔

اس دنیا میں ایسے لوگ ہیں جو حال سے مطمئن ہیں۔ اگر تمہیں اپنی روح کی بالیدگی منظور ہے۔ تو ایسے لوگوں سے ہمیشہ دُور رہنے کی سعی کرو، ان کا احساس پتھرا گیا ہے۔ مستقبل کے جاں بخش مناظر ان کی نگاہوں سے ہمیشہ اوجھل رہیں گے ــــــــــــــــــ اچھا میں اب چلتا ہُوں۔"

اس نے بڑے پیار سے میرا ہاتھ دبایا، اور پیشتر اس کے کہ میں اس سے کوئی اور بات کرتا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا، جھاڑیوں کے جھنڈ میں غائب ہو گیا۔

باغ کی فضا پر خاموشی طاری تھی، میں سر جھکائے خدا معلوم کتنے عرصہ اپنے خیالات میں غرق رہا۔ کہ اچانک اس شاعر کی آواز رات کی رانی کی دلنواز خوشبو میں گھلی ہوئی میرے کانوں تک پہنچی، وہ دماغ کے دوسرے گوشے میں گا رہا تھا۔

"زمیں ستاروں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

اُٹھو، اور رنگینیوں کو اس کے تنگے میں جڑ دو۔

دیکھاؤ، کھود دو، چیر دو، پھاڑ دو!

نئی دُنیا کے معمارو، کیا تمہارے بازوؤں میں قوت نہیں ہے؛
میں آہوں کا بیوپاری ہوں۔
لہو کی شاعری میرا کام ہے؛

پریشانی کا سبب

نعیم میرے کمرے میں داخل ہوا اور خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا میں نے اس کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا اور اخبار کی آخری کاپی کے لئے جو مضمون لکھ رہا تھا اس کو جاری رکھنے ہی والا تھا کہ معاً مجھے نعیم کے چہرے پر ایک غیر معمولی تبدیلی کا احساس ہوا۔ میں نے چشمہ اتار کر اس طرف دیکھا اور کہا۔ "کیا بات ہے نعیم، معلوم ہوتا ہے تمہاری طبیعت ناساز ہے؟"

نعیم نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری اور جواب دیا "کیا بتاؤں" عجیب مشکل میں پھنس گئی ہے، بیٹھے بٹھائے ایک ایسی بات ہوتی ہے کہ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔"

میں نے کاغذ کی جتنی پرچیاں لکھی تھیں، جمع کر کے ایک طرف رکھ دیں اور زیادہ دلچسپی سے کر اس سے پوچھا "کوئی حادثہ پیش آگیا۔ ——— نعم کمپنی میں کسی!!

ایکٹرس ہے۔

نعیم نے فوراً ہی کہا: "نہیں بھائی" ایکٹرس و ایکٹرس سے کچھ بھی نہیں ہوا۔ ایک اور ہی مصیبت میں جان پھنس گئی ہے" نہیں فرصت ہو تو میں داستان سناؤں"

نعیم میرا دوست ہے۔ جب سے وہ بمبئی آیا ہے اُس نے ہی اس نے میرے ہی اخبار میں کام کیا۔ اور خود کو بہت سی اہلیتوں کا مالک ثابت کیا۔ آہستہ آہستہ مجھے اس کے اعلیٰ خاندان کا پتہ چلا اور اسی قسم کی دوسری دلفریب باتیں نکلتی آئیں۔ تو میرے دل میں اس کی عزت اور بھی زیادہ ہو گئی۔ چنانچہ چھ مہینے کے مختصر عرصے ہی میں وہ میرا بے تکلف دوست بن گیا۔

نعیم نے میرے اخبار کو دلچسپ بنانے کے لئے مجھ سے زیادہ کوششیں کیں۔ ہر ہفتے جب اس نے ایک نئی کہانی لکھنا شروع کی۔ اور میں نے اس کی تین چار کہانیاں پڑھیں تو مجھے اس بات کا احساس ہوا۔ کہ اخبار میں اگر نعیم پڑا رہا تو اس کی ہنسا دینے والی ذکاوتیں تباہ ہو جائیں گی۔ چنانچہ میں نے موقعہ ملتے ہی ایک فلم کمپنی میں اس کی سفارش کی۔ اور وہ مکالمہ نگار کی حیثیت سے فوراً ہی وہاں ملازم ہو گیا۔

فلم کمپنی کی ملازمت کے دوران نعیم نے وہاں کے سیٹھوں اور ڈائرکٹروں پر کیسا اثر ڈالا۔ اس کے متعلق مجھے کچھ علم نہیں۔ میں بے حد مصروف آدمی ہوں لیکن نعیم سے ایک دو بار مجھے اتنا ضرور معلوم ہوا تھا۔ کہ وہاں اس کا کام دوستی چلی آ رہی ہے۔ وہ یوں کہ بمبئی آتے ہی اس نے میرے

کا کام پسند کیا ہے۔ اب ایکا ایکی نہ جانے کیا حادثہ پیش آیا تھا جو اس کا رنگ یوں ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا تھا۔

نعیم بے حد شریف آدمی تھا۔ اس سے کسی نامعقول حرکت کی توقع ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ میں سخت متحیر ہوا کہ ایسی کونسی افتاد پڑی ہے کہ جو نعیم کسی کو اپنا منہ دکھانے کے قابل نہ رہا۔ میں نے اُس سے اجازت لے کر جلدی جلدی آخری کاپی کے لئے مضمون کا بقایا حصہ مکمل کیا اور تمام پرچیاں کاتب کو دے کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ "بھئی معاف کرنا میں خود ابھی تمہاری داستان نہ سن سکا ——— لیکن میں یہ پوچھتا ہوں یہ داستان آخر بنی کیسے ——— تم ——— تم ——— خیر چھوڑو اس قصے کو تم مجھے سارا واقعہ سناؤ۔"

نعیم نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور کہا۔ اب میں تمہیں کیا بتلاؤں جو کچھ ہوا میری بیوقوفی کی بدولت ہوا۔ ہماری فلم کمپنی میں ایک ایکٹریس ہے عاشق حسین جو اول درجے کا چغد ہے، چونکہ دوسری کی طرح میں اُسے ستاتا نہیں ہوں، اس لئے مجھ پر بڑی طرح فریفتہ ہے یہ فریفتہ میں نے اس لئے کہا ہے کہ وہ مجھ سے اسی طرح کی باتیں کرتا ہے۔ جس طرح خوب صورت عورتوں سے کی جاتی ہیں۔

میں ہنس پڑا: "پر تم اتنے خوبصورت تو نہیں ہو۔"

نعیم کے پیلے چہرے پر بھی ہنسی کی لال دھاریاں پھیل گئیں۔ "کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا ہے۔ دراصل وہ اپنے اخلاص اور اپنی بے لوث محبت کا

اظہار کرنا چاہتا ہے۔ اور چونکہ اُسے ایسا کرنے کا طریقہ نہیں آتا۔ اس لیے اس کا پیار وہی شکل اختیار کر لیتا ہے، جو غالباً اس کو اپنی بیوی سے ہوگا۔ ——— ہاں تو یہ عاشق حسین صاحب جو اول درجہ کے زناس ہیں اور رقص کے سوا اور کچھ بھی نہیں جانتے، پرسوں شوٹنگ کے بعد ملے تھے۔ سٹ پر میں نے ان کے مکالمے درست کرنے میں کافی محنت کی تھی اس کا حق ادا کرنے کے لئے انہوں نے درست کرتے ہیں کافی محنت کی تھی۔ اس کا حق ادا کرنے کے لئے انہوں نے فوراً ہی کچھ سوچا اور کہا "نعیم صاحب، میں آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں" میں نے کہا فرمائیے انہوں نے پھر سوچا اور کہا۔ "دن بھر کام کرنے کے بعد میں تھک گیا ہوں۔ آپ بھی ضرور تھک گئے ہوں گے۔ چلئے کہیں گھوم آئیں" ——— اب یہاں اپنی ایک کمزوری بتا دوں گا۔ موسم اگر خوشگوار ہو تو میں بہک جاتا ہوں، شام کا جھٹ پٹا تھا ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ اور فضا میں ایک عجیب قسم کی اداسی گھلی ہوئی تھی۔ جوان کنوارے آدمیوں کے دل میں ایسی اداسی ضرور موجود ہوتی ہے۔ جو ایسے موقعوں پر بہت وسعت اختیار کر لیا کرتی ہے۔ میرے بدن پر ایک کپکپی سی پیدا ہو گئی۔ جب میں نے جوہو کے سمندری کنارے کا تصور کیا جہاں شام کو نم آلود ہوائیں یوں چلتی ہیں، جیسے بھاری بھاری ریشمی ساڑھیاں پہن کر عورتیں چلتی ہیں ——— میں فوراً تیار ہو گیا۔ "چلئے مگر کہاں جائیے گا؟"

اب عاشق حسین نے پھر سوچا اور کہا "کہیں بھی چلے جائیں گے ——

یہاں سے تو باہر نکلیں ———— ہم دونوں گیٹ سے باہر نکلے اور موٹر بس کا انتظار کرنے لگے "

یہاں تک کہ نعیم رُک گیا۔ اُس کے چہرے کی زردی اب دور ہو رہی تھی۔ میں نے اس کے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا اور کہا۔ "ہم دونوں گیٹ سے باہر نکل کر بس کا انتظار کرنے لگے "

نعیم نے سر ہلایا اور شامت اعمال اُدھر سے عاشق حسین کے ایک مارواڑی دوست کا گزر ہوا۔ وہ موٹر میں جا رہا تھا کہ اچانک عاشق حسین کی نظر اس پر پڑی فوراً ہی اُس نے مارواڑی زبان میں اپنے دوست کو ٹھہرنے کے لئے کہا۔ موٹر رکی۔ عاشق حسین نے اُس سے مارواڑی زبان میں چند باتیں کیں۔ پھر دوڑ کر میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔ " چلئے۔ کام بن گیا، موٹر مل گئی، اس میں چلتے ہیں، میں چل پڑا، موٹر میں داخل ہونے سے پیشتر عاشق حسین نے اپنے مارواڑی دوست سے جو شکل و صورت کے اعتبار سے ڈرائیور معلوم ہوتا تھا، تعارف کرایا، اور حسب معمول مبالغے سے کام لیتے ہوئے کہا، یہ مارواڑے کے بہت بڑے سیٹھ ہیں، یہاں ایک کاروبار کے سلسلے میں آئے ہیں۔ میرے بہت مہربان دوست ہیں" اور میرے متعلق اپنے دوست سے کہا " یہ ہندوستان کے بہت بڑے اسٹوری رائٹر ہیں۔ اور مارواڑے کے بہت بڑے سیٹھ نے ہاتھ ملائے، دونوں اپنی اپنی جگہ رسمی طور خوش ہوئے اور موٹر چلی " یہ سنکر میں مسکرایا " نعیم اس مارواڑی سیٹھ کے متعلق۔ تمہاری رائے بہت خراب معلوم ہوتی ہے۔ کیا آگے چل کر

پوڈلن کا پارٹ تو ادا نہیں کرے گا"

تم پہلے پوری داستان سن لو پھر سوچ لینا کہ ولن کون ہے اور ہیروئن کون لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کہانی کی ہیروئن زہرہ ہے ——

—— زہرہ جس کو میں نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ کل، دار کی ایک فوجداری عدالت میں دیکھا ہے۔ ایک مجرم کی حیثیت میں۔"

یہ کہتے ہوئے نعیم کی کان کی لویں شرم کے باعث سرخ ہو گئیں داستان سننے کے دوران میں پہلی مرتبہ زہرہ کے اچانک ذکر سے مجھے سخت تعجب ہوا۔ میں نے کہا۔ "نعیم یہ تو بالکل الگزنڈر پوپ کا افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ زہرہ بالکل پوپ کے افسانوں کے غیر متوقع انجام کی طرح اس داستان میں آئی ہے، یہ عورت کون ہے؟"

"میں قطعاً نہیں جانتا۔ یعنی مجھے اگر اس عورت کے متعلق کچھ علم ہو تو مجھ پر لعنت، خدا معلوم کون ہے۔ پر اب میں اتنا جانتا ہوں کہ اس نے ہم لوگوں پر نوجداری مقدمہ دائر کر رکھا ہے، جرم، ڈاکہ اور چوری ہے۔"

میں نے تعجب سے پوچھا: ڈاکہ اور چوری ——

نعیم کے لہجہ نے اتنی متانت اختیار کر لی جس میں روحانی اذیت کی جھلک صاف دکھائی دیتی تھی، کہنے لگا "ہاں ڈاکہ اور چوری، مجھے دفعات اچھی طرح یاد نہیں، مگر ان کا مطلب یہی ہے کہ ہم نے مداخلت بے جا کی؛

زہرہ کے گھر ڈاکہ ڈالا" اور ماں کی چند قیمتی اشیاء چرا کر لے گئے۔ لیکن یہ تو داستان کا انجام ہے!" پہلے کے واقعات تمہیں سناؤں۔ پھر اس طرف آتا ہوں ——— میں کیا کہہ رہا تھا۔؟"

میں نے جواب دیا، کہ تم اس مارواڑی کی موٹر میں بیٹھ گئے۔!"

ہاں عاشق حسین کے کہنے پر اس منحوس مارواڑی کی موٹر میں بیٹھ گیا۔ موٹر وہ خود چلا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اگلی سیٹ پر ایک آدمی بیٹھا تھا۔ جو اس سے کم منحوس نہیں تھا۔ عاشق حسین نے شائد اس کے متعلق کہا تھا کہ وہ موٹریں بنانے کا کام کرتا ہے۔ خیر موٹر مختلف بازاروں سے ہوتی ہوئی دادر کی طرف جا نکلی۔ ظاہر تھا کہ ہم جوہو جائیں گے۔ چنانچہ میں بہت خوش تھا۔ جوہو کی گیلی گیلی ریت سے مجھے بے حد پیار ہے، کبھی کبھی اُدھر جا کر میں گیلی ریت پر ضرور لیٹا کرتا ہوں اور دیر تک کھلے آسمان کی طرف دیکھا کرتا ہوں جو انتہائی پُراسرار اور ناقابلِ رسائی دکھائی دیتا ہے، جتنا کہ ایک اجنبی عورت کا تصور۔

سامنے رات کی سرمئی روشنی میں سمندر کروٹیں لیتا ہے اور پر گدلے آسمان پر تارے یوں چمکتے ہیں، جیسے انہونی باتیں کسی جوان کے دل میں ٹمٹما رہی ہوں، ایک عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ دور اس پار جہاں آسمان اور سمندر کوئی واضح خط بنائے بغیر آپس میں گھل مل جاتے ہیں، ایک ایسی دھندلی روشنی نظر آیا کرتی ہے جو خوبصورت شعروں کی طرح مصنوعی ہوتی ہے۔

میں جوہو کی خیال میں مگن تھا کہ عاشق حسین نے موٹر کو دادر ہی میں ایک جگہ

ٹھہرالیا۔ اور مجھ سے کہا "آئیے چلئے کچھ پی لیں" جیسا کہ تمہیں معلوم ہے بیئر مجھے پیاری ہے، عاشق حسین کو خدا معلوم کہاں سے اس بات کا پتہ چلا کہ تھا کہ میں پیار کرتا ہوں خیر، ہم چار دن بار بار میں داخل ہوئے ایک بوتل بیئر کی میں نے پی اور ایک عاشق حسین نے۔ مارواڑی سیٹھ اور موٹریں بنانے والے نے کچھ نہ پیا۔ ہم جلدی فارغ ہو گئے۔ پھر موٹر میں بیٹھے اور جوہو کا رُخ کیا، مگر فوراً ہی عاشق حسین کو ایک کام یاد آگیا۔

"اوہ، مجھے تو اپنی شاگردنی کے گھر جانا ہے، آج میں نے اس سے ملنے کا وعدہ کیا تھا" نعیم صاحب، اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو پانچ منٹ لگیں گے۔ اس کا مکان بالکل قریب ہے" مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے موٹر ایک گلی میں ٹھہرائی اور اکیلا سامنے والے مکان کی طرف بڑھا، میں نے پوچھا "یہ گلی کس طرف ہے"

نعیم نے جواب دیا دادر ہی میں ہے ادھر جہاں پارسیوں کے بے شمار مکان ہیں، غالباً اس محلے کو پارسی کالونی کہتے ہیں

——— ہاں تو یہ عاشق حسین موٹر سے نکل کر سامنے کی طرف بڑھا، ایک چھوٹا سا دو منزلہ مکان تھا باغیچہ طے کر کے عاشق حسین نے دروازہ پر دستک دی، جب کسی نے دروازہ نہ کھولا تو عاشق حسین نے دوسری بار دستک دی، جب کسی نے دروازہ کھولا تو عاشق حسین نے دوسری بار دستک دی۔ اندر سے کسی عورت کی آواز آئی "کون ہے" عاشق حسین نے

جواب دیا، "عاشق" اندر سے آواز آئی "عاشق کی
عاشق حسین نے یہ گالی سُنکر ہماری طرف دیکھا اور زور زور سے دروازہ
کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ "دروازہ کھولو دروازہ
کھولو"

یہ سُنکر میں نے کہا "اس عورت نے شاید عاشق کا مطلب غلط سمجھا ہے، ورنہ جیسا کہ تم ابھی کہہ چکے ہو، وہ عاشق کی شاگرد تھی"

"جانے بلا، کیا بکتی اور کیا ہے، یہ ہو سکتا ہے کہ عاشق حسین جھوٹ ہی بولا۔ اور بیئر کی ایک بوتل پینے کے بعد زہرہ کا خیال اس کے اُس کے دماغ میں آگیا ہو، کسی نے کبھی اس سے کہا ہوگا۔ کہ دس نمبر کے فلیٹ میں ایک عورت زہرہ رہتی ہے ———— لیکن اس سے کیا بحث ہے، عاشق حسین نے ادھم مچانا شروع کر دیا اندر سے گالیاں آتی رہیں اور پیشتر اس کے کہ میں اُسے منع کر سکتا، تین، چار دھکے مار کر اُس نے دروازہ توڑا اور زبردستی اندر داخل ہو گیا۔ جب یہ شور ہوا، تو آس پاس کے رہنے والے پارسی اکٹھے ہو گئے۔ میں بے حد پریشان ہوا، چنانچہ اسی پریشانی میں موٹر سے باہر نکلا، اور عاشق کو باہر لانے کی خاطر اس مکان میں داخل ہوگیا۔ میرے پیچھے پیچھے عاشق کے دونوں ساتھی بھی چلے آئے میں نے اس فلیٹ کے تینوں کمرے دیکھے، مگر عاشق نظر نہ آیا، اور نہ ہی اس کی شاگرد زہرہ، خدا معلوم کہاں غائب ہو گئے تھے۔

گھر کی پہلی طرف دوسرا دروازہ تھا، ممکن ہے وہ اُدھر سے باہر نکل گئے۔

ہوں، وہ ادھر سے نکل کر موٹر میں بیٹھ گیا۔ وہ پارسی جو گلی میں جمع ہو گئے تھے۔ گھور گھور کر میری طرف دیکھنے لگے ہیں۔ اور زیادہ پریشان ہو گیا۔ بیئر کا سارا نشہ جو میرے دماغ میں تھا اُتر کر میری ٹانگوں میں چلا آیا۔ میرے جی میں آئی کہ عاشق، اس کے ساتھیوں اور ان کی موٹر کو رفو کر وہیں چھوڑ کر بھاگ جاؤں مگر ــــــــ عجیب مشکل میں میری جان پھنس گئی تھی۔ گھور رہے تھے۔ پکڑ لیتے ــــــــ دس بارہ منٹ اسی کشمکش میں گزرے اس کے بعد عاشق اور اس کے دونوں دوست مکان میں سے باہر نکلے اور موٹر میں بیٹھ گئے میں نے عاشق سے کوئی بات نہ پوچھی، موٹر چلی اور دادر کا علاقہ آیا تو میں نے اس سے کہا " مجھے یہیں اتار دو، بس میں گھر چلا جاؤں گا۔" عاشق کے دماغ سے جوہو کی سیر کا خیال گیا تھا۔ اس نے اپنی مار واڑی دوست سے موٹر روکنے کے لئے کہا۔ چنانچہ میں اُن سے رخصت لے کر گھر چلا آیا اور اس واقعہ کو بھول گیا۔

نعیم نے ایک سگریٹ اور سلگایا اور کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ میں نے پوچھا: " اس کے بعد کیا ہوا؟" " مجھے گرفتار کر لیا گیا؟" نعیم نے بڑی تلخی کے ساتھ کہا " اس بیوقوف کے بچے عاشق سے جب پولیس والوں نے پوچھا کہ تمہارے ساتھ اور کون تھا تو اس نے مارواڑی دوست، اس موٹر ہانکنے والے کا اور میرا نام لے دیا ــــــــ ــــــــ ہم تینوں ایک گھنٹے کے اندر اندر گرفتار کر لئے گئے۔"

میں نے پوچھا "یہ کب کی بات ہے ———— تم نے مجھے اطلاع کیوں نہ دی؟"

نعیم نے جواب دیا، "کل ڈھائی بجے کے قریب ہماری گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ میں نے تمہیں ٹیلیفون پر ضرور مطلع کیا ہوتا، اگر میرے حواس بجا ہوتے بخدا میں سخت پریشان تھا۔ پولیس انسپکٹر ٹیکسی میں ہم سب کو تھانے میں لے گیا۔ وہاں بیانات قلم بند ہوئے تو مجھے پتہ چلا کہ عاشق حسین کے دو، بدلائی دوست جو کسی کاروبار کے سلسلہ میں یہاں آئے تھے، زہرہ کا پنکھا اٹھا کر اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ بجلی کا یہ پنکھا پولیس نے اُن سے حاصل کر لیا تھا۔"

یہ سن کر میں نے تشویشناک لہجہ میں کہا، "اس سے تو چوری صاف ثابت ہوتی ہے"

"چوری ثابت ہوتی ہے۔ جبھی تو میں اس قدر پریشان ہوں اور سچ پوچھو تو اگر یہ ثابت بھی نہ ہوتی تو میری پریشانی اسی قدر رہتی، تھانے اور عدالت میں جانا بے حد شرمناک ہے۔ پر اب کیا کیا جائے۔ جو ہونا ہے ہو چکا ہے، اس غفلت سے چھٹکارا نہیں مل سکتا۔ جو مجھے اٹھانا پڑے گی۔ اور اٹھانا پڑ رہی ہے، میں بالکل بے گناہ ہوں۔ یعنی ظاہر ہے کہ میں زہرہ کو بالکل نہیں جانتا۔ اگر میں اس کے مکان پر گیا تو محض عاشق حسین کی وجہ سے اس کمبخت کے کہنے پر ایک بوتل بیئر بھی نہیں ہضم کر سکتا۔"

نعیم کے چہرے پر نفرت اور غصے کے ملے جلے جذبات دیکھ کر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی تھی : "بہت برے پھنسے "

نعیم نے اسی انداز میں کہا " ہنسی میں پھنسی اسی کو کہتے ہیں ، کل اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ عدالت کا منہ دیکھا اور زہرہ بھی پہلی مرتبہ مجھے نظر آئی "

میں نے فوراً ہی پوچھا " کیسی ہے ؟ "

نعیم نے بے پرواہی سے جواب دیا " بری نہیں ، یعنی شکل و صورت کے اعتبار سے خاصی رہے ، بیضوی چہرہ ہے ، جس پر کیلوں اور مہاسوں کے داغ نظر آتے ہیں ۔ لمبے لمبے کالے بال ہیں ، پیشانی تنگ ہے ، جوان ہے ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حال ہی میں اس نے یہ دھندا شروع کیا ہے ۔

میں نے بغیر کسی مطلب کے یونہی پوچھا " کیسا دھندا ؟ "

نعیم شرما سا گیا " ارے بھئی وہ بھی وہی جو عورتیں کرتی ہیں ، زہرہ کے چہرے پر اس کی چھاپ دور سے نظر آ سکتی ہے ۔ مجھے اس عورت پر اتنا غصہ کبھی نہ آتا مگر جب مجسٹریٹ نے میری طرف اشارہ کر کے پوچھا " تم اس کو پہچانتی ہو " تو زہرہ نے میری طرف اپنی بڑی بڑی دھلی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر کہا " ہاں صاحب پہچانتی ہوں " اسی نے میرا چاندی کا ٹی سیٹ اٹھایا تھا ، جب اس نے جھوٹ بولا ، تو خدا کی قسم جی میں آئی کہ ملعونہ نے حلق میں کٹہرے کا ایک ڈنڈا نکال کر گھونس دوں ، اتنا بڑا جھوٹ !! "

اس پر میں نے کہا " بھئی جھوٹ تو بولے گی ۔ اس کے بغیر کام کیسے

چلے گا اُسے اپنا کیس بھی تو مضبوط بنانا ہے۔ اَب تمہیں قہر درویش بر جان درویش سب کچھ سُننا پڑے گا"

"ٹھیک ہے" نعیم نے بڑی پریشانی کے ساتھ کہا "جو کچھ ہوگا اُسے ہر حالت میں سہنا ہی پڑے گا ــــــ مگر ــــــ مگر ــــــ میں کیا بتاؤں میں کس قدر پریشان ہو گیا ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر کسی مرد نے مجھ پر ایسا مقدمہ دائر کیا ہوتا۔ تو مجھے اتنی پریشانی نہ ہوتی۔ مگر ذرا غور تو کرو، وہ عورت ہے اور میں عورتوں کی تعظیم کرتا ہوں"

میں نے پوچھا "کیوں؟"

نعیم نے بڑی سادگی سے جواب دیا "اس لئے کہ میں عورتوں کو جانتا ہی نہیں۔ کسی عورت سے ملنے اور اس سے کھُل کر بات چیت کرنے کا مجھے موقعہ ہی نہیں ملا۔ اب زندگی میں پہلی مرتبہ عورت آئی ہے۔ اور مدعی بن کر"

میں نے ہنسنا شروع کر دیا۔ نعیم نے اس پر بگڑ کر کہا "تم ہنستے ہو مگر یہاں میری جان پر بنی ہوئی ہے، دو دن سے میں کمیٹی نہیں جا رہا۔ وہاں یہ بات ضرور پہنچ چکی ہوگی۔ سیٹھ صاحب کے سامنے کیا منہ لے کر جاؤں گا انہوں نے اگر کچھ پوچھا تو کیا جواب دوں گا۔

میں نے کہا "جو اصل بات ہے ان کو بتا دینا"

وہ تو میں بتا ہی دوں گا۔ مگر خدا کے لئے سوچو تو سہی میری پوزیشن کیا ہے۔ میں سیٹھ صاحب کی بے حد عزت کرتا ہوں۔ اس لئے کہ وہ میرے آقا ہیں۔ اگر انہوں نے مجھے بدکردار سمجھ کر برطرف کر دیا تو عمر بھر کے لئے

میں داغ دار ہو جاؤں گا۔ ملازمت کھونے کا مجھے اتنا افسوس نہیں ہوگا مگر یہاں سوال عزت و ناموس کا ہے، وہ مزید بدگمان ہو جائیں گے، میں اُن کی طبیعت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ میری سچی باتوں کو بھی جھوٹا ہی سمجھیں گے۔ نظم کمپنی میں ہر شخص جھوٹ بولتا ہے اور خود بھی ہمیشہ جھوٹ بولتے ہیں ——— اب میں کیا کروں ——— کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

میں نے ہر ممکن طریقے سے نعیم کی اخلاقی جرأت بڑھانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا، وہ بے حد ڈرپوک ہے خاص کر عورتوں کے معاملے میں تو اس کی بزدلی بہت ہی زیادہ ہے، دراصل معاملہ بھی سنگین ہے۔ اگر برتی پنکھا برآمد نہ ہوتا تو کیس بالکل معمولی رہ جاتا مگر پولیس اس مار داروں سے پنکھا حاصل کر چکی ہے، اس سے ظاہر ہے کہ زہرہ ایک حد تک سچی تھی۔

نعیم زیادہ دیر تک میرے پاس نہ ٹھہرا اور چلا گیا۔ دوسرے روز شام کو وہ پھر آیا۔ اس کی پریشانی اور بھی زیادہ بڑھی ہوئی تھی آتے ہی کہنے لگا۔ "بھائی ایک مصیبت میں تو جان پھنسی تھی۔ اب ایک اور آفت گلے پڑ گئی ہے۔"

میں نے تشویش کے ساتھ کہا "کیا ہوا ——— اب کیا کوئی اور کیس کھڑا ہو گیا ہے؟"

"نہیں کیس وہی ہے، مگر ایک ایسی بات ہوئی ہے جو میرے وہم و

گمان میں بھی نہ تھی۔ نعیم نے کرسی پر بیٹھ کر اضطراب کے ساتھ ٹانگ ہلانا
شروع کی۔ " آج صبح سیٹھ صاحب نے مجھے بلانے کے لئے موٹر بھیجی
مجھے جانا ہی پڑا۔ حالانکہ میں ارادہ کر چکا تھا کہ کبھی نہیں جاؤں گا۔ بخدا علیم
کمپنی میں داخل ہوتے وقت میری حالت وہی تھی جو احساس مجرموں کی
ہوتی ہے شرم کے مارے میرا حلق سوکھ رہا تھا۔ سر بھاری ہو گیا تھا نیچی
نظریں کئے جب میں سیٹھ صاحب کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ اٹھ کھڑے
ہوئے۔ بڑے تپاک کے ساتھ انہوں نے پہلی مرتبہ میرے ساتھ ہینڈ
شیک کیا اور ہنس کر کہنے لگے "منشی صاحب آپ نے کمال کر دیا۔ آپ تو
چھپے رستم نکلے، بیٹھیے، تشریف رکھئے"۔ میں ندامت میں غرق کرسی پر بیٹھ گیا
وہ بھی بیٹھ گئے۔ پھر انہوں نے ایسی باتیں شروع کیں کہ میرے اوسان خطا ہو گئے
کہنے لگے "آپ گھبراتے کیوں ہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا" "آپ بتائیے
کہ زہرہ کیسی ہے؟ کچھ اچھی ہے۔ بھئی آپ نے تو کمال کر دیا میں سنتا ہوں کہ
آپ نے ہی کر وہ ادھمال مچائی کہ پارسی کالونی کے سب آدمی اکٹھے ہو گئے کسی نے
مجھ سے کہا تھا کہ آپ زہرہ کی ساڑھی اتار کر لے گئے۔

پہلے بھی تو آپ اس کے ہاں آتے جاتے ہوں گے، پھر حرامزادی نے
پولیس میں رپورٹ کیوں لکھوائی۔ پر کیا پتا ہے آپ نے بہت زیادہ شرارت
کی ہوں" ایسی بے شمار باتیں انہوں نے مجھ سے کیں، میں خاموش رہا۔
اس کے بعد انہوں نے چائے منگوائی۔ ایک پیالہ میرے لئے بنایا اور پھر
وہی گفتگو شروع کر دی۔ چاندی کا ٹی سیٹ جو آپ اٹھا کر لے گئے تھے

مجھے اگر آپ پریذیڈنٹ کر دیں تو میں ابھی آپ کو اپنے وکیل کے ساتھ لے چلتا ہوں۔ بس ایسی وکالت کرے گا کہ زہرہ کی طبیعت صاف ہو جائے گی۔ میں نے سنتا ہوں زہرہ شکل و صورت کی اچھی ہے۔ تو بھئی اس مقدمہ کے بعد اُسے لاؤ نا، اپنی فلم میں اُسے چھوٹا سا رول دے دیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اور ہاں یہ آپ نے اچھا کیا کہ اسی کی شراب پی اور اُسی کی چیزیں اٹھا کر لے گئے!۔۔۔ ۔۔۔ پر آپ ایک درجن آدمی اپنے ساتھ کیوں لے گئے تھے، بیچاری اتنے آدمی دیکھ کر گھبرا گئی۔" بات بات پر وہ ہنستے تھے، جیسے گفتگو کے لئے ایک نہایت ہی دلچسپ موضوع مل گیا ہے۔ تعجب ہے کہ اس سے پہلے انہوں نے کبھی میرے سوال کا جواب بھی نہیں دیا تھا۔

میں نے کہا "تو کیا ہوا تمہیں خوش ہونا چاہیئے کہ وہ تم پر ناراض نہ ہوئے!"

نعیم بگڑ کر کہنے لگا "یہ بھی تم نے خوب کہا۔ کہ مجھے خوش ہونا چاہیئے وہ مجھے مجرم سمجھ رہے ہیں جو کہ میں نہیں ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔ میں کیا کہہ سکتا تھا۔ خاموش رہا تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے خزانچی کو بلایا اور مجھے سو روپے ایڈوانس دئیے حالاں کہ دو مہینے سے کسی ملازم کو تنخواہ نہیں مل رہی۔"

میں نے کہا "تو کیا بُرا ہوا؟"

"ارے بھئی تم ساری بات تو سُن لو۔" نعیم چیخ گیا "سو روپے دلوا کر انہوں نے کہا "یہ آپ اپنے پاس رکھئے۔ آپ کو مقدمہ کے لئے ضرورت ہو گی۔ وکیل کا بند و بست کئے دیتا ہوں۔" ٹیلیفون پر انہوں نے فوراً ہی وکیل سے بات کی پھر مجھے اپنی موٹر میں بٹھا کر اس کے پاس لے گئے، ساری باتیں اس کو

سمجھا تمہیں اور کہیں۔ دیکھئے اس مقدمہ میں جان لڑا دیجئے گا۔ بات بالکل معمولی ہے اس لئے کہ منشی صاحب سے زہرہ کے تعلقات بہت پرانے ہیں"........

میں کیا کہتا ——— وہاں بھی خاموش رہا۔"

میں نے ہنس کر نعیم سے کہا "اب بھی خاموش رہو۔ تمہارا کیا بگڑ گیا؟"

نعیم اٹھ کھڑا ہوا اور اضطراب کے ساتھ ٹہلنے لگا "ابھی کچھ بگڑا ہی نہیں، عدالت میں مجھے بیان دینا پڑے گا۔ کہ زہرہ میری داشتہ ہے اور میں اسے ایک مدت سے جانتا ہوں ——— اور....................... اور .... سیٹھ صاحب نے آج شام مجھے مدعو کیا ہے، کہتے تھے گریں چیں سے گے، وہ کچھ شغل رہے گا ——— میری جان عجیب مصیبت میں پھنس گئی ہے ——— سمجھ میں نہیں آتا کیا ہو رہا ہے.............."

ختم شد

کتبہ ذکی احمد لاہور

ہمارے چند نئے ناول

نام کتاب	مصنف	صفحات	قیمت
ضرغام	رئیس احمد جعفری (ندوی)	۱۰۰۰	۸/-
عشق	"	۴۸۰	۲/-
پالو	نسیم انہونوی	۶۰۰	۶/-
تمنا	"	۳۵۰	۳/۸
شبانہ	" "	۴۵۰	۴/۸
سہراب زندگی	" "	۳۵۰	۴/۸
مرزا مغل	مائل ملیح آبادی	۵۱۰	۶/۰
ایک مجاہد ایک شہید	" " "	۳۵۰	۴/۸
رومانہ	" " " "	۲۸۰	۵/۰
پاگل خانہ	" " " "	۲۵۰	۳/-
سہارا	دت بھارتی	۳۵۰	۴/۰
زرد رہ	سلامت علی مہدی	۵۱۲	۶/۸

تمام کپڑے کی اعلیٰ جلدیں خوبصورت کتابت وطباعت حسین دیدہ زیب سرورق

ظفر برادرز ظفر منزل ۔ بنک سکوائر ۔ دی مال ۔ لاہور

فہرست کتب

...درد مشترک		۶/-
...دتی		۶/-
...تیم		۲/۱۲
	ناول زیر طبع ہیں	
...امید	ابوالکلام آزاد	۴/۴
...ار	״	۲/-
...گد	״	۱/۸
...	״	۱/۸
...ں یادیں بن گئے آخری لمحے		۱/۸
...وہم گل	عادل رشید	۶/-
...لگے پاؤں (حصہ اول)	״	۵/-
(حصہ دوم)	״	۴/-
...ویرانی	״	۵/-
...نو	نسیم انہونوی	۰/-
...رب زندگی	״	۴/۸
شبانہ	״	۵/۱۲
...راز	״	۶/-
...مانہ	مائل ملیح آبادی	۴/۸
...یت	״	۴/-
...امثل	״	۶/-

ایک مجاہد ایک شہید	مائل ملیح آبادی	۲/۱۲
برقعے	سعادت حسن منٹو	۲/-
شکاری عورتیں	״	۲/-
کالی شلوار	״	۴/۸
ایک مرد	״	۳/۸
جنازے	״	۳/-
بغیر اجازت	״	۲/-
رتی ماشہ تولہ	״	۲/-
بغیر عنوان کے (ناول)	״	۳/-
سرخام	رئیس احمد جعفری	۱۰/-
شکاری	״	۵/-
رابعہ	״	۶/۸
عشق	״	۶/-
سہارا	دت بھارتی	۴/۸
موت سے پہلے	״	۴/۸
یہ ہے زندگی	״	۴/-
عشق اور گناہ	״	۲/۴
سلگتی چنگاریاں	دہی دہلوی	۴/۸
دل اپنا پریت پرائی	״	۴/-
زمانہ کی ہوا	״	۶/-

ایک عورت ہزار دیوانے	کرشن چندر	۲/۸
عذرا	صالحہ عابد حسین	۶/۸
تاریخ الدولتین	نیاز فتحپوری	۶/۸
ترغیبات جنسی	״	۸/-
ہاتھ کی لکیروں میں قسمت	״	۱/۱۲
بازار گناہ	جناداس اختر	۴/۸
وہ بجتی رہی	״	۴/-
صبیحہ	ہاجرہ نازلی	۵/-
نغمہ	״	۵/-
زمرد	سلامت علی مہدی	۶/۸
رضیہ سلطانہ	علیم مرنی	۴/۸
سمگلر	قمر تسکین	۵/۸
ہرجائی	رشید اختر ندوی	۵/-
تلخیاں	ساحر لدھیانوی	۲/-
چار دل چار راہیں	خواجہ احمد عباس	۴/-
من تڑنگ	عبدالقدیر رشک	۲/-
پیاسی جوانی	کوثر چاندپوری	۳/-
میرے ناخدا	قمر قریشی	۳/۴
ماہ درخشاں	اے آر خاتون	۹/-
نور افشاں	״	۸/-
اندھیرا اور تنہائی	ریاض ارشد	۵/-

نوٹ:۔ ہر ماہ ایک نیا ناول شائع کیا جاتا ہے

ظفر برادرز (فون ۲۲۲۳۵) **بنک سکوئر دی مال روڈ۔ لاہور**

(اس فہرست کے علاوہ آپ ہر کتاب ہم سے طلب کریں ہم ڈاک خرچ فری دیں گے)